سبط حسن — شخصیت اور فکر

مرتب
ڈاکٹر سید جعفر احمد

MAAB 1431
maablib.org

سبطِ حسن ـ شخصیت اور فکر

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

maablib.org

مکتبۂ دانیال

© جملہ حق محفوظ

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کلی یا جزوی، منتخب یا مکرر اشاعت یا بصورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، مکینیکل یا ویب سائٹ اپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

پہلی اشاعت—۲۰۱۶ء

ناشر: حوری نورانی

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

قیمت: ۸۵۰ روپے

ISBN: 978-969-419-078-5

SIBTE HASAN—SHAKHSIYAT AUR FIKR

Compiled by Syed Jaffar Ahmed

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE

مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone:35681457-35682036-35681239
Email:danyalbooks@hotmail.com

فہرست

عرضِ مرتب		۵

پہلا حصہ: اعترافِ دانش

سبطِ حسن۔ پاکستان میں انقلابی فکر کی حیاتِ نو	پروفیسر حمزہ علوی	۱۵
ترقی پسندی اور روشن خیالی کا مجاہد۔ سیّد سبطِ حسن	عبداللہ ملک	۲۱
سیّد سبطِ حسن کی تاریخ نویسی	ڈاکٹر مبارک علی	۳۰
روشن خیالی کی روایت اور ادب	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۳۴
سبطِ حسن کے لیے ایک حرفِ سپاس	پروفیسر سحر انصاری	۴۲
سیّد سبطِ حسن اور معقولیت	احمد ہمدانی	۵۵
سبطِ حسن اور 'افکارِ تازہ'	بیرسٹر عبدالودود	۶۹
سبطِ حسن	شہزاد منظر	۸۴
سیّد سبطِ حسن کا اسلوبِ نگارش	مظہر جمیل	۹۶
سیّد سبطِ حسن۔ ایک عظیم مارکسی مفکر	مسلم شمیم	۱۲۱
سیّد سبطِ حسن	کوثر رضوی	۱۳۴
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا	ریاض صدیقی	۱۴۱
سبطِ حسن کی یاد میں	ڈاکٹر صلاح الدین حیدر	۱۴۹
سبطِ حسن کا فکری کارنامہ	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد	۱۵۴

دوسرا حصہ: شخص و عکس

سبطِ حسن	کیفی اعظمی	۲۲۵

سیّد سبطِ حسن: ایسا کہاں سے لائیں	حمید اختر	۲۲۷
دانشور	فارغ بخاری	۲۴۴
سیّد سبطِ حسن، بہت اچھے آدمی تھے، بہت بڑے آدمی تھے	شوکت صدیقی	۲۵۰
ایک دیا اور بجھا....	شمیم فیضی	۲۵۴
سیّد سبطِ حسن۔ ایک نادرِ روزگار ادیب	میر بشیر	۲۵۸
سبطِ حسن پارٹی ورک سے علمی تحقیق تک	انتظار حسین	۲۶۳
سبطِ حسن ــــ دانش کی قلمرو میں روشن خیالی کا سفیر	حسن عابدی	۲۶۶
کچھ سیّد سبطِ حسن کے بارے میں	منو بھائی	۲۷۰
سید سبطِ حسن، ایک ملتانی کی یادداشت میں	ڈاکٹر انوار احمد	۲۷۳
سبطِ حسن ــــ ایک تاثر	ڈاکٹر فاخر حسین	۲۷۹
سبطِ حسن ــــ یادوں کے جھلملاتے چراغ	زاہدہ حنا	۲۸۳
سبطے بھائی	شاہد نقوی	۲۹۵
سیّد سبطِ حسن ــــ 'شہرِ نگاراں کا مسافر'	ش۔ فرخ	۳۱۰
سیّد سبطِ حسن۔ کچھ یادیں	رفعت سروش	۳۱۸
سبطے چچا	نور ظہیر	۳۲۴
ابو	نوشابہ زبیری	۳۲۸
پیارے سبطے صاحب	سعیدہ گزدر	۳۳۳

تیسرا حصہ: شعراء کا خراجِ عقیدت

سبطِ حسن سے ایک وعدہ	نیاز حیدر	۳۳۹
نذرِ سبطِ حسن	صفدر صدیق رضی	۳۴۱
سیّد سبطِ حسن	قمر ہاشمی	۳۴۲
سبطِ حسن کی نذر	شاہد نقوی	۳۴۴

madlib.org

عرضِ مرتب

معروف سماجی مؤرخ، ادیب اور صحافی سیّد سبطِ حسن نے ۱۹۸۶ء میں ستر سال کی عمر میں دنیا سے اپنا رختِ سفر باندھا۔ سات عشروں پر پھیلی ہوئی اس زندگی میں تقریباً نصف صدی کا عرصہ غیر معمولی علمی اور سیاسی مصروفیات کا حامل رہا۔ وہ ایک تہذیبی انسان تھے جنہوں نے ایک ہمہ جہت زندگی گزاری اور مختلف شعبوں میں اپنے گہرے انفرادی نقوش ثبت کیے، لیکن ان کی بنیادی شناخت ایک مارکسی مفکر کی تھی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ پاکستان میں اشتراکی فکر کے سب سے بڑے قلمکار اور شارح تھے۔ انہوں نے اپنی اردو اور انگریزی تحریروں میں ایک اشتراکی کی حیثیت سے ماضی اور خود اپنے عہد کے مختلف سماجی و سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ان کا طرزِ فکر معروضی تھا۔ وہ سائنسی نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے اور ایسا کرتے وقت وہ سماجی علوم کے مختلف مضامین سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں بیک وقت ایک تاریخ نویس، علمِ بشریات کا ماہر، اقتصادیات کا گہرا فہم رکھنے والا اور ادب کا بہترین شناور اپنے رشحاتِ فکر کو پیش کرتا نظر آتا ہے۔ سبطِ حسن صاحب کے مآخذ نظری اعتبار سے بھی مختلف النوع تھے۔ وہ مابعدالطبعیات مذاہبِ عالم، کلاسیکی اور جدید فلسفے اور پھر سائنسی افکار، سب کے مطالعے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان کا قدیم اور جدید افکار کو پرکھنے کا انداز خالص مارکسی تھا۔ وہ افکار کو قائم بالذات اور انسانی ذہن کی موشگافیوں کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ ان کا تجزیہ متعلقہ زمانوں کے سماجی دروبست اور معاشرتی تضادات کے تناظر میں کرتے تھے۔ چنانچہ قدیم تہذیبوں کے نظام ہائے فکر واحساس کا جائزہ انہوں نے ان تہذیبوں میں مروّج پیداواری رشتوں اور مادّی حقائق کے پس منظر میں لیا ہے۔ وہ عہدِ وسطیٰ کے خیالات و افکار کو بھی ان کی زمانی، سماجی تشکیلات کے حوالے سے پرکھتے تھے۔ اسی طرح جدید دور میں افکار کی نمو اور ان کی باہمی کشمکش بھی ان کے خیال میں اس عہد کے

سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی سماجی چیرہ دستیوں کے پس منظر میں ہی سمجھی جا سکتی ہیں۔

سبطِ حسن صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو عشرے خالص علمی اور تحقیقی کاموں کی نذر کیے۔ اس شوق اور جستجو کی حامل کئی کتابیں ہیں جنھوں نے اپنی اشاعت کے ساتھ ہی اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ پھر ان کے ایک کے بعد دوسرے ایڈیشن چھپتے چلے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معاشرے کے جمود زدہ ماحول اور خشک زمین پر ان کی تحریریں بارش کے پہلے قطروں کی طرح پہنچیں اور تیزی سے جذب ہوتی چلی گئیں۔ نوجوان نسل جن سوالوں کے جواب ڈھونڈھتی پھر رہی تھی، ان کا جواب ان تحریروں سے میسر آیا۔ پاکستان کے دور افتادہ علاقوں تک ان کتابوں کی پہنچ اسی لیے ممکن ہوئی کہ یہ نئے خیالات و افکار کی پیامبر تھیں۔ سبطِ حسن صاحب نے اپنی تحریروں میں بہت سے مسلمات کو چیلنج کیا اور بہت سے ایسے غیر حقیقی تصورات کو، جنھوں نے ذہنوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، اپنے سائنسی تجزیوں کے ذریعے غلط ثابت کیا۔ پاکستان میں مذہب کے نام پر ضعیف الاعتقادی کو جس طرح فروغ دیا گیا اس نے معاشرے کی صحتمند نشوونما کے راستے مسدود کر دیے تھے۔ جادو ٹونے، تعویذ گنڈے اور دوسرے مافوق الفطرت تصورات نے لوگوں کے ذہنوں کو بند کرنے کا جو کام کیا، اس کی اصلاح کے لیے تھا کہ ان تمام رجحانات اور تصورات کی، عقل کی روشنی میں اصلاح کی جائے۔ یہ کام سبطِ حسن صاحب کی تحریروں نے بہت مؤثر انداز میں کیا۔ انھوں نے 'ماضی کے مزار' میں قدیم تہذیبوں کے تخلیقِ آدم کے متعلق تصورات کا تجزیہ علمِ بشریات کے جدید تر نظریات کی روشنی میں کیا۔ اسی طرح مسلم معاشروں میں تقلید کا رجحان جو بالآخر فرقہ پرستی پر منتج ہوتا ہے، کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ اِن معاشروں میں فیوڈل ازم اور ملوکیت نے عقل و خرد کے راستے بند کرنے اور انسانی اذہان کو تخلیق کی طرف مائل ہونے کے بجائے تقلید پر مجبور کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

مذہب ہی کے حوالے سے انھوں نے اپنے عہد میں ریاستوں کی ریشہ دوانیوں، اور عوام دشمن پالیسیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی جس طرح عہدِ وسطیٰ میں حکمران اپنے اقتدار کے جواز کے لیے الوہی حوالوں کا استعمال کرتے تھے، اسی طرح جدید دور میں بھی قانونی استحقاق سے محروم حکمران عوام پر اپنی حکمرانی اور تسلط کو تھوپنے کے لیے مذہب کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے۔ ان کی کتاب 'نویدِ فکر' اس سلسلے میں ایک فکر انگیز اور راہ کشا تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

سبطِ حسن صاحب کا طرزِ فکر تاریخی تھا۔ وہ ماضی کے کسی بھی عہد کے سیاسی و سماجی اداروں، رسوم و رواج اور خیالات و افکار کو اسی عہد کے تناظر میں دیکھتے اور اُسی کے پس منظر میں ان کی وقعت کا تعین کرتے تھے۔ ایسا کرتے وقت ان کے پیشِ نظر یہ بھی ہوتا تھا کہ یہ حقیقت بھی واضح کر دی جائے کہ ماضی کے کسی بھی عہد کی کارفرما قوتوں کے درمیان تمیز کس طرح قائم کی جائے۔ یہاں ان کی تاریخیت ان کی ترقی پسندی سے ہم آہنگ ہوتی تھی اور ان کا کہنا یہ ہوتا تھا کہ ماضی کی کسی بھی جدل میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ متضاد اور متحارب قوتوں میں کون موجود نظام کی بقا اور اس کو اسی مقام پر رکھنے کے لیے کوشاں ہے، اور کون سی قوت تبدیلی کی علمبردار ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک عہد میں تبدیلی کی علمبردار قوت جو یقینی طور پر اس عہد کی ترقی پسند قوت قرار دی جا سکتی ہے ضروری نہیں کہ بعد کے عہد میں بھی ترقی پسند قوت ہی کہلائے، جب تک کہ وہ اس بعد کے عہد میں بھی تبدیلی ہی کی علمبردار نظر نہ آئے۔

سبطِ حسن صاحب کی مبسوط علمی و تحقیقی تصانیف 'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'انقلابِ ایران' اور 'نویدِ فکر' کے نام سے شائع ہوئیں۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل وہ اپنی انگریزی تصنیف 'Battle of Ideas in Pakistan' مکمل کر کے پریس میں بھجوا چکے تھے۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد منصۂ شہود پر آئی۔ اسی طرح وہ ایک اور کتاب فیض احمد فیض کے بارے میں تحریر کر رہے تھے۔ یہ کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اَجل سے پیغام آ گیا۔ معروف صحافی اور سبطِ حسن صاحب کے ہمدمِ دیرینہ حسن عابدی صاحب نے اُن کے کاغذات میں سے اس کتاب کے مسودات نکال کر ضروری ترتیب و تدوین کے بعد 'سخن در سخن' کے نام سے اُس کو شائع کیا۔ سبطِ حسن کا ایک اور نامکمل کام مارکس اور عالمِ مشرق سے متعلق ان کی تحقیق تھی۔ اس موضوع پر انہوں نے غیر معمولی عرق ریزی کی تھی۔ کارل مارکس کی تحریروں کا مطالعہ تو وہ جواں سالی سے کر رہے تھے اور اس موضوع پر انہوں نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا تھا لیکن مذکورہ کتاب تصنیف کرنے کے لیے اور خاص طور سے عالمِ مشرق اور مسلم ممالک میں مارکسی فکر کی ترویج اور اس کے اثرات کے بارے میں قلم اٹھانے سے قبل وہ بہت سا لوازمہ جمع کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لندن کی انڈیا آفس لائبریری سے بہت سی نادر تحریروں کے فوٹو سٹیٹ حاصل کیے تھے۔ جس وقت سبطِ حسن صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت تک وہ اس کتاب کے

ابتدائی تین چار ابواب مکمل کر چکے تھے اور بقیہ ابواب کا نقشہ انہوں نے مرتب کر رکھا تھا۔ ان کی ان سب تحریروں کو یکجا کر کے اور مارکس کے حوالے سے ان کے بعض طبع شدہ مضامین جو رسائل میں شائع ہوئے تھے، کو شامل کرتے ہوئے راقم السطور نے 'مارکس اور مشرق' کے نام سے ان کی کتاب مرتب کی جو علمی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی کی حامل ٹھہری۔ بیرونِ ملک دنیا کی مختلف جامعات میں اس موضوع پر کام کرنے والے نوجوان محقق اب بھی اس کتاب کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس سے کچھ نہ کچھ مدد ان کو ضرور حاصل ہوتی ہے۔

سبطِ حسن صاحب کا تاریخ کے ارتقائی عمل کو دیکھنے کا ترقی پسند رجحان، سماجی تجزیہ نگاری میں تاریخی مادّیت، اور جدلیاتی مادّیت کے اصولوں کو برتنے کی ان کی روش اور مستقبل کے حوالے سے امکانات کے تعین کی کاوشیں، جو ان کی فکر انگیز تصانیف میں کارفرما نظر آتی ہیں، ان کی ادبی تحریریں بھی ان سے گہرائی اور گیرائی حاصل کرتی ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی زندگی میں ادب کے موضوع پر ان کی کوئی باضابطہ کتاب یا مضامین کا مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن مختلف جرائد اور رسالوں میں ادب سے متعلق اُن کے بے شمار مضامین شائع ہوئے تھے۔ ان بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کر کے اب تک چار مجموعہ ہائے مضامین شائع کیے جا چکے ہیں۔ 'افکارِ تازہ'، 'ادب اور روشن خیالی'، 'مغنّیِ آتش نفس ___ سجاد ظہیر' اور 'ادیب اور سماجی عمل' کے عنوانات سے مرتب کی گئی یہ کتابیں ان کے ادبی شعور اور ترقی پسند ادبی فکر کی بہترین عکاس ہیں۔ ان کتابوں میں نظری اور تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں اور عملی تنقید پر مشتمل تحریریں بھی۔

علمی اور تحقیقی کتابوں اور ادبی تحریروں کے علاوہ سبطِ حسن صاحب کی قلمی کاوشوں کا ایک بڑا میدان صحافت سے ان کی وابستگی اور 'لیل و نہار' جیسے اہم ہفت روزہ کی ان کی ادارت سے عبارت ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک 'لیل و نہار' کے ایڈیٹر رہے جو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا جریدہ تھا۔ میاں افتخار الدین کے اس ادارے سے روزنامہ 'امروز' اور انگریزی کا 'پاکستان ٹائمز' بھی شائع ہوتے تھے۔ سبطِ حسن صاحب کا اس رسالے سے تعلق اس وقت ختم ہوا، جب پی پی ایل کو ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد ایوب خان کی فوجی حکومت نے سرکاری ملکیت میں لے لیا۔ 'لیل و نہار' کا دوسرا دور ۱۹۷۰ء میں شروع ہو کر ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا۔ پچھلے دور میں 'لیل و نہار' لاہور سے شائع ہوتا تھا جبکہ دورِ ثانی میں اس کی اشاعت کراچی سے ہوئی۔

'لیل و نہار' میں سبطِ حسن صاحب کے اداریے سیاسی و سماجی حالات پر ایک عوام دوست اور ترقی پسند فکر کے آئینہ دار تھے۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ ملک میں ہونے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور کمزور جمہوریت کے خلاف کمر بستہ ریاستی اداروں کی آمرانہ روش کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کے اداریوں کی ادبی حیثیت بھی مسلّمہ ہے۔ ان کے طرزِ تحریر میں نہ تو بلند آہنگ لفاظی ہے اور نہ ہی مجہول قسم کی نعرے بازی۔ وہ بہت ٹھہراؤ کی حامل زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کا طرزِ تحریر سادہ اور مدلل ہوتا تھا۔ محترم احمد سلیم صاحب نے ان تمام اداریوں کو مرتب کر کے 'پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل' کے عنوان سے مکتبۂ دانیال سے شائع کروایا تھا جو سبطِ حسن کی جملہ کتابوں کا پبلشر ہے۔

یہاں ہم سبطِ حسن صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی مختصراً حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی زندگی کا ایک اہم گوشہ رہا تھا۔ سبطِ حسن صاحب نے نوجوانی کے زمانے ہی سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اختیار کر لی تھی اسی حوالے انہوں نے پارٹی کے اخبارات و جرائد میں لکھنے کی اور ان کے شعبۂ ادارت میں شامل ہونے کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ بمبئی سے شائع ہونے والے پارٹی کے ترجمان 'قومی جنگ' میں انہوں نے بے شمار مضامین، شذرے اور رپورٹیں تحریر کیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب وہ یہاں تشریف لائے تب بھی انہوں نے پارٹی کے پولٹ بیورو کی رکنیت کے ساتھ ساتھ اس کے صحافتی محاذ پر سرگرمی سے کام کیا۔ پارٹی کے کتابچے، اعلان نامے اور دوسری دستاویزات لکھنے کی اکثر و بیشتر ذمہ داری انہوں نے ہی پوری کی۔ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس کے حوالے سے گرفتاریوں کا عمل شروع ہوا تو سبطِ حسن صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بعدازاں ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنّفین دونوں کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ سبطِ حسن صاحب رہائی کے بعد مختلف اخبارات و جرائد میں مضمون نویسی کرتے رہے۔ 'لیل و نہار' میں ان کی ادارت کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ چند برس مزید لاہور میں مقیم رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے کچھ عرصہ فیروز سنز لاہور میں کام کیا۔ کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مجلس ترقیٔ ادب کے لیے کچھ کتابیں مرتب کیں اور ان کے مفصّل تعارف تحریر کیے۔ اسی زمانے میں انہوں نے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں بھی مضمون نگاری کی۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اوائل میں وہ کراچی منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے آئندہ برسوں میں تصنیف و تالیف کو اپنا بنیادی

مشغلہ بنایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً وہ 'حریت' اور 'ڈان' میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ 'ڈان' میں ان کے دو اہم مباحثے بھی شائع ہوئے۔ ایک مباحثہ جو معروف ماہر قانون خالد اسحاق ایڈووکیٹ کے ساتھ ہوا، وہ سیکولرازم کے موضوع پر تھا۔ اسی طرح پروفیسر قمرالدین خان کے ساتھ انہوں نے مسلم دنیا کی پسماندگی کے اسباب پر ایک مباحثے میں حصہ لیا۔

سبطِ حسن صاحب کی بیشتر اردو تحریریں مرتب کردہ کتابوں میں یکجا ہو چکی ہیں۔ جن میں سے پانچ کتابوں کی ترتیب و تدوین کی مسرت راقم السطور کو حاصل ہوئی۔ سبطے صاحب کی انگریزی تحریریں بھی جمع کر لی گئی ہیں اور امید ہے کہ وہ بھی جلد کتابی صورت میں پیش کر دی جائیں گی۔

سبطِ حسن صاحب اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت واقع ہوئے تھے کہ انہیں ان کی زندگی میں بھی خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی اور علمی اور ادبی حلقوں میں ان کے کام کا اعتراف کیا گیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کا نام اور کام ذہنوں پر نقش رہا۔ خاص طور سے نئی نسل ان کی تحریروں کو بہت جلد حرزِ جاں بنا لیتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ذہنوں کو اپیل کرتے ہیں اور یوں دلوں میں بھی جگہ بنا لیتے ہیں۔ سبطِ حسن صاحب کے انتقال کے بعد دو تین جرائد نے ان کے متعلق خصوصی نمبر بھی شائع کیے۔ اس سلسلے میں پہلا خصوصی نمبر کراچی سے نکلنے والے علمی جریدے 'ریسرچ فورم' نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے ادبی جریدے 'طلوعِ افکار' نے بھی ایک بھرپور نمبر سبطِ حسن صاحب کے حوالے سے شائع کیا۔

زیرِ نظر کتاب سبطِ حسن صاحب پر لکھے گئے پرانے اور نئے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں مذکورہ خصوصی نمبروں کے منتخب مضامین بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی اور علمی جرائد اور اخبارات میں چھپنے والے بعض مضامین کو بھی منتخب کیا گیا ہے۔ ہمارا مقصد بیک نظر یہ دیکھنا ہے کہ سبطِ حسن صاحب کی علمی خدمات کا کس انداز میں اور کس سطح پر اعتراف کیا گیا۔

اس کتاب کے مشمولات بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ ان میں پہلے حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جو سبطِ حسن صاحب کی فکر اور ان کے علمی کام کا احاطہ کرتے ہیں دوسرے حصے میں وہ مضامین یکجا کیے گئے ہیں جو ان کی شخصیت اور مزاج کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین میں بھی جگہ جگہ ان کی فکر کا پرتو نظر آتا ہے اور لکھنے والوں نے ان کی شخصیت کو ان کے افکار کی روشنی میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے کچھ تحریریں خالصتاً تاثراتی اور جذباتی نوعیت

کی ہیں، خاص طور پر وہ تحریریں جو اُن کے انتقال کے فوراً بعد ایک صدمے کی فضا میں لکھی گئیں۔ کتاب میں ایک مختصر سا تیسرا حصہ بھی شامل ہے جس میں سبطِ حسن صاحب کے انتقال کے بعد بعض شعراء کی جانب سے اُن کو پیش کیے گئے شعری خراجِ عقیدت کو جگہ دی گئی ہے۔

سبطِ حسن صاحب سے متعلق یہ ارمغان جو ہم نئی نسل کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اس امید کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے کہ اس سے پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم دانشور اور مارکسی فکر کے ایک قابلِ ذکر شارح کے افکار اور کردار سے آگاہی میں مدد ملے گی۔ یہ مقصد پورا ہو سکا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ کاوش کامیاب ثابت ہوئی۔

یہاں میں ڈاکٹر انور شاہین صاحبہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مشمولہ مضامین میں دیے گئے تمام اقتباسات کے حوالے بڑی عرق ریزی کے بعد مختلف کتابوں اور جرائد سے تلاش کر کے ان مضامین کو مزید مستند بنانے کا مشکل فریضہ سرانجام دیا۔

۳۱/اکتوبر ۲۰۱۶ء — ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

پہلا حصہ

اعترافِ دانش

maablib.org

سبطِ حسن۔ پاکستان میں انقلابی فکر کی حیاتِ نو

پروفیسر حمزہ علوی

۷راپریل ۱۹۸۷ء

عزیزہ اوشا

آپ کے ۴مارچ کے خط کا بہت شکریہ، جو کراچی سے ۳۱ مارچ کو پوسٹ ہو کر آج صبح یہاں پہنچا۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ سبطے بھائی کی برسی ۲۴ تاریخ کو منا رہی ہیں، اور مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میں اس موقع پر موجود نہیں ہوں گا۔ میرے خیال میں یہ وقت ہے کہ ان کے اس اہم کردار کو وسیع تر پیمانے پر تسلیم کیا جائے جو انہوں نے پرانی نسل سے نئی نسل تک سوشلسٹ اور سیکولر روایت کو پہنچانے کے لیے انجام دیا، جو کہ کسی بھی اور فردِ واحد کے کردار سے کہیں زیادہ اہم کام تھا۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، مجھے وہ لوگ ملتے ہیں جو ان کی تحریروں کی جانب مائل ہوتے ہیں، ان پر بحث مباحثہ کرتے ہیں، اور ان پر مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں ایک نیا مزاج (Mood) پایا جاتا ہے جو بہت مثبت اور تخلیقی ہے جب ہم اپنے نوجوان دانشوروں کو ماضی پر حاوی آنے اور آگے پیشرفت کرتا دیکھتے ہیں، یہ پرانی نسل میں سبطے جیسے چند افراد ہی کا کام ہے

سبطِ حسن صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر ممتاز مارکسی مفکر اور سوشل سائنٹسٹ حمزہ علوی صاحب نے جو مانچسٹر (برطانیہ) میں رہتے تھے، سبطِ صاحب کی صاحبزادی نوشابہ زبیری (جنہیں پیار سے اوشا کہا جاتا تھا اور اب بھی وہ اپنے قریبی حلقوں میں اسی نام سے پکاری جاتی ہیں) کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی تاریخِ فکر میں سبطِ حسن صاحب کے کام کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ پاکستان سے نسبت رکھنے والے سماجی علوم کے سب سے بڑے ماہر کی طرف سے سبطِ حسن صاحب کی علمی خدمات کو ایک زبردست خراجِ تحسین پیش کرنے والی تحریر ہے، جس کا ترجمہ ڈاکٹر انور شاہین نے کیا ہے (مرتب)۔

جنھوں نے سماجی اور فلسفیانہ موضوعات پر بہت سنجیدہ تحریریں لکھیں جن کی جانب یہ نوجوان راغب ہورہے ہیں اور جنھوں نے ایسے اسپرنگ بورڈ کا کام دیا ہے جس سے وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ پہلی نسل کے چند انقلابی دانشور اِن خطوط پر لکھنے کے کام کی جانب کیوں مائل ہوئے تھے۔ اس کے بجائے ہمیں تو شاعری کی پرستش۔ نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور مجھے حیرت ہے کہ یہ کیوں ہوا۔ یہ نظر آتا ہے کہ کسی حد تک ایسی شاعری ہم میں سے ان لوگوں کو سکون وراحت بخشتی ہے جنہیں خوفناک حالات میں سے اپنی زندگی کو کھینچ نکالنا ہوتا ہے۔ لیکن اس طرح کا، خود کو اپنے آپ میں مگن رکھنا مرض کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے، اگر خود ہی یہ پلٹ کر ہمارے ذہنوں کو مقید کرلے اور ہم خودرحمی (self-pity) اور غریبوں کے مصائب کے متعلق اپنے آپ کو درست ثابت کرنے والے بیانیوں میں گِھر جائیں، وہ جن کو ہمیشہ ہم ایک خاص فاصلے پر رکھتے ہیں۔ میں نے یہ بات بہت واضح طور پر اس وقت جانی جب میں نے اپنی بیگم کے ہمراہ پاکپتن کے قریب ایک گاؤں میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزارا۔ یہاں یہ پتہ چلا کہ کس طرح کچھ کسان لیڈر کہلانے والے کسانوں کے قریب ہوگئے۔ شاعری اور تحریر میں اس امر کا احساس اور حقیقی زندگی میں عوام سے فاصلے پر رہنا ہی انقلابی دانشوروں کی علامت ہے۔ وہ تو بلکہ اپنے ہی ساتھی ادیبوں کے محدود قسم کے حلقے میں ہی رہتے ہیں۔ اس نوعیت کا ادب ہمیں کہاں لے کر جائے گا؟ یہ ہماری روح کو تسکین بخشتا ہے۔ شاید یہی ایک بات کم سے کم اس کی اہم ہے۔ لیکن شاید یہی وقت ہے کہ ہم یہ دوبارہ جائزہ لیں کہ ہم کیا کررہے ہیں اور اپنی ثقافتی اقدار کے توازن کو موزوں کرنے کی کوشش کریں جو کہ بہت ہی یکطرفہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ ہم ابھی تک انیسویں صدی کے یوپی اشرافیہ کے کلچر میں رہ رہے ہیں جس نے پاکستان میں غلبہ قائم کیا ہوا ہے، حتیٰ کہ مہاجر جو کہ اس کلچر کے علمبردار ہیں، کافی کچلے جاچکے ہیں۔ ہمیں تو پورے ملک کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہے۔

انقلابی شاعری ایک ممکنہ سماجی قوت کے طور پر صرف اس وقت وجود میں آسکتی ہے اگر یہ ایک وسیع تر سماجی تحریک کا حصہ اور جزولاینفک بن جائے۔ یہ اپنے اعلان شدہ آدرشوں سے اس طرح کی تحریک کا متبادل بن کر انصاف نہیں کرسکتی۔ یہ بذاتِ خود اور بزعم خود ایک سماجی قوت کے طور پر قائم نہیں رہ سکتی اگر یہ ہمارے ذہنوں اور روحوں کے اندر ہی محدود رہے۔ یہ اس وقت ایک قوت

ہے جب یہ کسی جاری سماجی تحریک جس میں عوام سرگرمی سے شامل ہوں، کی آواز بن جائے۔ اس طرح کی کسی تحریک کی غیر موجودگی میں شاعری 'مذہب کی مانند' ایک سکون بخش شے اور ہماری نجی دنیا کے نجی تجربات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی جس میں ہم اپنی پریشان روحوں کی تسکین ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ مذہب کی طرح 'عوام الناس کی افیون' بن جاتی ہے، نہ کہ اس فقرے کے قصداً مسخ شدہ معنوں میں جن میں یہ عموماً غلطی سے سمجھا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ مارکس نے اس کا مطلب لیا تھا۔ یعنی کہ مذہب جس طرح مجبور و مظلوم لوگوں کے زندگی کے درد و غم کو کم کر دیتا ہے۔ اسپرین کا زمانہ شروع ہونے سے قبل انیسویں صدی میں افیون ہی وہ درد کش تھی جو بالائی طبقوں کی دسترس میں تھی۔ چنانچہ مارکس نے یہ تشبیہ (analogy) دی کہ غریب اپنی تباہ حال زندگی بسر کرنے کی تکالیف کم کرنے اور اپنی روحوں کو راحت پہنچانے کے لیے مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

چنانچہ وہ ادب جو انقلابی فکر کی تشکیل کرے کہیں زیادہ اہم ہے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ ہمارے دانشور اپنی توانائی اس میں صرف کریں گے جیسا کہ سبطے نے کیا تھا۔ ہمارے پاس اس طرح کے جوہر کی کمی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ جو بنیادی کام تھا، اسے پس منظر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ شاعری کا کردار ثانوی ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں ایک انقلابی تحریک جو اس نوع کی شاعری کو تناظر فراہم کر سکتی تھی، عدیم الوجود ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی انقلابی جنگیں لڑنے اور انقلابی مقاصد کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے شاعرانہ تخیلات اور خوابوں کا سہارا لیا ہے۔ شاید یہ بھی کسی حد تک خود میں مگن ہو جانے والی سرگرمی بن گئی ہے، ایک انقلابی تحریک کے تناظر کے بغیر 'انقلابی' آرٹ اپنی طاقت کھو دیتا ہے اور محض ایک سانچہ یا فرار کا راستہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں شاعری کی آواز سائرن کی آواز بن سکتی ہے۔ یہ ہمیں یہ یقین دلاتے ہوئے کہ ہم ایک بہتر زندگی کی جدوجہد میں شامل ہیں، اس سے دور لے جاتی ہے۔ ادبی تخیل (fantasy) جو زبان کی دیواروں میں محفوظ و مامون ہوتا ہے، خواہ کتنا ہی حسین ہو، زندگی کے استرداد اور وجود کے لوازمات کا انکار ہو سکتا ہے۔

چنانچہ شاعری عمل کی جانب محرک کے بجائے ایک شکست بن جاتی ہے۔ یہ سماجی عمل کو معطل کر دیتی ہے جب کہ اس کو ایک جاری جدوجہد کے لیے حیات بخش اور قوت بخش ہونا چاہیے۔ تو پھر یہ کس کے مقاصد کو پورا کرتی ہے؟ میں حیران ہوں۔ جزواً تو یہ ہمارے مراعات یافتہ 'مہذب'

بالائی طبقات کے خود میں مگن ضمیر کو مطمئن کرتی ہے۔ یہ طبقے انقلابی ادب پیدا کرنے والوں کی سرپرستی کی عشرت میں اس وقت تک شامل ہونا برداشت کر سکتے ہیں، جب تک یہ خود ان کی اپنی مراعات کے لیے خطرہ نہیں بنتے۔ باقی دوسروں کے لیے انقلابی شاعری ان کے گم شدہ پُر جوش عالمِ جوانی کے آدرشوں کا ایک فرحت بخش جھونکا ثابت ہوتی ہے جس دور کی بے غرض وابستگی (اور معصومیت) کو وہ نوسٹلجیا کے ساتھ یاد کرتے ہیں، لیکن جس کے ساتھ اب وہ مزید زندگی نہیں گزار سکتے۔ وہ اس کے چلے جانے کا ماتم بھی کرتے ہیں اور انقلابی شاعری ان کی دکھی اور قصوروار روحوں کے لیے ایک مرہم بنتی ہے۔ یہ وہ روایت نہیں ہے جو ہمیں ہمارے آدرشوں کی جانب سفر میں ہماری ہمرکاب ہوتی ہے۔ اس طرح کی حد بندیوں میں پابند ادب ہمارے مستقبل کے لیے بہت کم مددگار ثابت ہوتا ہے۔

سبطے نے اس روایت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ یہ ان کا ٹھوس کام ہی تھا جس نے وہ مستحکم بنیاد فراہم کی جس پر نئی نسل اب تعمیر کر رہی ہے۔ یہ ایک مختلف اور نایاب کردار تھا جو کہ ہمارے مستقبل کے لیے کہیں زیادہ اہم تھا۔ ان کے کام نے نوخیز ذہنوں میں سچ کو پروان چڑھایا، ان کی وابستگی کو مضبوط بنایا اور نئے دماغوں کو علمی اعتبار سے غذا بخشی۔ اس سے اپنے تباہ حال سماج کی تعمیرِ نو ستاروں بھرے خوابوں کے بجائے واضح علمی اہلیت کی مدد سے شروع کرنے کے تصور کو پختہ کیا جو انہیں اپنے سماج کے تجزیے اور تفہیم کا طریقہ کار سکھاتی ہے۔ اور پھر یہ سبطے کا ہی کام تھا جس نے نوجوان کارکنوں کو سماجی حقائق کی جانب متوجہ کیا تا کہ وہ نہ صرف مطبوعہ الفاظ بلکہ اپنے سماج کو بھی پڑھنے کا طریقہ سیکھیں تا کہ وہ ایک آدرش اور مقصد کے ساتھ اس سماج میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ ہمیں اپنے حقیقی مسائل کو زبان دینے کی ضرورت ہے اور اپنے اردگرد پھیلی نظریاتی دھندلاہٹوں کا غبار صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سارے عمل میں یہ صرف سبطے ہی ہیں کہ جنہوں نے پاکستان میں سنجیدہ کام کی پہل کاری کی اور اس وجہ سے ہم انہیں سلام پیش کرتے ہیں۔ ہم پہلے ہی پاکستان میں انقلابی فکر کے ایک نئے حقیقی آغاز، ایک نشاۃ ثانیہ کو دیکھ رہے ہیں۔ سبطے کا کام اس کی صفِ اوّل میں پایا جاتا ہے۔ فکر و تجزیے کو یوں نئی زندگی بخشنے کا عمل اس نقطے سے اور دور جائے جہاں پر ہم پہلی نسل کے لوگ اس کو چھوڑیں گے۔ لیکن تعمیرِ مستقبل اس بنیاد پر ہوتی ہے جو اس کو فراہم کی جاتی ہے یہ وہ نقطہ ہے کہ جہاں پر سبطے کا زیادہ تر عطا کردہ کام پایا جاتا ہے۔ سبطِ حسن

ماضی کی گم گشتہ علمی وراثت جو سائنسی سوشلزم کی توریث اور نئی علمی تحقیق کے جوش و ولولے کے درمیان پل کی طرح ہیں، اس روایت کی ترسیل کے کام نے خود سبطِ حسن کو زمانۂ حال میں لا کھڑا کیا ہے اور وہ اس کی ہمراہی میں مستقبل کی جانب گامزن ہیں۔ اسی اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ ساتھ زندہ ہیں۔

اس تحریر کو لکھتے وقت میں اپنے دریچے سے باہر دیکھتا ہوں تو باہر چوک میں آتی بہار کی علامات نظر آ رہی ہیں۔ جب میں سبطے کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ منظر مجھے علامتی محسوس ہوتا ہے۔ سرما زدہ درخت شدید موسم کی سنگینی سے سیاہ اور تاریک ہو چکے ہیں۔ یہ منظر مجھے پاکستان کی صورتِ حال پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ابھی موسمِ گرما نہیں آیا، پسپا ہوتے موسمِ سرما کے برفانی ہاتھوں اور جو موسمِ گرما ابھی نہیں آیا، اس کے وعدے کے درمیان مجھے سخت جان درختوں کی موٹی چھال میں سے نرم شگفتہ کونپلیں نکلتی نظر آ رہی ہیں۔ نئی حیات کی چھا جانے والی توانائی جس کو درختوں پر لپٹی سخت چھال کا جمود اور مضبوطی بھی دبا نہیں سکتی، دیکھ کر میں طلسم زدہ ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس میں سے جو مواد بہتا ہے وہ کچھ ایسا واضح نہیں ہے۔ یہ حیاتِ نو کی ناقابلِ مزاحمت طاقت ہے جس کو کچلا نہیں جا سکتا۔ بڑی محتاط ہری گھاس کے نیچے سے خوب صورت نارنجی کرکم کے پھول اپنے ننھے ننھے سر اٹھا رہے ہیں۔ یہ آتی بہار کے چند اشارے بمشکل نظر آ رہے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ نئی شان سے، فخر و انبساط سے بھرپور بہار آئے گی۔ پاکستان کے بارے میں جو کہ اس سیاہ منظر کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ ہے، سوچنا اس وقت میرے لیے سبطے کو ایک علامت میں بدل دیتا ہے۔ دور ادھر، میری کھڑکی کے بالکل مقابل ایک چیری کا درخت اپنے بھرپور شگوفوں کے ساتھ بغیر کسی جھجک شرم کے کھڑا ہے۔ اس کے گلابی شگوفوں نے پورے لینڈ اسکیپ کے بنجر منظر کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ موسمِ گرما کے بھرپور شگوفوں کی ابھی سے صورت گری کر رہا ہے جس کا جوبن اب سے زیادہ دور نہیں رہا، یہ طے ہے۔ چیری کا درخت میرے لیے ایک لمحے کو سبطے بن گیا ہے جو کہ تاریک ویرانیوں میں اپنے بھرپور شگوفے لیے موجود ہے، وہ ویرانی کہ جس میں ہم زندہ رہے اور ایک بہتر کل کے لیے امید رکھتے ہوئے جدوجہد کرتے رہے۔

میرا ارادہ تو ایک دو سطریں لکھنے ہی کا تھا۔ درحقیقت میں اس بات کی بھی معافی چاہتا ہوں کہ میں سبطے کے لیے کوئی مناسب خراجِ تحسین یا ایسے ہی کچھ اور لکھنے سے خود کو مجبور پاتا ہوں۔ یہ بھی

معجزہ ہے کہ میں نے اس قدر لکھ لیا۔ لیکن میں رو میں بہہ گیا تھا۔ اور ایک خالص پاکستانی انداز میں میرے گالوں پر آنسو اس لمحے بہہ رہے ہیں اور مجھے اپنی آنکھوں کو بار بار صاف کرنا پڑ رہا ہے تاکہ میں لکھنا جاری رکھ سکوں، میں تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ یہ سطریں لکھی ہیں، وہ خود بخود میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہیں۔

maablib.org

ترقی پسندی اور روشن خیالی کا مجاہد۔سیّد سبطِ حسن

عبداللہ ملک

سیّد سبطِ حسن اللہ کو پیارے ہو گئے۔وہ پاکستان کے ہی نہیں بلکہ اس برصغیر کے صفِ اوّل کے مارکس دانشور تھے۔انہوں نے اپنی پوری عمر آزادی اور سماجی تبدیلیوں کی جدوجہد میں بسر کر دی۔وہ ترقی پسند مصنّفین کے ابتدائی اراکین میں سے تھے۔پورے ایک سال پہلے ان کے اعزاز میں کراچی شہر میں ایک محفل بپا ہوئی تھی۔اس میں میں بھی مدعو تھا اور اس موقع کے لیے جو مقالہ رقم کیا تھا آج وہ میں ان کی موت پر پیش کر رہا ہوں۔ان سے آخری ملاقات ابھی پچھلے دنوں کراچی میں ترقی پسند مصنّفین کی جوبلی تقریب منائی گئی تو اس موقع پر ہوئی تھی اور اس سے پہلے جب گئے سال لندن میں ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات ہوئی تھیں تو اس میں بھی ہم ایک ساتھ تھے۔ان سے قریب قریب نصف صدی سے دوستی اور احترام کا رشتہ چلا آتا تھا جو آج یکا یک ٹوٹ گیا ہے۔

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور درہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

یہ ۱۸/اپریل ۱۹۸۵ء کا واقعہ ہے کہ آغا سہیل جو ادارہ ادبستان کے مہتمم اور عزیز محترم محمد علی صدیقی کے دوست ہیں نے ٹیلی فون کیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ جناب محمد علی صدیقی صاحب کا مکتوب مل گیا ہے تو اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ میں نے پوچھا کون سا مکتوب کیونکہ مجھے تو محمد علی صدیقی صاحب نے یاد نہیں فرمایا تو اس پر انہوں نے حیرانی کا اظہار کیا اور مجھے یہ مکتوب ٹیلی فون

یہ مضمون ماہنامہ 'دھنک' (لاہور) کے مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا (مرتب)۔

پڑھ کر سنادیا اور دریافت کرنے لگے کہ اگر چاہیں تو یہ مکتوب دوبارہ ارسال کر دیا جائے۔ میں نے آغا سہیل سے کہا تھا کہ اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں اور میں نے ان کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ وہ محمد علی صدیقی صاحب کو مطلع کر دیں کہ میں مضمون بھی لکھوں گا اور محفل میں حاضر بھی ہوں گا کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سبطِ حسن محترم کی دلبری کا چرچا ہوا اور ہم اس محفل میں شریک نہ ہوں اور تکلف کے چکر میں پڑے رہیں کہ ہمیں باقاعدگی اور رسمی طور پر دعوت نامہ موصول ہوا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ ہم سے زیادہ خوشی کس کو ہوگی کہ سبطِ حسن کے اعزاز میں محفل بپا ہو، ان کے علم و فضل کا اعتراف ہو کیونکہ سبطِ حسن کو خراج ان کے آدرش ان کے مسلک کی صداقتوں کا بھی اعتراف ہے آج کتنی خوشی کا دن ہے کہ ہم سبطِ حسن ایک عالم کے دلبر ہیں اور ہم چاہنے والوں کی فوج ظفر موج کے آخری سرے پر کھڑے ہیں کہ یارِ محترم کی ایک جھلک ہی دیکھ لیں۔ ان کے منہ سے دو بول ہی سن لیں لیکن ان حسرتوں کے درمیان ایک اطمینان ضرور ہے کہ ہم نے سیّد سبطِ حسن کو اس وقت چاہا جب ان کے چاہنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ ہم ان کے علم سے اس وقت متاثر ہوئے جب ان کے علم و فضل کا چرچا ابھی چاردانگ عالم میں نہیں پھیلا تھا۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا، ان کا احترام بھی کیا اور پیار بھی کیا اور آج یہاں احترام اور پیار کی زنجیریں ہی ہیں جو پابجولاں یہاں کھینچ لائی ہیں اور ہم بے پایاں مسرور و شادمان ہیں کہ آج ایک عالم سیّد سبطِ حسن کا معترف ہے لیکن اس موقع پر اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سیّد سبطِ حسن کے علم و فضل کا اعتراف صرف سیّد سبطِ حسن کی ذات، ان کی پیاری اور حسین شخصیت کا ہی اعتراف نہیں بلکہ یہ اس مسلک، اس آدرش اور اس فلسفہ زندگی کی سچائیوں اور صداقتوں کا بھی اعتراف ہے، جن کو سیّد سبطِ حسن نے قریب قریب نصف صدی پہلے تسلیم کیا تھا اور انہی صداقتوں کی کوکھ سے ہی ترقی پسندی اور خردافروزی نے جنم لیا تھا اور آج سیّد سبطِ حسن اسی ترقی پسندی اور خردافروزی کی علامت ہیں اور یہی وہ مسلک اور آدرش ہے، جس کے لیے انہوں نے وقفے وقفے کے بعد صعوبتِ زنداں بھی برداشت کی اور حاکموں کے غیظ و غضب کا بھی تختہ مشق بنے۔ یہی ان کے اور ہمارے درمیان پیار و احترام کی قدر مشترک ہے۔ سیّد سبطِ حسن سے پہلی ملاقات ٹھیک ۴۲ برس پہلے ہوئی تھی۔ یہی مئی کا مہینہ تھا اور ۱۹۴۳ء کا سال بمبئی کا شہر، وہی بمبئی کا شہر جو ایک عالم میں مہ وشوں اور سیم تنوں کے لیے ناجاتا ہے، جہاں سے پردۂ سیمیں پر نمودار ہونے والی پری پیکر حسیناؤں کی زلفِ گرہ گیر میں اس

برصغیر کے نوجوانوں کے دل اٹک کر رہ جاتے ہیں لیکن وہ شہر صرف مہ وشوں اور سیم تنوں کا ہی شہر نہیں بلکہ یہ شہر مزدور طبقے کی ایک عظیم الشان تحریک کا بھی مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے اور یہی وہ شہر ہے جہاں پر مجبور مقہور اور دھتکارے ہوئے انسانوں نے کانگریس کے ترنگے اور مسلم لیگ کے ہلالی سبز پرچم سے عدم اطمینان کا اظہار کر کے سرخ پرچم بلند کیا تھا اور اپنی امیدیں اور آشائیں اس پرچم کے ساتھ وابستہ کی تھیں اور اسی پرچم کو تھام کر کل ہند کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا اعلان کیا تھا اور یہیں پر برصغیر میں پہلی بار کُل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ جس کے لیے سوویت روس کے سوشلسٹ انقلاب کے رہنما لینن نے خاص طور پر ہندوستانی مزدوروں کے نام پیغام بھیجا تھا۔ یہ تھی اس شہر دلبراں کی اہمیت جہاں ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس کا ڈول ڈالا گیا۔

ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی جو سالہا سال سے خلافِ قانون تھی اور انہی پابندیوں کے ہوتے ہوئے وہ سرگرمِ عمل تھی۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب برطانوی سامراج اور سوشلسٹ روس کا فسطائیت کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہوگیا تو ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی پر سے بھی پابندی اٹھالی گئی تو کیمونسٹ پارٹی نے اپنا مرکزی دفتر بھی اسی شہر میں ہی قائم کیا اور پھر پارٹی کی پہلی کانگریس کا اہتمام بھی اسی شہر میں ہوا، چنانچہ کیمونسٹ پارٹی کی یہ پہلی کانگریس ہی تھی جس میں شرکت کے لیے پنجاب کی کیمونسٹ پارٹی کی طرف سے جو مندوب چنے گئے ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ سیّد سبطِ حسن، سردار جعفری اور سیّد سجاد ظہیر پارٹی کے مرکزی اخبار 'قومی جنگ' کی نمائندگی کر رہے تھے۔

سیّد سجاد ظہیر تو 'لندن کی ایک رات'، 'انگارے' اور 'شعلے' جیسی تصنیفات کی وجہ سے ایک وسیع حلقے کو متاثر کر چکے تھے اور ہماری نسل کے ہیرو کا روپ دھار رہے تھے ویسے بھی اس وقت تک وہ سیاست اور ادب کی مخصوص تحریکوں کے حوالے سے ایک مسلمہ رہنما مانے جاتے تھے۔ سیّد سبطِ حسن بھی لکھنؤ سے نکلنے والے 'نیا ادب' کے جریدے کے حوالے سے جانے جا چکے تھے بالخصوص 'نیا ادب' میں ان کا مضمون اقبال کے شاہین پر شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے شاہین کی علامت کا ایک وسیع پس منظر میں رکھ کر تجزیہ کیا تھا۔ چنانچہ اس مضمون نے پنجاب کے اس وقت کے اقبال پسندوں یا اقبال پرستوں کو خاصا جزبز کر دیا تھا اس لیے ہم سیّد سبطِ حسن سے ان تمام حوالوں سے متعارف تو تھے لیکن ہمارے لیے سیّد سبطِ حسن اس واسطے زیادہ محترم ٹھہرے تھے کہ وہ پارٹی کے مرکزی اخبار میں کام کر رہے تھے۔ میں اس وقت پنجاب کیمونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار 'جنگِ

آزادی' سے منسلک تھا۔ اور پارٹی کے مرکزی اخبار 'قومی جنگ' کو بھی پنجاب میں پارٹی کی سرگرمیوں سے متعلق مکتوب بھیجا کرتا تھا اس لیے سیّد سبطِ حسن بھی مجھ سے کم از کم نام کی حد تک تو واقف تھے۔ جب پارٹی کانگریس ختم ہوگئی تو سیّد سجاد ظہیر جو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے اور مرکزی اخبار کے مدیر بھی تھے، نے پنجاب پارٹی کے سیکریٹری سوہن سنگھ جوش سے کہا کہ چونکہ پنجاب 'قومی جنگ' کی کھپت کا ایک اہم مرکز ہے اس لیے پنجاب پارٹی کی طرف سے کسی ایک شخص کو 'قومی جنگ' کے عملہ ادارت میں شامل ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ پنجاب کی صورتِ حال پر مضامین لکھ سکے اور خبریں صحیح پس منظر میں مرتب کر سکے۔ قرعہ فال میرے نام ہی نکلا چنانچہ مجھے بمبئی میں رکنا پڑا اور یہاں سے سیّد سبطِ حسن، سردار جعفری اور سیّد سجاد ظہیر کے حلقہ نیازمنداں میں شامل ہوا، ویسے بنیادی طور پر میں اپنے آپ کو حلقۂ عشاق کا کارکن سمجھتا ہوں۔ بنّے بھائی سے بے پناہ عشق کیا ہے ان کو چاہا ہے اور آج بھی جب ان کو ہم سے جدا ہوئے ایک دہائی سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے ان کی یاد اب بھی رہ رہ کر ستاتی ہے اور سیّد سبطِ حسن سے ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ وہ بنّے بھائی کے چاہنے والوں کی پہلی صف میں تھے اور سچ یہ ہے کہ بمبئی کے قیام کے دوران میں بنّے بھائی اور ان کی بیگم آپا رضیہ نے جس شفقت اور محبت کا اظہار کیا ان دنوں کی یاد اب بھی رلا رلا دیتی ہے۔ یہی وہ دن تھے جب سیّد سبطِ حسن کے علم و فضل اور اپنے آدرش سے ان کی وابستگی نے متاثر کیا لیکن ان پر مستزاد ان کی نفاست طبع ان کے حسن اور خوش پوشی اور ان سب نے مل کر ہمیں ان کا اسیر بنا دیا اور اسیری کی یہ زنجیریں آج تک نہ ٹوٹ سکی ہیں اور نہ ہی ان میں کمزوری آئی ہے، بلکہ ہم تو کھل کر ان سے اپنی چاہت کا اظہار بھی نہیں کر پائے۔ یہ تو آج اس محفل نے ہماری ہمت بندھا دی کہ ہم نے وہ بات کہہ دی جو ہم ۴۲ برس میں نہیں کہہ پائے۔

بہرحال میں نے سیّد سبطِ حسن کے ساتھ ایک ہی ادارے میں اور ایک ہی چھت کے نیچے چھ ماہ گزارے تھے، کیونکہ رہائش بھی ایک ہی فلیٹ میں تھی۔ اس فلیٹ میں شاکر علی مرحوم، سردار جعفری اور سیّد سبطِ حسن رہ رہے تھے اور اب چوتھا میں بھی ان کے ہمراہ مقیم ہو گیا، میں عمر میں ان سب سے سات آٹھ برس چھوٹا تھا۔ اس لیے اس تفاوت نے بھی ایک قسم کی برخورداری کی زنجیر پہنا دی اور بزرگی اور علمی وسیاسی تجربے کی طوالت نے خاصا مرعوب کیا اور یہ رعب آج بھی قائم ہے۔ اس محبت اور رفاقت کے دور میں ان سے بہت کچھ سیکھا اور پھر جب پاکستان بنا تو وہ

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے قائدین کی حیثیت سے بنے بھائی کے ہمراہ لاہور پہنچے تو اس دور میں بھی ان سے رفاقت رہی اور ہم ان کے احکام بجالاتے رہے۔ غرضیکہ ان سے ایک رشتہ ہو تو بتاؤں کاش بنے بھائی آج زندہ ہوتے اور اس محفل کو دیکھ پاتے۔

یہ داستان طویل بھی ہوگئی ہے اور جذبات کو مرتعش کرنے والی بھی، اور ڈر ہے کہ اس کا انجام رونے رلانے پر نہ پہنچ جائے۔ میں خود بھی شرمندہ ہو رہا ہوں کہ میں ذاتی تعلقات اور دیرینہ رفاقتوں کا ذکر لے بیٹھا ہوں۔ حالانکہ اس وقت اور اس محفل میں مجھے سیّد سبطِ حسن کی روشن خیالی اور خردافروزی کے لیے جہدِ مسلسل کا ذکر مقصود ہے۔ کیونکہ آج کی محفل کا انعقاد ہی اسی مقصد کے لیے عمل میں آیا ہے۔ آج سیّد سبطِ حسن جس روشن خیالی اور خردافروزی کے جہاد کی علامت بن کر ابھرے ہیں اس جہاد کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی ویسے رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا تصادم ہمیشہ سے رہا ہے۔ لیکن وہ دور بڑا المناک ہوتا ہے جب ترقی پسندی اور روشن خیالی کی طاقتوں کو پسپا ہونا پڑے یا ہزیمت اٹھانی پڑے اور غالباً آج کی محفل اسی احساس کا اظہار ہے کہ روشن خیالی اور خردافروزی کی طاقتوں کو متحد ہو کر ملائیت، تعصب، فرقہ واریت اور خرددشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہیے اور دراصل جب سیّد سبطِ حسن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اہتمام ہوا یا ان کے علم و فضل کے بارے میں گفتگو کا سلسلہ ہوا ان سب کا مقصد دراصل خردافروزی کے جہاد کو آگے بڑھانا ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ ہر جہاد کے لیے ایک پرچم اور ایک علامت ضروری ہوتی ہے اور کراچی والے تو خوش قسمت ہیں کہ ان کے ہاں روشن خیالی اور خردافروزی کی علامتیں آج بھی موجود ہیں۔ جس شہر میں جناب سلیم الزماں صدیقی اور پروفیسر کرار حسین جیسے بزرگ موجود ہوں اور اس قافلہ کے رکن ہمارے پیارے سبطِ حسن بھی ہوں وہاں تمام یلغاروں اور شب خونوں کے باوجود عقل دشمن طاقتوں کو بالآخر پسپا ہونا ہی پڑے گا۔ اسی امید اور تیقن نے اس محفل کے منتظمین کو دعوت نامے میں یہ الفاظ لکھنے پر اکسایا ہوگا۔

'یوں بھی خردافروزی کی لے ہمارے ہاں ہمیشہ مدہم ہی رہی ہے۔ ایسے میں سبطِ بھائی کے حوالے سے کسی تقریب کا انعقاد دراصل خردافروزی کی حکایت ہی کو عام کرنا ہے۔'

سیّد سبطِ حسن نے اپنی تصنیفات اور اپنی جدوجہد کے ذریعے یہ سمجھانے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ہاں ہمیشہ خردافروزی کی لے مدہم کیوں رہی ہے اور اس

ئے کو بلند کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے آج یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ روشن خیالی اور خرد افروزی کے لیے سبطِ حسن نے جو جدوجہد کی ہے اور کر رہے ہیں اس کا جائزہ لیا جائے اور یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس روشن خیالی کے جہاد کے ان منبعوں کو بھی تلاش کیا جائے جن سے سیّد سبطِ حسن نے کسبِ فیض کیا ہے اس طریقِ کار کے متعلق بھی گفتگو کی اجازت چاہوں گا جس کے ذریعے سیّد صاحب خرد افروزی کے جہاد کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر سیّد سبطِ حسن مارکسسٹ ہیں اور وہ روشن خیالی اور خرد افروزی کو مجرد شے نہیں سمجھتے کہ کسی معاشرے میں یہ خصائص اپنے طور پر پیدا ہو سکتے ہیں بلکہ سیّد سبطِ حسن اس امر کی بالاصرار صراحت کرتے ہیں کہ طبقاتی تضاد رکھنے والے معاشروں میں روشن خیالی اور خرد افروزی کا جہاد اس وقت تک کامیاب ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ معاشرتی اور طبقاتی تضاد ختم نہ ہوں، کیونکہ آج جس دور میں ہم روشن خیالی اور خرد افروزی پر گفتگو کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اس دور میں روشن خیالی اور خرد افروزی پر سب سے زیادہ قدغن حاکم طبقے کی طرف سے عائد کی جا رہی ہے اور یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ روشن خیالی اور خرد افروزی پر قدغنیں صرف ہم جیسے ایک پسماندہ ملک کا حاکم طبقہ ہی نہیں لگا رہا بلکہ خود مغرب کے ترقی یافتہ اور بظاہر روشن خیال اور خرد افروز معاشروں میں بھی توہم پرستی، زندگی سے فرار کے لیے منشیات پر انحصار، قتل و غارت، جرائم اور تو اور ہرے کرشنا اور ہندومت کی دیومالائی تحریکوں کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، یہ سب اس امر کی علامتیں ہیں کہ ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام جو ایک ڈیڑھ صدی پہلے روشن خیالی اور خرد افروزی کے سنگھاسن پر جلوہ افروز تھا، جو انسانی حقوق کا علمبردار تھا، جو جمہوری اقدار کا نقیب تصور ہوتا تھا، آج سامراج کی صورت میں وہ اپنے تمام دعوؤں کی نفی کر رہا ہے۔ آج وہ جمہوریت کی بجائے فوجی آمریتوں کا محافظ و نگران ہے۔ آج وہ انسانی حقوق کا حامی نہیں۔ بلکہ وہ خود اپنے ہاں انسانی حقوق کی نفی کر رہا ہے۔ کیا انسانی حقوق کے چارٹر میں نسل پرستی کا خاتمہ رقم نہیں ہے۔ لیکن آج کونسا مغربی معاشرہ ہے جو نسل پرستی سے مبرّا ہے، بلکہ مغرب اور امریکہ کی ہی حکومتیں ہیں جو جنوبی افریقہ اور اسرائیل جیسی نسل پرست حکومتوں کی محافظ اور مربی ہے۔

کیا انسانی حقوق کے چارٹر میں روٹی روزگار کی فراہمی کی ضمانت درج نہیں ہے۔ لیکن امریکہ جیسی ترقی یافتہ سوسائٹی میں بیروزگاری کی کیا شرح ہے؟ برطانیہ میں بیروزگاروں پر کیا بیت رہی ہے؟ مغربی جرمنی میں بے روزگار کس حال میں ہیں؟ کبھی ہم نے ان امور پر غور کیا اور دراصل یہی وہ

بنیادیں ہیں جن سے الرائیک طرف جاندار تحریکیں سماجی تبدیلیوں کا پرچم لے کر نہ اٹھیں تو پھر یہ بے سکونیاں اور بے اطمینانیاں توہم پرستی اور غیر سائنسی تحریکوں کو جنم دیتی ہیں اور ہم جیسے ملکوں میں تو صورتِ حال اور بھی بدتر ہوتی جاتی ہے اور پھر ہم سمندر میں تیر کر کربلائے معلیٰ پہنچنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور ہمیں تو خوابوں میں بیوی بچوں کو قربان کرنے کے احکام سنائی دینے لگتے ہیں اور یہیں سے پیچھے لوٹنے کی تحریکوں کو ہوا ملتی ہے۔ اور تمام دکھوں کا مداوا ماضی پرستی میں ڈھونڈا جانے لگتا ہے، جیسے ماضی میں واقعی آسمانوں سے ہر جگہ من وسلویٰ اترتے تھے اور ہر سوانسان چین کی بنسری بجاتا تھا۔ سوآج روشن خیالی اور خردافروزی کے خلاف جب مغرب جیسی ترقی یافتہ مملکتوں میں تحریکیں زور پکڑ رہی ہوں تو ہم جو غیر ترقی یافتہ اور پچھڑے ہوئے ملک ہیں، لیکن ان مغربی سرمایہ دارانہ اور سامراجی ممالک سے ہر سطح اور ہر لحاظ سے وابستہ ہیں، تو ہمارے ہاں جتنی بھی ذہنی پسماندگی کا اظہار ہو کم ہے، کیونکہ جیسے جیسے ہم جیسے پسماندہ معاشروں میں عدم استحکام کی صورت ہوگی، ویسے ہی اُن دیکھی قوتوں اور ٹونے ٹوٹکوں پر اعتقاد بڑھ جائے گا، کیونکہ پہلے ہمارے جیسے زرعی معاشرے کو شروع میں آفاتِ آسمانی سے محفوظ رہنے اور فصلوں کے لیے بارشوں کے واسطے آسمانوں کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ لیکن اب تو وزارتِ عظمیٰ جو کل تک انسانی اداروں اور سیاسی عمل کا منطقی نتیجہ تصور ہوتی تھی، آج اس کے لیے بھی آسمانوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے کہ آسمانوں سے اقتدار کی فاختہ کس کے سر پر آ بیٹھتی ہے۔ اب ایسے غیر یقینی ماحول میں انسانی جدوجہد سے زیادہ دعائیں، ٹوٹکے، پیروں فقیروں کی خوشامد اور مزاروں پر حاضری ہی مشکلیں آسان کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سامراج تیسری دنیا میں التزاماً عدم استحکام پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس لیے آج روشن خیالی اور خردافروزی کی تحریک کی کامیابی کے لیے سامراج کی شکست بنیادی شرط ہے اور اس کے لیے عوام کی منظم تحریک ضروری ہے اور یہی منظم جمہوری تحریک ہی کامیابی کی ضامن ہو سکتی ہے اس واسطے آج جب روشن خیالی اور خردافروزی کی حکایت کو عام کرنے کے لیے کوئی مجلس منعقد کی جائے تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ خاصا گنجلک عمل ہے اور ان سب عوامل کے ڈانڈے کوئی چاہے یا نہ چاہے سیاست کی وادیٔ خارزار سے جا ملتے ہیں۔ اور یہ جادو وہ ہے جو اب سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ چنانچہ آج خردافروزی کی حکایت عام کرنے کے لیے جو علامت چنی گئی جس سیّد سبطِ حسن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں وہ خود سیاست کی وادیٔ خارزار میں اپنے تلوے لہولہان کر چکے ہیں۔ اور ان کی

تمام معرکۃ الآرا تصانیف اسی سیاست کا ایک پہلو ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں سیاست کو بہت ہی محدود معنی پہنا دیئے گئے ہیں اور ہم نے سیاست کو جلسوں اور جلوسوں تک محدود کر دیا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایک خردافروز تحریر اور خیالوں کو روشن کرنے والی ایک کتاب ہزار جلسوں اور جلوسوں پر بھاری ثابت ہو سکتی ہے، اس سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ جلسے اور جلوس نہیں ہونے چاہئیں، یہ تو زندگی کی نشانیاں ہیں، اور آج خردافروزی کی تحریک ماند ہی اسی لیے ہے کہ کوئی جلسہ نہیں کوئی جلوس نہیں اور سیاسی عمل یک رُخا بنا دیا گیا ہے اس لیے ہمیں خردافروزی کی تحریک کو اس وسیع پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہیے کیونکہ خردافروزی کی تحریک ایک بے پایاں عوامی اور جمہوری تحریک سے جڑی ہوئی ہے اور یہ تحریک قومی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی، اور اس عالمی رشتے کو سمجھے بغیر جمہوریت اور روشن خیالی کی کوئی تحریک بھی بارآور نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تحریک ہشت پہلو ہے اور ہر پہلو سے سامراج اس تحریک پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج جو اسلحے کی دوڑ ہے اور فضا میں جنگ کی جو باتیں اور نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کی آپس میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جو ہو رہی ہیں ان سب کا منبع کیا ہے، یہی کہ اسلحہ کے تاجروں کی بن آئے اور ان کے منافع میں اضافہ ہو۔ لیکن یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اس تجارت کو قائم و دائم رکھنے کے لیے سرد جنگ کی فضا قائم رکھنا ضروری ہے، ایک ملک کو دوسرے ملک کا ہوا دکھانا ضروری ہے اور اس فضا میں اسلحہ کی دوڑ کا جواز ڈھونڈا جا سکتا ہے اور جب اسلحے کی دوڑ ہوگی تو پھر تیسری دنیا کے ممالک کے اکثر و بیشتر ذرائع ایک طرف فوجی تیاریوں اور اسلحے کی حصول کے لیے استعمال ہوں گے، اس مقصد کے لیے متحارب ممالک اسلحہ فراہم کرنے والے ممالک کے زیرِ نگر ہوں گے۔ دوسری طرف فوجی حکمرانوں اور فوجوں کو ممالک کی حفاظت کے نام پر تقدس حاصل ہو جائے گا۔ اس تقدس کو قائم رکھنے کے لیے غیر جمہوری دانشوروں کو کونوں کھدروں سے نکال کر ٹیلی ویژن کے سنگھاسن پر بٹھایا جائے گا اور ٹیلی ویژن سے علم کے خلاف، روشن خیالی کے خلاف مسلسل ڈرامے دکھائے جاتے رہیں گے اور نہایت ڈھٹائی سے جہالت کے حق میں پروپیگنڈہ ہوتا رہے گا۔ غربت کے حق میں فضا بنائی جاتی رہے گی اور اب تو ایک عالم دہائی دینے لگا ہے اور یہ فلسفہ تراشا گیا کہ جتنا کوئی عالم ہوگا اتنا ہی وہ خراب ہوگا اور جاہل اور غریب شخص بنیادی طور پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جمہوریت اور روشن خیالی کے خلاف جو طاقتیں مصروفِ کار ہیں ان میں صرف فوجی حاکم ہی نہیں بلکہ ان کے دوست و حلیف بھی

شامل ہیں جو نام نہاد قومی اسمبلیوں میں کرسی نشین ہیں، بلکہ وہ مولوی اور ملاّ بھی ہیں جو آمریت کے لیے تقدس اور دوام کا فلسفہ مہیا کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دور میں حاکم طبقوں کو اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مخصوص فلسفوں اور ان فلسفوں کے مبلغوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانشور درکار ہوتے ہیں اور حاکم طبقے ان دانشوروں کی بہبود کے نام پر ادارے بھی بنواتے ہیں۔ انعام بھی دیتے ہیں، ان کی تشہیر کا انتظام بھی کرتے ہیں لیکن ان سب کے ڈانڈے بالآخر سامراجی نظام سے جا ملتے ہیں اور آج ہمارے ہاں آزادی، جمہوریت، روشن خیالی اور خردافروزی کی تحریک ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی ہے کہ اگر یہ ناکام ہوگئی تو پھر ہم ایک طویل مدت کے لیے ملائی فسطائیت کے شکنجے میں جکڑے جائیں گے۔ سیّد سبطِ حسن نے اپنی تصنیفات میں اس امر کی طرف جگہ جگہ نشاندہی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ آج خرد دشمن طاقتیں بظاہر بڑی طاقت ور دکھائی دیتی ہیں لیکن خردافروزی کی شمعیں روشن کرنے والے بھی پسپا نہیں ہوئے اور ان کی طرف سے مزاحمتیں جاری ہیں اور یہ محفل، یہ مجلس اسی مزاحمت کی علامت اس لیے ہے کہ کراچی کے دانشور آج تعریف و تحسین کے مستحق ہیں، کہ آپ نے یہ محفل بپا کی۔ آپ نے خردافروزی اور روشن خیالی کی مہم کو سنجیدگی سے آگے بڑھانے کا اہتمام کیا، یہ کراچی جو ہماری سب سے بڑی بندرگاہ ہے جو ہمارا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے. جس شہر میں فلک بوس عمارتیں ہیں، جہاں ایک طرف دولت کی ریل پیل ہے تو دوسری طرف بے گھر انسانوں کا ایک ہجوم ہے جہاں لاکھوں مزدور اپنی روٹی اور روزگار کی جدوجہد میں مصروف ہیں، انہی تضادات نے کراچی کے دانشوروں پر بھاری ذمہ داری عائد کردی ہے اور اسی ذمہ داری کو آپ بہادری اور جرأت مندی سے نباہ رہے ہیں اور اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ اور آپ کا یہ شہر آزادی، جمہوریت اور روشن خیالی کے جہاد کو آگے بڑھا رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں بھی خرد دشمن طاقتیں موجود ہیں لیکن آپ کی مزاحمت کی طرف ایک عالم دیکھ رہا ہے اور آپ آج کی تاریکی میں بھی کسی نہ کسی پہلو اور کسی نہ کسی انداز سے عقل و دانش کے چراغ جلائے ہوئے ہیں، اس کے لیے میں آپ کو سلام کرتا ہوں اور اس جہدِ مسلسل کی ایک علامت سیّد سبطِ حسن کو بھی سلام کرتا ہوں جن کے لیے آپ نے اس محفل کا اہتمام کیا اور سیّد سبطِ حسن کے چاہنے والوں کو یکجا کیا۔

سبطے جی جگ جگ جیو۔

سیّد سبطِ حسن کی تاریخ نویسی

ڈاکٹر مبارک علی

مسلمان تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور جاہلیت، اور دوسرا اسلام کے بعد کا زمانہ، دور جاہلیت سے عام طور سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہ تاریخ کا وہ دور تھا کہ جس میں نہ تہذیب و تمدن تھا، نہ اخلاق وطرز معاشرت کا ارتقا ہوا تھا۔ نہ رسم و رواج میں شائستگی آئی تھی اور نہ ہی علم و ادب وفن میں کوئی ترقی ہوئی تھی۔ یہ زمانہ گمراہی اور وحشت و بربریت کا تھا۔ دور جاہلیت کے ان معنوں سے اس تمام نئی تحقیق کی نفی ہوتی ہے کہ جس کی روشنی میں قدیم تہذیبوں کے آثار کی دریافت کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ قدیم عہد میں دنیا کے ہر حصے میں مہذب و متمدن اقوام آباد تھیں۔ اور انہوں نے اپنے تخلیقی کارناموں سے انسان کی ترقی میں حصہ لیا۔ اس لیے اگر دور جاہلیت کے یہ معنی لیے جائیں کہ وہ زمانہ کہ جس پر ناواقفیت و گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا، اور جس کی معلومات ہماری دسترس سے دور تھیں، تو اس صورت میں تاریخ کا مفہوم واضح اور صاف ہو سکے گا مگر ہم تاریخ کے اس مفہوم کو قبول نہیں کرتے۔

دور جاہلیت کے تصور نے مسلمان معاشرے کے تاریخی شعور کو بڑا نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اگر اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کرلیا جائے کہ اسلام سے پہلے دنیا نے کوئی ترقی نہیں کی تھی، تو پھر ایک ایسے عہد کے مطالعہ کا کیا فائدہ رہے گا، جس میں اندھیرے اور تاریکی کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جس عہد کی روایات واقدار گمراہی کی وجہ سے انسانی ترقی وفلاح کے لیے قطعی مفید نہیں اور جس کے تمام علمی و ادبی کارنامے کافروں و مشرکوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لیے قدیم اقوام اور قدیم تہذیبوں کے بارے میں تحقیق و تجسس کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور ماضی کے لیے حقارت کا جذبہ

پیدا ہوتا ہے جو ہماری زندگی اور ذہنی ترقی میں ہمارے لیے کسی بھی طرح معاون نہیں ہوسکتا ہے۔

پھر مسلمانوں نے جن جن ملکوں کو فتح کیا۔ وہاں بھی انہوں نے تاریخ کو اسی نقطۂ نظر سے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ قبل از اسلام اور بعد از اسلام اور یہاں بھی اس مفروضہ کو فروغ دیا کہ اسلام سے قبل کی تاریخ لایعنی اور فضول ہے۔ اور مسلمانوں کے لیے تاریخ اس وقت اور اس مرحلہ سے شروع ہوتی ہے۔ جب کہ اسلام نے ان ملکوں کو فتح کیا اور ان کے قدیم نظام کو بدل کر جدید نظام لایا۔ اسلامی عہد کے بعد ہی سے لوگ گمراہی سے نکلے اور صراط مستقیم پر آئے۔ اس لیے اسلام سے قبل کی تاریخ دور جاہلیت ٹھہری جس کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے بیکار ہے۔ اس ذہن کا تسلسل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ اور اسی کے زیرِ اثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ پاکستان کی اصل تاریخ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اس خطہ میں جو کچھ ہوا وہ ہمارا تاریخی سرمایہ نہیں۔ اس لیے ہم اس کے وارث نہیں۔ بلکہ قدیم ماضی کی تاریخ سے لگاؤ اسلامی ذہن کو آلودہ کردے گا۔ اور اسلامی تشخص کی پاکیزگی اس سے اثر انداز ہوگی۔

تاریخ کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد مسلمان معاشرے کے لیے یونان، چین، ہندوستان اور روم کے علوم وفنون اور انکا، مایا اور ایزٹک تہذیبوں کے کارنامے لایعنی ہو جاتے ہیں۔ ان کی عظمت کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ گمراہ اقوام کے کارنامے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان ملکوں اور اقوام کی تاریخ کہ جہاں اسلام نہیں پہنچا وہ بھی ہمارے لیے قابل قبول نہیں رہتی۔ اس زمرے میں یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرق بعید کے ملک آجاتے ہیں۔

کچھ مسلمان مؤرخوں نے اس دشواری سے نکلنے کی کوشش ضرور کی مگر ان کی یہ کوششیں بحیثیت مجموعی مسلمان معاشرے کے ذہن کو بدل نہیں سکیں۔ مثلاً معتزلہ تحریک کے زیر اثر جو عقلی رجحانات پیدا ہوئے اس کا اطلاق تاریخ پر بھی کیا گیا۔ جس میں المسعودی کا بھی ذکر ہے۔ مگر یہ تحریک جلد ہی العشریوں کی عقل دشمنی کی نذر ہوگئی۔

اس لیے اکثر مسلمان مؤرخ اس شدید کشمکش میں رہے کہ اسلام سے پہلے کے شاندار زمانہ کو کس طرح سے بیان کیا جائے۔ ابن مسکویہ نے اس کا یہ حل نکالا کہ چونکہ پیغمبروں کی تاریخ انسانی فہم سے بالاتر ہے لہٰذا صرف اس تاریخ کو بیان کرنا چاہیے، جو انسانی تجربات پر مبنی ہو۔ اس صورت میں اس پر تنقید ہوسکتی تھی، اور اس کا تجزیہ کیا جاسکتا تھا۔ اس نظریہ کے تحت اس نے

'تجارت الامم' لکھی۔ ابن خلدون نے بھی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے مابعد الطبعیاتی یا روحانی تاریخ کو علیحدہ کر دیا۔ اور انسانی تجربوں کی روشنی میں تاریخ کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اسی لیے یہ کہا کہ معاشرے کے بغیر بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ اور اعلیٰ تمدن پیدا کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ تحریریں مسلمان معاشرے کے اس ذہن کو تبدیل نہیں کر سکیں جو اسلام سے پہلے کے زمانہ کو دور جاہلیت قرار دیتی ہیں۔ تاریخ کے اس نظریہ نے مسلمان معاشرے کے تاریخی شعور کو سمیٹ کر ایک تنگ خول میں بند کر دیا۔ اور ان میں وہ وسعت نہیں رہی کہ وہ قدیم اقوام کے کارناموں اور قدیم تہذیبوں و تمدنوں کے ارتقا اور فروغ کو سمجھ سکیں اور تاریخ کے اس عمل سے واقف ہو سکیں کہ یہ ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے کہ جس کو بیچ میں تقسیم کر کے اگر اس کے بہاؤ کو روک دیا گیا تو دوسرا حصہ خشک و بنجر ہو جائے گا۔

موجودہ دور میں ماضی پر جو تحقیق ہوئی ہے، اس نے قدیم ماضی کو بڑی حد تک تشکیل کر دیا ہے۔ سمیری، مصری، ہندوستانی، انکا، مایا، ایزٹک، چینی، یونانی اور رومی تہذیبوں کے علمی و ادبی اور سائنسی و فنی کارنامے، قدیم آثاروں کی دریافت، اور نئے نئے مسودوں کی اشاعت کے بعد منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور یہ شواہد قدیم تہذیبوں کی عظمت، گہرائی اور بلندی کا ثبوت ہیں اس لیے تاریخ کی آگہی اس وقت پختہ ہو سکتی ہے جب کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے ذریعہ انسانی تہذیب و تمدن، ثقافت اور انسانی ذہن کے ارتقا کو سمجھا جائے۔

اس لیے جو مؤرخ پاکستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم سے شروع کرنا چاہتے ہیں اور قدیم تاریخ کو بیکار اور لاحاصل سمجھ کر اس کے مطالعہ و تحقیق سے روکنا چاہتے ہیں، وہ معاشرے کے تاریخی شعور کو پسماندہ اور کمتر رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس خطہ کی تاریخ ہزارہا برس سے وجود میں آ چکی تھی، اور جب تک ہم اس تہذیب کی جڑوں تک نہیں پہنچیں گے، اس تہذیب کے ارتقا کے مرحلوں کو دریافت نہیں کرینگے، اس کے پس منظر میں باعمل ذہن کو نہیں سمجھیں گے، اس وقت تک ہم اپنی شخصیت کو مکمل نہیں کر پائیں گے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بکھرے ہوئے آثار قدیمہ کی دریافت کی جائے اور اس پوشیدہ عظمت کو گمنامی سے باہر لایا جائے جو زمین میں مدفون ہے۔ قدیم ماضی سے لے کر دور جدید تک انسانی تہذیب کے اس سفر کی کہانی جب تک تشکیل نہیں ہوگی۔ اس وقت تک ہم اپنے ذہن کو پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اسلام کی فتح بھی

اس تاریخی عمل کا ایک حصہ ہے۔ اور اس علاقہ کی تاریخ کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ اس حیثیت سے اسلام کی اس علاقہ میں آمد ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اس کی یہ اہمیت بھی اسی وقت اجاگر ہوگی جب ہم اس کے پس منظر سے بخوبی واقف ہوں گے۔

سبط حسن نے تاریخ کی تین کتابوں میں یہ کام سرانجام دیا۔ 'ماضی کے مزار'، 'موسیٰ سے مارکس تک' اور پاکستان میں 'تہذیب کا ارتقا' ان کتابوں میں انہوں نے تاریخ کو ایک تسلسل اور بہاؤ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور ماضی میں ہونے والے انسانی کارناموں کو چاہے وہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے ہاں انسانی تاریخ، انسانی تہذیب و تمدن کا بیان ہے جس سے انسانی عظمت و بڑائی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس لیے ان کتابوں کے مطالعہ سے تاریخ کا وسیع اور پھیلا ہوا لامحدود نظریہ تشکیل پاتا ہے جو ذہن کو تنگ نظری، تعصب و نفرت سے نکال کر اس میں یہ جستجو پیدا کرتا ہے کہ قدیم اقوام اور ان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرے اور ان سے سیکھے۔ قدیم ماضی کا مطالعہ گہرا اور پختہ تاریخی شعور پیدا کرتا ہے، جو ہمارے حال کی تشکیل میں ہماری مدد کرتا ہے۔

روشن خیالی کی روایت اور ادب

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ہم جس دور میں زندہ ہیں وہ بہت بڑی تبدیلیوں کو جنم دے رہا ہے۔ صنعتی دور اور اس دور سے قبل کی تبدیلیوں میں واضح فرق ہے۔ صنعتی دور کی تبدیلیاں سائنسی بنیاد پر قائم ٹیکنالوجی کی ترقیوں سے عبارت ہیں۔ ان تبدیلیوں نے انسانی ذہن کی جس انداز میں طنابیں کھینچی ہیں وہ نہ صرف ترقی یافتہ ممالک کے لیے محیر العقول ہیں بلکہ ان سے ہمارے یہاں ایشیائی سماج میں جگہ جگہ تبدیلیوں نے قدم جما لیے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں سائنس ابھی تک محض خبر ہے یا قابل حصول ٹیکنالوجی۔ لیکن سائنسی فکر کے حامل معاشرہ کی حقیقی روشن خیالی ہم سے تا حال روٹھی ہوئی ہے۔ عالمی ادب میں روشن خیالی کی تحریک حقیقتاً اس دور سے شروع ہوئی جب سے معیشت، تاریخ اور سماجیات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا گیا۔ روشن خیالی بذاتِ خود اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ دو متحرک طاقتوں کی کشمکش کے نتیجے میں ایک تیسری صورت کا ظہور لازمی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے دو بڑے انقلابات، فرانسیسی انقلاب، اور امریکی انقلاب روشن خیالی اور روشن خیال ادب کے اولین ثمرات تھے۔ روشن خیالی نام ہے ایک دور کے (Synthesis) کے بعد کے دور کے (Thesis) کے قبول کرنے کا۔ روشن خیالی نام ہے اپنے آبا کے انتہائی دلپسند تصورات، تہذیبی رویوں اور انفرادی میلانات کو مستقل بنیاد پر درست کرتے رہنے کی ذہنی آمادگی کا۔

آرٹ اور روشن خیالی کے مابین فکری تعلق ضرور ہے۔ لیکن جب کبھی اس فکری تعلق کو کسی خاص (Form) یا (Style) کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی، اس وقت ایک بے جا تصادم کی راہ ہموار

کر دی جاتی ہے۔ جب ارسطو نے یہ کہا تھا کہ:

'آرٹسٹ انسانی زندگی کی عکاسی کرتا ہے تاکہ وہ انسان کی باطنی زندگی تک پہنچ سکے۔'

تو یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس طرح فنکار کی تحدید ہو گئی اور فنکار کو صرف انسانی زندگی تک محدود کر دیا گیا، جب کہ اس کا دائرہ کائنات تک وسیع کیا جا سکتا ہے۔

میں اس مضمون میں مختصراً اس خلیج کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو سائنسی فکر کے وکیلوں اور فنون کی خودمختاری کے وکلا کے درمیان پیدا ہوئی۔ روشن خیالی کا بنیادی تعلق بدلتے ہوئے تجربی حقائق (Empirical Data) کا ساتھ دینے اور اس (Data) کی بنیاد پر سائنسی حقائق کو قبول کرنے کا وطیرہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان کے بارے میں کسی من مانے مفروضات پر مبنی فکری رویہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مفروضات کو سائنسی نظریات کی شکل دینے کی ایک ایسی اہم جستجو کا نام ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں حاوی ہے۔ روشن خیالی کے پس منظر میں تحریر ہونے والا ادب علم سے حقیقی لگاؤ کے سبب آزادی اور ذمہ داری کے فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ روشن خیالی انسانی ذہن کو ناروا جکڑ بندیوں سے رہائی دلانے کا نام ہے۔ اور فن اپنی بساط حسیت (Sensibility) تمثال سازی (Image-making) کی صلاحیت پر بچھاتا ہے ترقی پسند ادب روشن خیالی کی تحریک ہی کا تحفہ ہے۔ اس ادب نے ادب کے حقیقت پسندانہ کردار کی جانب توجہ دلائی اور یہ یقین دلایا کہ قارئین نہ صرف انسانی زندگی کے جملہ نشیب و فراز کے مطالعہ کا حوصلہ رکھتے ہیں بلکہ وہ اشرافیہ کی مصنوعی اقدار کے بجائے زندگی کی صحیح عکاسی اور زندگی کا صحیح عرفان چاہتے ہیں۔ زندگی جیسی بھی ہے وہ پوری ایمانداری کے ساتھ ہماری توجہ چاہتی ہے۔ ادب میں روشن خیالی کی تحریک موضوع کی جانب سے معروض کی اصلیت تک ہے اور رسائی کی دعویدار بھی۔ یہ (Sense Data) کو متجسم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ مواد کو ایک ایسی (Form) دینا چاہتی ہے جو اُسے زمان و مکان کی قید سے آزاد کرنے کے بعد بھی ہم عصری حقیقتوں ترجمان بنائے۔ ایک فن پارہ بیک وقت متضاد جذبات کی عکاسی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فنکار اپنے دور کی روشن خیالی کی تحریک کا ہمنوا بھی ہو سکتا ہے اور مخالف بھی۔ اگر وہ ہمنوا ہے تو پھر وہ (form) اور مواد کے مابین خلیج پر بہت زیادہ زور نہیں دے گا کیونکہ فن اپنے دور کی روشن خیالی کی واحد اور مکمل صورت ہونے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔

فنکار حقیقت کے بیان میں بعض اوقات اس قدر کھو جاتا ہے کہ وہ حقیقت کے ایسے روپ بھی دیکھ لیتا ہے جو عام قارئین پر اپنی کلی شکل میں عیاں نہیں ہو پاتے۔ ادیب اور ماہر معاشیات اور مؤرخ کے کام میں بہرحال ایک واضح فرق موجود ہے۔ یہ فرق روشن خیالی کا نہیں ہے بلکہ (Imagination) کا ہے۔

یہاں میں یہ عرض کرونگا کہ ادب اور روشن خیالی کے درمیان ایک واضح تعلق ہے روشن خیالی ایک (Spiral) صورت حال ہے۔ یہ لمحۂ موجود کے بعد لمحۂ آئندہ کے درمیان ہونے والی صورت حال کا قیاس بھی کر سکتی ہے اور اس کے (Essence) پر حکم بھی لگا سکتی ہے۔ ادب زندگی کی عکاسی کے نام پر بعض اوقات فطرت کے بہت طویل اور پیچ در پیچ عمل کو مصور کے موئے قلم کی حرکت، موسیقار کی جنبش انگشت، اور سنگ تراش کی انی کی ذرا سی حرکت سے مقید کر سکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ فنکار فنون کے ذریعے فطرت سے کہیں زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ آج کے دور کا فن روشن خیالی کی تحریک کے ذریعے انسانی صورتِ حال اور کائناتی صداقتوں کی تہہ میں جانے کے لیے ایک قسم کا (Lyricism) ہے جبکہ روشن خیالی بذاتِ خود اس صاف اور شفاف ہوا سے مشابہہ ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہو پاتی۔ روشن خیالی درحقیقت کثافتِ ماحول پر قابو پانے کے انداز میں فکری کثافتوں کو دور کرتے رہنے کا ایک عمل ہے۔ جن سماجوں میں روشن خیالی کے راستے مسدود کر دیئے جاتے ہیں وہ سماج غیر فطری طور پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب یقیناً روشن خیالی کی فضا عام کرنے کے لیے ایک مؤثر آلہ ہے۔ یہ صرف ماضی کی دریافتِ نو، حال کی تشکیلِ نو اور مستقبل کی تعمیر کے اہم کام کے لیے سماج کے (Sense Data) کو جاننے اور پرکھنے کا عمل ہے۔ ہم کسی بھی دور کے ادب کے آئینے میں اس دور کی روشن خیالی کی سطح کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر دور کے اپنے اپنے رازی ہیں اور اپنے اپنے غزالی ہیں، اپنے اپنے غالب ہیں اور اپنے اپنے ذوق ہیں، اپنے اپنے اقبال ہیں اور اپنے اپنے امام دینا (امام دین) ہیں۔ روشن خیالی بذاتِ خود ایک جدلیاتی تصور پیش کرتی ہے، ہر دور کی رجعت پسندی اپنے دور کی بغاوت اور روایت کو جنم دیتی ہے اور پھر ایک سمجھوتہ وجود میں آجاتا ہے۔ جب کارڈینل نیومین آکسفورڈ موومنٹ کے پلیٹ فارم سے تبدیلی اور تغیر کے پرجوش وکیل کی صورت میں سامنے آئے، انہوں

نے 'روایت' اور 'جدیدیت' کی بحث میں بھی عملی طور پر روایت پسندوں کا ساتھ دیا تھا۔ وہ سائنس اور روشن خیالی کے خلاف اِس درجہ سرگرم عمل تھے کہ اس زمانے کے ایک شاعر نے یہ کہا تھا کہ:

'اگر چرچ کے شدت پسند اور تنگ نظر علماء کا یہی وطیرہ رہا تو کہیں برف سے شعلے نہ نکلنے لگیں۔'

یہ شاعرانہ محاکمہ کسی علت و معلول کے نظام کو نہیں مانتا لیکن اس دور کی پرآشوب اور فکری صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لیے بہت بلیغ اشارہ ہے۔ اگر (Oxford Movement) شدت پسندی کا مظاہرہ نہ کرتی تو برطانیہ کی سیکولر حکومت ابھرنے کے لیے بہت عرصہ درکار ہوتا لیکن یہ بات بھی روشن خیالی کے حق میں جاتی ہے کہ روشن خیالی کی تحریک دبانے سے نہیں دبتی بلکہ یہ مزید اُبھرتی ہے اور طاقتور بنتی چلی جاتی ہے۔

ہمارے یہاں پائی جانے والی عقل دشمنی (Anti Intellectualism) کا خالص پہلو یہ ہے کہ یہ جمہوریت دشمن، سائنس دشمن اور ترقی دشمن ہے اور اس کے وکلاء نے اپنی بات کہنے کا جوڑ ھنگ نکالا ہے وہ انتہائی دقیانوسی ہے اور اب تک کی فکری ترقی کی نفی کرتا ہے۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ بعض ترقی پسند ادیبوں نے بھی اس (Anti Intellectualism) کا ساتھ دیا ہے۔ اس رجعت پسندی کے باب میں خاموشی بھی بہت نقصان دہ ہے۔ ہمارے نام نہاد دارالعلوموں کے نصاب کے مطابق زمین ابھی تک چپٹی ہے اور غیر متحرک بھی۔ ہمارے یہاں زمینداری، جاگیرداری، اور قبائلی نظام کی بدترین خصوصیات موجود ہیں اور سچ پوچھیں تو ہمارے یہاں کا سربرآوردہ طبقہ ایک لحاظ سے اپنے آباء سے بھی زیادہ ترقی دشمن ہے۔ وہ علم اور روشنی کے موجودہ دور میں بھی جس میں جگہ جگہ انسان کی ترقی کے کرشموں کے جیتے جاگتے نمونے دعوتِ فکر دیتے ملتے ہیں، واضح طور پر فرسودہ روایات کی نگہبانی کے لیے خم ٹھونکے کھڑا ہے اور اپنے اندھیروں کو علم کے اجالوں سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ انہوں نے اس نکتہ پر بے پناہ زور دیا کہ سائنسی بصیرت، سائنسی (Methodology) ہی کے ذریعے بارآور ہو سکتی ہے اور یہ ایک باقاعدہ بلیو پرنٹ (Paradigm) کی صورت لیے ہوئے ہے۔

ہماری روایتی اقدار کا پیراڈائم (Paradigm) سائنسی نظامِ حیات کے پیراڈائم (Paradigm) سے اس درجہ متصادم ہے کہ اگر ہم نے ان دونوں (Paradigm) کو ایک

دوسرے کے ساتھ خلط ملط کیا یا انہیں ایک دوسرے سے متصادم کرنے کی ٹھانی تو اس صورتِ حال سے صرف معاشی پسماندگی اور سیاسی آمریت ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ آج کی تیسری دنیا میں شامل اسلامی ممالک کی غالب اکثریت جس خلفشار کا شکار ہے وہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ ان ممالک میں علم دشمنی، جمہور دشمنی اور سائنس دشمنی کا راج ہے۔ اس صورت حال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روشن خیالی نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ اسلامی ممالک کی اکثریت میں 'کفر' کا درجہ رکھتی ہے۔ ان ممالک کے مذہبی اکابر ہر قسم کی پسماندگی کی جڑیں دینی اقدار سے انحراف میں ڈھونڈتے آئے ہیں۔ اور یہ سادہ سی حقیقت بھی باور کرنا نہیں چاہتے کہ پسماندگی کی بنیادی وجہ سماجی و معاشی مساوات، جمہوریت اور عدل کے فقدان کے علاوہ سائنس اور سائنسی فکر سے شعوری طور پر انحراف ہے۔ اس بالادست اشرافیہ نے مغربی ٹیکنالوجی کا صارف بننے میں تو بہت بھاگ دوڑ دکھائی ہے لیکن اس ٹیکنالوجی کے پس پشت اس فلسفہ سائنس کو مسترد کر دیا ہے جس کی مدد سے صنعتی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے سامنے مشرقی یورپی ممالک کے علاوہ بدھ اور شنتو مذہب کے ماننے والے بعض ایشیائی ممالک کی حیرت انگیز ترقی کا ریکارڈ موجود ہے۔ ہم ان ممالک کی ترقی کی تعریفیں ضرور کرتے ہیں اور ان ممالک کے ایشیائی ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ ان ممالک کی ترقی سائنسی (Paradigms) کے حق میں ووٹ دے کر ہی ممکن ہو پائی ہے، لیکن ان ممالک کے لوگ خواہ وہ نجی طور پر کسی بھی مذہبی عقیدے یا روایتی اقدار کے لیے گوشۂ رعایت رکھتے ہوں، لیکن اک بات بہر طور واضح ہے کہ یہ ممالک اپنی سوچ اور اپنی منصوبہ بندی میں سائنسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ جب کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ بہر حال بات یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ روشن خیالی کی ایک اپنی منطق ہے اس کا اپنا ایک مخصوص طریقۂ افزائش ہے۔ ہر ملک کی بالادست اشرافیہ نے روشن خیالی کے قافلے کو روکنے کے لیے بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں لیکن روشن خیالی اور رجعت پسندی کے مابین لڑی جانے والی ہر جنگ کا فیصلہ روشن خیالی ہی کے حق میں ہوا ہے، ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔

ہمارے یہاں روشن خیالی کے لیے لڑی جانے والی جنگ کے آثار ہر دور میں نظر آتے ہیں۔ لیکن نو آبادیاتی دور میں مغربی علوم بطورِ خاص سائنس کے خلاف جس تنگ نظری کا مظاہرہ کیا گیا اس سے پہلی بار ظاہر ہوا کہ ہمارے علماء نے ہمیں سائنسی علوم کے حصول سے بھی محض اس لیے منع

کیا کہ ان علوم کی باگ دوڑ مغرب کے ہاتھ میں تھی۔ عقل دشمن نضائیت کے بارے میں مخاصمت کا رویہ سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ روشن خیالی کی تحریک کا جہاں یہ فرض ہے کہ وہ سائنسی بصیرت کو عام کرے، وہاں یہ فرض بھی ہے کہ وہ مذہب کی اصل روح اور باطل روپ کے مابین ایک حدِ فاصل قائم کرنے کی کوشش کرے۔

روشن خیالی جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ ایک سائنسی رویہ ہے، یہ رویہ صرف زمانۂ حال اور زمانۂ مستقبل ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ ہمیں ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کیلئے سائنسی پس منظر مہیا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا ہمارے دور میں سب سے زیادہ بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے روشن خیالی کی عالمی تحریک کے ساتھ خود کو ہم رشتہ کیا اور اپنے پسے ہوئے اور کچلے ہوئے عوام کے ساتھ ایک ایسا رشتۂ محبت استوار کرنے میں مدد دی جس سے ایک ایسے انسانی سماج کی داغ بیل ڈالنے کے خواب عام ہونے لگے جو شرفِ انسانیت کو سماجی تنظیم کی شرطِ اول قرار دیتا ہے۔ یوں تو ترقی پسند تحریک کے دانشوروں نے اپنی بساط برابر روشن خیالی کے بڑے آدرش کو عام کیا۔ اسی تحریک کے بڑے اور بنیادی ناموں میں سے ایک نام سبطِ حسن کا نام ہے۔

سبطِ حسن نے نہ تو شاعری کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور نہ (Fiction) اور تنقید کو بلکہ انہوں نے صحیح معنوں میں روشن خیالی کے نظریے کو عام کرنے میں اور اس نظریے کو سماجیات، تاریخ، معیشت، سیاست اور ادب پر منطبق کرنے کے لیے ایک بنیادی اور مہتم بالشان کام کیا ہے۔ جب کبھی ہماری آئندہ نسلیں زیادہ بہتر یا مثالی معاشرے میں زندگی بسر کر رہی ہوں گی تو ان کے مثالی معاشرے کے اہم معماروں میں سبطِ حسن کا نام بھی شامل ہوگا۔ وہ ہم سے گزشتہ سال ہی جدا ہوئے ہیں لیکن وہ اس طرح جدا نہیں ہوئے کہ صرف اپنے اہل خاندان کی یادوں میں بس کر رہ گئے ہوں بلکہ وہ اب برصغیر کی فکری تاریخ کا ایک ایسا مینارۂ روشنی بن چکے ہیں کہ جس بستی میں ان کی کتابیں جاتی ہیں وہاں سے اندھیرا بھاگنے لگتا ہے۔ اندھیرا پہلے اس بستی کے حاشیوں پر کھڑا قہقہے مار رہا ہوتا ہے اور پھر یوں ہوتا ہے کہ سبطِ حسن کے مطبوعہ خیالات 'گفتانات' کی صورت میں آگے بڑھتے ہیں اور اندھیرا پیچھے چلا جاتا ہے۔ یہ عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔

سبطِ حسن ایک بہت اہم سماجی فلسفی تھے۔ سبطِ حسن نے ہمارے خطے کی روشن خیالی کی تحریک کو بین الاقوامی تحریک سے جوڑنے کے لیے بنیادی نوعیت کا کام کیا۔ میں اس مضمون میں عمداً اُن کی

بیش بہا کتابوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ یہ پہلو ایک مختلف مضمون کا متقاضی ہے۔ سبطِ حسن نے ترقی پسند ادب کے لیے درکار صحیح ترقی پسند (Ethos) کے قیام کے لیے انتھک جدوجہد کی ہے۔ آج برصغیر میں روشن خیالی کا قافلہ تیسری دنیا کے دوسرے علاقوں کے قافلوں کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہو چکا ہے۔ افریقہ میں بھی نوآبادیاتی دور کے قافلے کے بعد موہوم آزادی کے دور کے تلخ تجربات کے خلاف زبردست ردِعمل پایا جاتا ہے۔ غیروں کی غلامی کے بعد اپنوں کی غلامی کے خلاف غم وغصہ کی لہر ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور سپر پاورز کی چیرہ دستیوں کے خلاف احساسِ بغاوت عام ہو چلا ہے۔ تیسری دنیا کے سماج حقیقی آزادی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور ان کی راہ میں حکمران طبقات اور ان کے بیرونی آقا کچھ اس طرح مزاحم ہیں کہ وہ اپنی مزاحمت کو بھی دیسی ثقافت کی طرف واپسی یا بنیاد پرستی کا نام دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کے بیشتر سماجوں کے بالادست طبقے فسطائیت کے فروغ میں کوشاں ہیں۔ اور فسطائیت کو ثقافتی اور مذہبی طور پر مانوس حوالوں کے نت نئے ناموں سے پکارتے ہیں۔ یہ طبقے روشن خیالی کے قافلوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان ممالک کے ترقی پسند ادیبوں اور مفکروں کی تحریروں سے بہت کم واقف ہو پاتے ہیں بلکہ ہم تیسری دنیا کے ادب کے لیے سابق نوآبادیاتی آقاؤں کے ادبی مراکز کی طرف دیکھتے ہیں اور اس طرح صرف انہی ادیبوں کا ادب سامنے آپاتا ہے جو مغربی تعصبات کی چھلنی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ عالمی روشن خیالی کی تحریک صحیح معنوں میں اپنی فکر کی قوت اور صداقت پر اعتماد کا نام ہے۔ یہ سائنس ٹیکنالوجی اور علاقائی بصیرتوں کی تقسیم کے خلاف ہے۔ یہ تعصبات سے اٹی ہوئی دنیا میں تعصبات سے گلوخلاصی کا نام ہے۔ یہ صرف ایک تعصب کے سوا ہر تعصب کے خلاف سینہ سپر ہونے کا نام ہے۔ صرف ایک تعصب ہی ضروری ہے اور وہ ہے عدل وانصاف کا تعصب، امن وآشتی کا تعصب انسانی میراث پر یکساں حق کا تعصب اور ہر قسم کی پسماندگی کے خلاف تعصب۔

روشن خیالی کے حق میں چلنے والی مہم انسانیت کے حق میں چلنے والی سب سے بڑی مہم ہے اور ہم اس مہم کے ایک بڑے رہنما سبطِ حسن کی تحریروں سے ایک ہی تاثر لے کر اٹھتے ہیں کہ روشن خیالی کس قدر خوبصورت جذبہ ہے۔ روشن خیالی واقعتاً انسان پر انسان کے اعتماد کے ساتھ سائنسی بصیرت پہ ایک ایسے غیر متزلزل ایمان کا نام ہے جو حسن، خیر، عدل اور مساوات کے ستونوں پہ قائم

ہے۔روشن خیالی فرسودہ اور دقیانوسی نظریات کے بطلان کا نام ہے۔ایک دور کا زندہ سچ ہے،روشن خیالی اپنے دامن میں کسی باطل اور فرسودہ خیال کے لیے گنجائش نہیں رکھتی،یہ ماضی کی صداقتوں کو مخصوص زمان و مکاں کے حوالے سے تسلیم کرتی ہے لیکن ماضی کے سچ کو اس وقت تک سچ تسلیم نہیں کرتی جب تک وہ آج کا سچ ثابت نہ ہو چکا ہو۔

یہ درحقیقت جدلیاتی فکر کی بالادستی کی فطری خواہش کا نام ہے۔سبط حسن نے روشن خیالی کے قافلہ کی جس جرأت مندانہ انداز میں رہنمائی کی وہ ہماری فکری تاریخ کا ایک بہت روشن باب ہے۔اور اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں ہمیں اس اعترافِ حقیقت کا زیادہ واضح طور پر اعلان کرنا چاہیے۔

سبطِ حسن کے لیے ایک حرفِ سپاس

پروفیسر سحر انصاری

اہلِ دکن کے لیے مخدوم محی الدین کی شاعری، شخصیت اور نظریاتی زندگی ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے۔ وہ افراد بھی جنھیں مخدوم کے نظریات سے اختلاف تھا اس انتظار میں رہتے تھے کہ مخدوم کا کوئی تازہ کلام تخلیق ہوا ہو تو کسی طرح ان تک پہنچ جائے۔ پھر اس وقت یک گونہ مسرت کی لہر دوڑ گئی جب مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ 'سرخ سویرا' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ایک خط نما دیباچہ تھا جو سبطِ حسن کا تحریر کیا ہوا تھا۔ اس طرح پہلی بار سبطِ حسن کے نام اور کسی تحریر سے آگاہی ہوئی۔ اس خط نما دیباچے میں سبطِ حسن نے مخدوم کی شاعری کا تجزیہ اس رُخ سے کیا تھا کہ ان کی نوجوانی کے جذباتی دور کے ساتھ ساتھ مخدوم کی نظریاتی شاعری کے کئی زاویے اجاگر ہوئے اور ان نظموں کی ایمائیت سے پردہ اٹھا جو اس وقت تک روایتی اندازِ سخن کے حصار میں مقید تھی اور جس سے باہر نکل کر اس وقت کے ترقی پسند شعرا اپنے نئے رنگ و آہنگ کا اعتبار قائم کر رہے تھے۔

اس وقت کے حیدرآباد کے بارے میں سبطِ حسن نے 'شہرِ نگاراں' کے عنوان سے ایک مختصر لیکن دلچسپ کتاب تحریر کی تھی۔ جسے مرزا ظفر الحسن نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں حیدرآباد کی تہذیب، اس کے علمی ادبی ماحول اور بعض اہم شخصیات کا بڑی خوب صورتی سے تعارف کرایا گیا ہے۔ جن میں سروجنی نائیڈو، مخدوم اور راج بہادر گوڑ کے نام بطورِ خاص اہم ہیں۔ دراصل حیدرآباد ہر اہم ریاست کی طرح شاہی اور عوامی دائروں میں منقسم تھا۔ شاہی دائرہ تو سبھی پر اظہر من الشمس تھا لیکن عوامی دائرے کا سبطِ حسن نے جس ژرف نگاہی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ ہر اعتبار

سے جامع اور بصیرت افروز ہے:

> 'حیدر آباد بہ ظاہر برطانوی ہند سے الگ تھلگ ایک بستی تھی، لیکن اس بستی کے باشندے بیرونی ملکوں کے حالات سے قدرتی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ حبشہ پر مسولینی کا حملہ، بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تخت سے دست برداری، ہسپانوی خانہ جنگی، آسٹریا اور چیکوسلواکیہ پر ہٹلر کا قبضہ، ایسے حادثات تھے جن کے عواقب ونتائج سے حیدر آباد کے نوجوان دانشور اور طالبِ علم بہ خوبی آگاہ تھے اور فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرات کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔'[۱۱]

ایک زمانے میں پاکستان کے بعض غیر ترقی پسند افراد سبطِ حسن پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ انھوں نے کمیونسٹ مینی فیسٹو کے اردو ترجمے کے سوا لکھا ہی کیا ہے، لیکن ہفت روزہ 'لیل ونہار' کی اشاعت اور اس میں سبطِ حسن کی شمولیت نے جیسے ان کی فکر و عمل کے رکے ہوئے دھاروں کو ایک سیلابی رخ دے دیا۔

لاہور سے کراچی آنے کے بعد سبطِ حسن کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) 'شہرِ نگاراں'، (۲) 'ماضی کے مزار'، (۳) 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، (۴) 'موسیٰ سے مارکس تک'، (۵) 'انقلابِ ایران'، (۶) 'نویدِ فکر' اور (۷) Battle of Ideas in Pakistan

سبطِ حسن کے انتقال کے بعد یہ کتابیں منظرِ عام پر آئیں:

(۱) 'سخن در سخن'، (۲) 'افکارِ تازہ' (مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد)، (۳) 'ادب اور روشن خیالی' (مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد)، (۴) 'مغنّیِ آتش نفس، سجاد ظہیر' (ترتیب وتدوین ڈاکٹر سید جعفر احمد)، (۵) 'مارکس اور مشرق' (مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد)، (۶) 'ادیب اور سماجی عمل' (ترتیب وتدوین: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد) اور (۷) 'پاکستان کے تہذیبی وسیاسی مسائل' ('لیل ونہار' کے اداریے، ترتیب وتعارف: احمد سلیم)

سبطِ حسن کی ان تمام کتابوں کو اس عہد کی لازوال تحریروں میں شمار کرنا چاہیے۔ اس کا ایک سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی ان تصانیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ عمل برابر

جاری ہے۔ نظریاتی اسلوبِ بیان، فکریاتی پس منظر اور تحقیقی منہاج کے اعتبار سے کسی کتاب کو کسی دوسری کتاب پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ تمام تصانیف میں سبطِ حسن کا تاریخی و سماجی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی عبارت، صاف، شستہ اور رواں دواں ہوتی ہے۔ جس میں موضوعات کے تنوع کے باوجود کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔

سبطِ حسن نے ایک سے زائد جگہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اردو نثر میں شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور قاضی عبدالغفار سے متاثر ہیں۔ حال آں کہ ارضِ دکن میں سبطِ حسن کو مدعو کرنے والی شخصیت مولوی عبدالحق کی تھی جن کا اپنا اسلوب بھی لائقِ تقلید تھا۔ لیکن مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سبطِ حسن کی ظاہری اور باطنی شخصیت میں جو حسن تھا اور جس نے انھیں جمالیاتی زاویوں کا شناور بھی بنا دیا تھا ایسی ہی نثر پسند اور لکھ سکتے تھے جس میں افادیت اور مقصدیت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پرتو بھی عبارت کا حصہ رہے۔

میرے نزدیک سبطِ حسن نئی نسل کے معنوی استاد اور نظریاتی گرو ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جو اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے وہ ایک نظریاتی معلّم ہی کا ہو سکتا ہے۔ ایسا معلّم جو ادق سے ادق اور مشکل سے مشکل موضوعات کو سادہ لیکن ایک خاص سطح اور معیار کے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ سبطِ حسن کی تحریروں کا مطالعہ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ وسیع اور ہمہ جہت مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں تمام مباحث بہت واضح اور روشن ہو جاتے ہیں اور ان کے بیان میں وہ گنجلک عبارت یا اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں نہیں پڑتے۔ یہی سبب ہے کہ سبطِ حسن کی کتابیں شہروں کے علاوہ دور افتادہ دیہی اور قبائلی علاقوں میں بھی مقبول ہیں۔ سبطِ حسن نے 'موسیٰ سے مارکس تک' میں لکھا ہے:

> 'ہمارے ملک میں بھی اب شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ہو جس نے سوشلزم کا نام نہ سنا ہو تو یہاں بھی سوشلسٹ لٹریچر آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ:
>
> بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے
>
> البتہ حیرت ہے کہ پاکستان کی کسی زبان میں ہنوز سوشلزم کی اچھی بری ایک تاریخ بھی موجود نہیں ہے۔ یہ کتاب اسی کمی کو دور کرنے کی غرض سے

لکھی گئی ہے۔' ۲۲

سبطِ حسن کی یہ کتاب یقیناً ہر اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ سبطِ حسن کی دوسری تصانیف مثلاً 'ماضی کے مزار' اور 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' بھی بہت اہم ہیں کہ ان موضوعات پر بھی ترقی پسند نقطۂ نظر سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ تاہم خرد افروزی اور روشن خیالی کے اعتبار سے سبطِ حسن کی کتاب 'نویدِ فکر' اور 'انقلابِ ایران' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ 'نویدِ فکر' کے مضامین میں جس طرح سبطِ حسن نے سیکولرازم کے مفاہیم کی وضاحت کرتے ہوئے اسے اس عہد کی سماجی اور سیاسی ضرورت قرار دیا ہے وہ اس مسئلے کی صحیح تفہیم کی راہیں استوار کرتی ہے۔ اسی طرح جس زمانے میں سبطِ حسن نفسیاتی ڈاکٹروں کی ایک کانفرنس کے لیے اپنا مقالہ 'تہذیب کا اثر ہمارے خیالات پر' پر تحریر کر رہے تھے بعض ایسے واقعات پر بحث چھڑ گئی جنھیں توہم پرستی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سبطِ حسن نے مثالیں دے کر بتایا تھا کہ ہمارے معاشرے میں جو مختلف توہمات رائج ہیں ان سے سیدھے سادے عقیدت مندوں کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ ۲۳

اب آج کی فضا کو دیکھیے تو بہ ظاہر سائنس اور ٹیکنالوجی کا وظیفہ پڑھنے کے باوجود ہمارے معاشرے میں توہم پرستی کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا جا رہا ہے۔ مثلاً طباعتی ذرائع کے علاوہ اب برقی ذرائع ابلاغ کے توسط سے دست شناسی، تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک نیز استخارہ بینی کے پروگرام پیش کیے جا رہے ہیں۔ حال آں کہ لسان الغیب حافظ شیرازی کا ارشاد یہ ہے:

درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست

ایسے ماحول میں سبطِ حسن کی یہ تحریریں جو 'نویدِ فکر' اور 'Battle of Ideas in Pakistan' میں شامل ہیں کم سے کم نئی نسل کے مطالعے میں تو ضرور آنی چاہئیں، تاکہ روشن خیالی کا کچھ اثر تو قائم ہو اور سماج کو زندگی کے دوسرے رخ کا بھی اندازہ ہو۔

سبطِ حسن سیکولر ذہن کے انقلابی دانشور تھے۔ انھوں نے تاریخ، فلسفہ، مذاہب، نظریات و عقائد اور ارتقا کے بارے میں جو وسیع تر مطالعہ کیا تھا اس نے ان کے ذہن کو ایک ہمہ گیر اکائی (Holistic) میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کے مالہ و ما علیہ سے مکمل واقفیت کے بعد اپنا بیانیہ اور اس کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ سبطِ حسن کی ہر کتاب کا اس تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے بہ طور خاص ان کی کتاب 'انقلابِ ایران' کا انتخاب کیا

ہے۔ ۱۹۷۹ء میں اس کتاب کی پہلی اشاعت عمل میں آئی تھی اور اب ۲۰۱۵ء میں اس کا دسواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ سبطِ حسن اس اعتبار سے اہم مفکر ادیبوں اور دانش وروں میں شامل ہیں جو اپنے معاشرے کو برابر فکری غذا فراہم کرتے جا رہے ہیں۔

یہ سوال تو سبطِ حسن سے پوچھا جا سکتا تھا کہ انھوں نے انقلابِ ایران کو بہ طور موضوع کیوں منتخب کیا۔ لیکن ذاتی مراسم کے باوجود مجھے اس سوال کا موقع میسر نہ آیا۔ البتہ سبطِ حسن ہی کی 'تمہید' میں اس کا ممکنہ جواب نظر آ گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'اس انقلاب سے یہ نتیجہ تو آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جبر کا بھیانک عفریت بہ ظاہر بہت قوی لیکن در حقیقت بہت کمزور ہوتا ہے... ایران اور پاکستان کے معاشرتی حالات میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایرانی معاشرے کا وہ کون سا پہلو ہے جو ہمارے ۳۲ سالہ تجربوں سے مختلف ہے۔ زندگی کو حسین و دلکش بنانے کے وہی خواب اور وہی ان کی ہیبت ناک تعبیریں، انسانی حقوق کی وہی پامالی، کبھی جمہوریت کے نام پر، کبھی مذہب کے نام پر، دولت و اقتدار کی وہی ہوس اور ہوس کی وہی بے شرمیاں، دیو استبداد کی وہی سفاکیاں اور گیرودار کی وہی رسم کہن، وہی درباری سازشیں اور ملکی مفاد کے وہی سودے، عوام کے مسائلِ زیست سے وہی غفلت، ضمیر انسانی کی وہی خرید و فروخت اور وقارِ انسانی پر وہی بے حرمتی، جلوت میں اخلاق و ایمان داری کے وہی وعظ اور خلوت میں وہی ان وعظوں کی نفی، طاقت کا وہی نشہ اور اس طاقت کے لازوال ہونے کا وہی غرّہ، غرضیکہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھو تو ایران کی گزشتہ ۳۵ سالہ تاریخ میں اپنے گھر کی بربادی کا نقشہ صاف نظر آ جائے گا۔'[۶]

وہ ایران کی ۳۵ سالہ تاریخ اور اس میں رونما ہونے والے واقعات کے آئینے میں پاکستان کا چہرہ دکھاتے ہوئے ایران کو ایک Test case کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایران کے سیاست داں، مذہبی پیشوا، ادیب اور شاعر، مفکر اور دانش ور کس طرح جان کے نذرانے پیش کرتے رہے،

اور کس طرح عوامی اور انقلابی طاقتوں نے ہار ماننے کے بہ جائے کبھی تودہ پارٹی، کبھی مشروطیت اور کبھی قانون نویسندگان کے ذریعے سیاسی گھٹن کے خلاف احتجاجی ادب پیش کیا۔ سبطِ حسن اس پس منظر میں نئے شعور کی بیداری کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ سبطِ حسن جانتے تھے کہ ادب اور فکریاتی تحریروں کے ذریعے ہی معاشرے میں رواج پا جانے والی اضافیت اور عینیت (Relativism and Idealism) کے اثرات کو زائل کر کے نئے ذہنوں کو بے سمتی سے نکال کر ایک بامقصد سمت کی جانب متوجہ کیا جاسکتا ہے۔

سبطِ حسن کے پیش نظر دنیا کے چند اہم انقلابات بھی تھے جن میں برطانیہ کا صنعتی انقلاب، انقلابِ فرانس، انقلابِ روس اور انقلابِ چین بہ طور خاص اہم ہیں۔ وہ انقلاب کو محض ایک وقتی تبدیلی سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ وہ کارل مارکس کے ان الفاظ سے انقلاب کی ضرورت اور غایت کا تعین کرتے ہیں:

> 'انقلاب فقط اسی وجہ سے ضروری نہیں کہ حکمران طبقے کو انقلاب کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اقتدار سے بیدخل نہیں کیا جاسکتا بلکہ انقلاب اس لیے بھی ضروری ہے کہ انقلاب ہماری ذات کی تطہیر کرتا ہے، اطاعت و بندگی، تذبذب اور تشکک کے داغ دُھل جاتے ہیں اور انسان اس آگ سے کندن بن کر نکلتا ہے۔' [۵]

اسی بنا پر سبطِ حسن امام خمینی کے انقلابِ ایران کو سراہنے کے باوجود اپنا یہ نقطۂ نظر بھی پیش کرتے ہیں کہ امام خمینی کو تھیوکریسی کے بہ جائے جمہوریت کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ وہ ایران کے سب سے بڑے دشمن امریکا کے آلۂ کار نہ بنیں جیسا کہ ایران شاہ رضا شاہ کے دورِ حکومت میں بنتا رہا ہے لیکن سبطِ حسن کو اس موقف میں بھی ایک تضاد نظر آیا کہ امام خمینی امریکا سے لڑنے کا عہد کرنے کے ساتھ ساتھ ان جمہوریت پسند عناصر سے بھی آمادۂ پیکار ہیں جو امریکی امپیریل ازم سے جنگ میں ان کے سب سے معتبر اور مستعد رفیق ہو سکتے تھے۔ سبطِ حسن یہ بھی سمجھتے تھے کہ اگرچہ امام خمینی کی تھیوکریسی کو آئینی شکل دے دی گئی ہے لیکن یہ ایران کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کا حل نہیں بلکہ اس سے تو مسائل اور پیچیدہ ہو جائیں گے۔

سبطِ حسن کا یہ تجزیہ اور پیش بینی درست ثابت ہو رہی ہے۔ ایران کے پاس اپنی معیشت کو

برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ تیل ہے اس کے علاوہ اقتصادی منصوبہ بندی کے کوئی بڑے ذرائع سامنے نہیں آئے۔ سبطِ حسن مارکسی نقطۂ نظر سے انقلاب کے ضمن میں عوام کی اقتصادی خوش حالی اور جمہوریت کو قدر اوّل کی حیثیت دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ تاریخ کے بڑے انقلابوں سے انقلابِ ایران کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایرانی انقلاب سوشلسٹ انقلاب نہیں تھا کہ محنت کش طبقہ برسرِ اقتدار آتا اور ریاست کے ڈھانچے کو توڑ کر نیا ڈھانچہ تیار کرتا، جیسے روسی انقلاب کے بعد ہوا۔ ایرانی انقلاب فرانس کے ۱۸ویں صدی کے انقلاب کے مانند سماجی انقلاب بھی نہ تھا کہ سماجی رشتے بدل جاتے اور نوابوں، جاگیرداروں کی فیوڈل ملوکیت کی جگہ سرمایہ داروں کی بورژوا جمہوریت قائم ہوجاتی۔

سبطِ حسن تاریخ اور اسطوری روایات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اس سے ان کی تحریریں دلچسپ ہوجاتی ہیں اور خالص فکری مباحث کی حامل ہونے کے باوجود ان میں اسلوب کی چاشنی اور عبارت کی دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ انقلابِ ایران کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے کسی وقتی یا ہنگامی شورش کا نتیجہ نہیں قرار دیتے بلکہ تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ عمل تو ایران کی قدیم روایت کے ایک کردار ضحاک سے شروع ہوتا ہے جس کے ظلم کے خلاف ایک محنت کش انسان یعنی کاوہ آہن گر نے اپنی دھونکنی کے چمڑے سے پرچم بنالیا تھا اور جو درفشِ کاویانی کے نام سے موسوم ہے۔ اسی پرچم تلے کاوہ آہن گر نے عوام کو اکٹھا اور متحد کیا اور ظالم ضحاک سے معاشرے کو نجات دلائی۔ سبطِ حسن کہتے ہیں کہ:

> 'کاوہ آہن گر کوئی فرد نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زیست ہے۔ وہ کبھی مانی اور مزدک کے قالب میں ظہور کرتا ہے کبھی ابو مسلم خراسانی، سمن باز، یعقوب ابن لیث، بہا فرید زوزانی، استاد لیس خراسانی، یوسف ابرم، ابو عیسیٰ اسحاق اصفہانی، حکیم مقنع مروی، عبداللہ بن میمون ہوازی، بابک خرمی اور منصور حلاج کے پیکر میں ایرانیوں کے قومی تشخص اور وطن کی نمائندگی کرتا ہے ان شہیدانِ وفا میں کوئی سیاسی رہبر ہے، کوئی مصلح قوم ہے، کوئی مفکر ہے، کوئی صوفی ہے اور کوئی شاعر۔' [۱۶]

تاریخ کے اس جدلیاتی عمل کو سبطِ حسن نے جس آنکھ سے دیکھا اور معاشرے کے مختلف افراد کی

قربانیوں اور جدوجہد کا ایک تسلسل پیش کر دیا اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انقلابِ ایران پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ تجزیاتی بصیرت اور تاریخ کے تسلسل میں اس کی بنیادوں کو تلاش کرنے کا عمل کہیں نہیں ملتا۔ یہی سبب ہے کہ سبطِ حسن کی نہ صرف یہ کتاب بلکہ ہر کتاب سنجیدہ، علمی اور فکری ہونے کے باوجود دلچسپی اور انہماک سے پڑھی جاتی اور اس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ انقلابِ ایران، تحقیق، تجزیے اور نتائج کے استنباط کی بنا پر سبطِ حسن کا ایک غیر معمولی تحقیقی کارنامہ ہے۔

سبطِ حسن کی 'انقلابِ ایران' کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ قدیم ایران کے تاریخی پس منظر سے شروع ہوتی ہے۔ ایران میں عہد بہ عہد جو بادشاہتیں رہیں اور ان کے خلاف جو انقلابی تحریکیں نمایاں ہوتی رہیں ان کا بصیرت افروز تذکرہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ انقلابی تحریکوں کا یہ سلسلہ امام خمینی تک پہنچتا ہے۔ امام خمینی کے ایک اجتہادی رُخ کو بطور خاص نمایاں کیا ہے اور وہ ہے 'ولایتِ فقیہہ' کا مسئلہ امام خمینی سے اختلاف رکھنے والے علما کا موقف یہ تھا کہ مجتہد حضرات کو نائب امام کی حیثیت سے فقط شرعی امور کی حد تک شیعوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا چاہیے جب کہ امام خمینی نے شرعی امور کے علاوہ سیاسی امور کو بھی 'ولایتِ فقیہہ' کے تابع کر دیا تھا۔

کتاب کا ہر موضوع پوری تحقیق اور تاریخی تسلسل کا حامل ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں سبطِ حسن کے اس اعتراف کا رنگ زیادہ واضح ہوا ہے جس کا تعلق شبلی نعمانی کے اثرات سے ہے۔ شبلی نعمانی کے 'شعرالعجم' کی طرح سبطِ حسن نے بھی ایرانی انقلاب کے اچھے خاصے صفحات فارسی شاعری اور اہم شعرا کے تعارف و تحسین کے لیے مختص کیے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے 'شعرالعجم' کا آغاز قدیم شعرائے فارسی سے کیا تھا جن میں رودکی، دقیقی، فردوسی اور نظامی گنجوی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے قاآنی تک پہنچا تھا۔ سبطِ حسن نے فارسی کے جدید شعرائے ایران کو منتخب کیا ہے۔ یہ شعرا مشروطیت سے لے کر 'جبہۂ ملی' جیسی انقلابی تحریکوں سے بھی متاثر رہے ہیں۔ ان میں پروین اعتصامی، نادر نادر پور، احمد شاملو، شامل ہیں ان کے علاوہ ادیب نیشاپوری، فخر الواعظین خاورگی، ایرج مرزا، دھخدا، ملک الشعرا بہار، جیسے روایت شناس شعرا کے تخلیقی ردِ عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ سبطِ حسن نے تمام فارسی کلام اور فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ بھی نہایت سلیقے سے کیا ہے۔

سبطِ حسن اس امر کا بہ خوبی شعور رکھتے تھے کہ کوئی معاشرتی یا سیاسی تبدیلی یا انقلاب فکری بنیادوں

کے بغیر ممکن نہیں اور جو معاشرہ اپنی فلاح کے لیے کوئی فلسفہ اختیار کرتا ہے تو اس فکر مجرد کو محسوسات کی سطح پر عوام و خواص تک پہنچانے کا کام ادیب، شاعر اور دانش ور کرتے ہیں۔ چنانچہ انقلابِ ایران کے طویل سفر میں اہل قلم اور اہل دانش نے شاعری، ناول، افسانہ اور ڈراما کی اصناف کے ذریعے عوام میں بیداری کا جو منصب ادا کیا ہے اس کی جانب بھی سبطِ حسن نے مثالیں پیش کی ہیں۔

اس وقت پروین اعتصامی اور احمد شاملو کی نظموں کے اردو تراجم ملاحظہ کیجیے جو سبطِ حسن کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ فارسی کے اصل متن کے لیے 'انقلابِ ایران' سے رجوع کیجیے۔

> 'پہلوی دور کے بھی شاعروں کی مانند پروین اعتصامی اپنا مدعا علامتوں اور استعاروں میں بیان کرتی ہیں۔ 'خون کے دو قطروں کے درمیان مناظرہ' اسی نوع کی رزمیہ نظم ہے جس میں بادشاہ کے خون کا قطرہ مزدور کے خون کے قطرے سے مصروفِ کلام ہے۔'
>
> 'ایک قطرے نے دوسرے قطرے سے پوچھا تو کس کا خون ہے۔ میں تو بادشاہ کے ہاتھ سے ٹپکا ہوں۔'
>
> 'اس نے جواب دیا کہ میں ایک لکڑہارے کے پاؤں سے ٹپکا ہوں۔ کانٹے کی تکلیف سے جو پاؤں میں نشتر کی طرح چبھتا ہے۔'
>
> 'شاہی قطرے نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون کے بھی قطروں کا رنگ سرخ ہوتا ہے خواہ وہ کسی کے بدن سے ٹپکیں اور رگ سے نکلیں یا شریان سے۔ آؤ ہم دونوں مل کر بڑا قطرہ بن جائیں اور متحد ہو کر سعی و عمل کی راہ پر چلیں تاکہ راستے کے خطروں سے محفوظ رہیں اور چھوٹے چھوٹے ندی نالوں سے بچ کر کسی بڑے دریا میں شامل ہو جائیں۔ اس پر لکڑہارے کے خون کا قطرہ ہنسا۔'
>
> 'وہ ہنس کر بولا کہ مجھ میں تجھ میں بڑا فرق ہے۔ تو شاہ کے ہاتھ سے ٹپکا اور میں مزدور کے پاؤں سے۔'
>
> 'میری ہمراہی اور دوستی کے لیے تو یتیم کے آنسو اور محنت کار کا خون ہی مناسب رہے گا۔'

'تو آرام اور عشرت کی پیداوار ہے جب کہ میں پیٹھ کے جھکاؤ اور کمر کے
بوجھ سے پیدا ہوا ہوں۔'

'تیری پرورش شاہ کے باورچی خانے میں پکے ہوئے کھانے سے ہوئی
ہے... اور میری پرورش آہوں کی آگ اور بھیگی آنکھوں کے پانی سے۔'

'تجھ میں سرخی سرخ رنگ کی شراب سے آئی ہے۔ اور مجھ میں کانٹے کی
چوٹ اور جگر کی جلن سے۔'

'میرا نقش تقدیر اور حادثے سے نہیں مٹ سکتا۔ یہ وصف اور کس خون کے
قطرے میں ہے۔'

'اس خونی علامت میں دو سو دریا پوشیدہ ہیں اور انھیں کے ساحل سے فتح
کی کشتی نمودار ہوتی ہے۔'

'اطاعت اور غلامی کی قید میں پھنسے ہوئے لوگ اگر رہائی کی خاطر اپنے
بازو اور پر ہلائیں تو آزاد ہو سکتے ہیں۔' ؎

پہلوی جبر و استبداد کی اس سے بہتر مذمت اور کیا ہو سکتی تھی...؟ پروین واضح لفظوں میں ایرانیوں کو بتاتی ہے کہ اربابِ اقتدار اور محنت کش عوام کے درمیان اتحاد ممکن نہیں۔ اتحاد تو محنت کاروں اور مصیبت زدوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ لوٹنے اور لٹنے والوں کے مابین۔ لہٰذا ایرانی عوام کو لازم ہے کہ متحد ہو جائیں۔ اطاعت اور بندگی کا شیوہ ترک کر دیں اور اپنے ہاتھ پاؤں کو آزادی کی خاطر جنبش دیں۔

احمد شاملو کی ایک طویل نظم 'شعری کہ زندگی ست' ہے جس میں شاعر پرانی اور نئی شاعری کا موازنہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

پرانے زمانے کے شاعروں کا موضوعِ سخن
زندگی نہ تھا
وہ اپنے خشک خیالوں کے آسمان میں بیٹھ کر
شراب اور شاہد کے سوا کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے
(اس کے برعکس) دورِ حاضر کے شعر کا موضوع

کچھ اور ہے۔
آج شعر عوام کا حربہ ہے
اس لیے کہ آج شاعر
خود عوام کے جنگل کی شاخیں ہیں۔
نہ کہ کسی مخصوص فرد کے باغ کی چنبیلی اور سنبل
آج کا شاعر عوام کے مشترکہ دکھوں سے
بے تعلق نہیں ہے۔
وہ عوام ہی کے ہونٹوں سے ہنستا ہے
اور ان کی امیدوں میں اپنی ہڈیوں کا پیوند لگاتا ہے
شاعرِ امروز کے شعر کا پیکر؟
میں نے کہا
زندگی ہے
شاعر زندگی ہی کے چہرے سے
شعر کے رنگ اور روشنی کے ذریعے
ایک نقش کو سامنے رکھ کر دوسرا
نقش بناتا ہے،
وہ شعر لکھتا ہے۔
یعنی
وہ پرانی زندگی کے زخموں کو چھیڑتا ہے
یعنی
وہ رات سے دلکش صبح کا قصہ بیان کرتا ہے
وہ شعر لکھتا ہے
یعنی
وہ شہر اور دیہات کے دکھوں کی

فریاد کرتا ہے
یعنی
وہ اپنے نغموں سے تھکی ماندی روحوں میں
جان ڈالتا ہے
وہ شعر لکھتا ہے
یعنی
وہ ٹھنڈے اور سنسان دلوں کو جذبۂ شوق
سے سرشار کرتا ہے
یعنی
اس کا رخ طلوع ہونے والی صبح کی جانب ہوتا ہے اور وہ
سوئی ہوئی آنکھوں کو جگاتا ہے
وہ شعر لکھتا ہے
یعنی
وہ عصرِ حاضر کے انسان کے عروج کی تاریخ کی
تفسیر کرتا ہے
یعنی
وہ اپنے عہد کی فتوحات کی تاریخ
بیان کرتا ہے [۵]

اندازہ ہوتا ہے کہ سبطِ حسن کو شاعری سے خواہ وہ قدیم ہو یا جدید یک گونہ دلچسپی تھی۔ ان کے تراجم شاعرانہ اسلوب کے حامل ہوتے ہیں۔ 'ماضی کے مزار' میں انھوں نے گل گامش کی منظوم داستان کا ترجمہ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ کیا ہے۔ دنیا کی یہ پہلی داستان طویل بھی ہے اور منظوم بھی۔ قدیم عراق کے تین ہزار سال قبل مسیح کی یہ داستان ہے۔ اس کا ہیرو گل گامش ہے۔ سبطِ حسن نے لکھا ہے کہ عراق کے نیم اساطیری اور نیم تاریخی دور میں دوسری تہذیبوں کے مانند اپنے

پیروؤں کو دیوتا کا درجہ کبھی نہیں دیا۔گل گامش بھی فقط 'دو تہائی دیوتا' بن سکا اور بالآخر اسے بھی موت کا جام پینا پڑا کہ:

'ابدی زندگی تو فقط دیوتاؤں کی قسمت میں لکھی ہے۔'[9]

سبطِ حسن کی بنیادی فکر وہی تھی جو بائیں بازو کے ایک دانشور کی ہونی چاہیے۔ان کی یہ فکر سبطِ حسن کی تمام تحریروں میں پوری سچائی اور سلیقۂ اظہار کے ساتھ موجود ہے۔انیسویں صدی سے خصوصیت کے ساتھ Anthropology اور تاریخ ساتھ ساتھ محوِ سفر ہیں۔سبطِ حسن نے 'ماضی کے مزار' اور 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کو صرف تاریخی تناظر ہی میں پیش نہیں کیا ہے بلکہ انتھروپولوجی کی دریافتوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔اسی طرح سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ موضوعات کے ساتھ ساتھ انھوں نے شخصیات پر بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ان میں سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض بہ طورِ خاص اہم ہیں۔

سبطِ حسن کی تحریریں متنوع ہیں۔ان میں ان کی فراست، بصیرت، خرد افروزی، اور روشن خیالی کی تجلیات اس طرح ظہور پذیر ہوئی ہیں کہ ساری تحریریں ایک فیض رساں اکائی کی صورت جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد سبطِ حسن 'شہرِ نگاراں' کراچی مکتبۂ دانیال'، ۲۰۱۶ء، ص ص ۷۶۔۷۵

۲۔ سبطِ حسن 'موسیٰ سے مارکس تک'، کراچی مکتبۂ دانیال'، ۱۹۹۷ء، ص ص ۸۔۷

۳۔ سیّد سبطِ حسن 'نوید فکر'، کراچی مکتبۂ دانیال'، ۲۰۱۶ء، ص ۲۷۸

۴۔ سیّد سبطِ حسن 'انقلابِ ایران'، کراچی مکتبۂ دانیال'، ۲۰۰۶ء، ص ص ۱۰۔۹

۵۔ ایضاً، ص ۸

۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۷۔ ایضاً، ص ص ۴۶۔۴۴

۸۔ ایضاً، ص ص ۵۷۔۵۳

۹۔ سیّد سبطِ حسن 'ماضی کے مزار'، کراچی مکتبۂ دانیال'، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۱

سیّد سبطِ حسن اور معقولیت

احمد ہمدانی

سید سبطِ حسن صرف ایک خود کا نہیں بلکہ ایک اسلوبِ حیات اور ایک انسانی رویہ کا نام ہے۔ غیر انسانی حالات میں انسانیت کا کھوج لگانا اور اسے بحال کرنا سید سبط حسن کی زندگی کا مقصد تھا۔ اور انہوں نے اپنے اس مقصد کے حصول میں کسی قیمت پر بھی کوئی کمی نہیں آنے دی۔ ان کی تمام تصانیف انسانیت کے کھوج لگانے کا روشن کارنامہ اور ان کی پرعزم زندگی انسانیت کو بحال کرنے کی قابلِ فخر مثال ہے۔ ہمارے زمانے میں شخصیت کے بحران اور فرد کی ٹوٹ پھوٹ کا چرچا بہت عام ہے لیکن اس چیخ و پکار میں بھانت بھانت کی بولیوں کے باوجود انسان کی آواز مشکل ہی سے سنائی دیتی ہے۔ تاہم ہمارے اپنے معاشرے میں سبط صاحب گنتی کے ان دو چار دانشوروں میں سے ایک تھے جنہوں نے حقیقت انسان پر زندگی بھر غور کیا اور معاشرتی کوائف کے تناظر میں انسان و کائنات کے درمیان وحدت کی نشاندہی کی۔

انسان و کائنات کے درمیان وحدت کی یہ نشاندہی ہمارے یہاں دانشوروں کی نئی روایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور نہ صرف ایک کڑی ہے بلکہ اس نئی روایت کا ایک توسیعی انداز ہے۔ دراصل سر سیّد نے برصغیر کے مسلم معاشرہ میں دانشوری کی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ دانشوری کی یہ نئی روایت منقولات پر معقولات کو ترجیح دیتی ہے۔ خرد افروزی اور روشن خیالی معقولات کی روایت کا لازمی حصہ ہے۔ اگر کوئی قوم خود کو صرف منقولات تک محدود کر لے تو وہ

یہ مضمون ماہنامہ 'طلوعِ افکار' (کراچی) کے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا (مرتب)۔

زمانے کے تغیرات کا ساتھ دینے سے قاصر رہ جاتی ہے اور اس طرح ترقی وارتقا کے سارے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔ سر سیّد نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا اجتماعی رویہ منقولات پر استوار ہونے کی وجہ سے یکسر تقلید کا اسیر ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقلید اپنی نوعیت میں تخلیق کی ضد ہے چنانچہ وہ قوم جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو جائے تو آخر کار انسانیت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ علامہ اقبال کو بھی مسلمانوں کے منقولات پر استوار غیر تخلیقی رویہ سے سخت پریشانی اور شکایت تھی، چنانچہ انہوں نے کہا تھا۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

روایات سے مراد منقولات کو کل حقیقت سمجھ لینا ہے۔ منقولات پر اس درجہ بھروسہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا سینہ بہ سینہ روایات میں کسی طرح کا اضافہ یا ردوبدل حرام ٹھہرا دیا جائے اور انسان کی عقل، شعور، تجربہ اور مشاہدہ کو مکمل طور پر معطل کر دیا جائے۔ اس رویہ کو اپنانے والے ایک مخصوص نظریۂ علم کے مبلغ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ علم جو حواس کے ذریعہ حاصل کیا جائے غیر معتبر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ علم کی بنیاد عقل نہیں بلکہ وجدان ہے اور وجدان کے ذریعہ حاصل کردہ علم کے لیے ضروری نہیں کہ اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر غیر سائنسی رویہ ہے۔ اس غیر سائنسی رویہ پر تنقید اور معقول رویہ کا قیام سر سیّد اور علامہ اقبال کی طرح سیّد سبط حسن کی زندگی کا بھی مقصد تھا۔ جس طرح منقولات پرستوں نے سر سیّد اور علامہ اقبال کی بھرپور مخالفت کی اور ان پر کفر کے فتوے لگائے اسی طرح سیّد سبط حسن کی مخالفت میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں کی گئی۔ ان کے مخالفین میں ایک گروہ منقولات تک محدود بنیاد پرستوں کا تھا اور دوسرا نام نہاد جدیدیوں کا اپنی نوعیت میں یکسر عقل دشمن رویہ کے حامل ہیں پھر غضب یہ کہ ان دونوں گروہوں نے باہم سازش کر کے حکومتِ وقت کو ان کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ سیّد صاحب کو قیدوبند کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑے لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ بنیاد پرستوں اور نام نہاد جدیدیوں کی نظر میں سیّد صاحب کا گناہ سر سیّد اور علامہ اقبال کے گناہ سے اس لیے اور بھی زیادہ ناقابلِ برداشت تھا کہ انہوں نے نہ صرف ان بزرگوں کی روایت کو اپنایا بلکہ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ سائنسی خطوط میں ڈھالا جو غیر سائنسی مزاجوں کے لیے بالکل ہی ناقابلِ برداشت تھا۔ سر سیّد تحریک سے جنم لینے والی دانشوری کی نئی روایت کو

مزید سائنسی انداز میں ڈھالنے کی کوشش میں سید سبط حسن نے اپنے مخالف گروہوں کے نظریات کا فراخدلانہ جائزہ لے کران پر تنقید کی۔ ان کی تنقیدی تحریروں کی بنیاد ان کا یہ اصول تھا کہ خیالات کا مقابلہ بہتر خیالات ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ تمام تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ انہوں نے معقولیت اور روشن خیالی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ آیئے پہلے ہم اس بات کی وضاحت کرتے چلیں کہ معقولیت اور روشن خیالی کے نزدیک انسان اور انسانیت سے مراد کیا ہے؟

انسان اس کائنات سے الگ کوئی حقیقت نہیں ہے البتہ اپنی نوعی خصوصیات کے اعتبار سے وہ دوسری انواع سے مختلف بھی ہے اور اعلیٰ وارفع بھی۔ اس لیے کہ وہ واحد حیوان ہے جو اپنی فطرت میں سماجی ہونے کے ساتھ شعور اور تخلیق کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور ہے۔ اس کا شعور اس کی عقل اور اس کے حافظے کی دین ہے جبکہ تخلیق اس کی عقل کے ساتھ اس کی ضرورت اور ارادہ کا نتیجہ ہے گویا انسان واحد حیوان ہے جو اپنی سماجی فطرت کے ساتھ عقل وشعور اور ارادہ کی تخلیق سے متصف ہے وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ اپنی زندگی کو زیادہ بہتر اور خوشگوار بناتا ہے۔ زندگی کو زیادہ بہتر اور خوشگوار بنانے کے لیے وہ طرح طرح کے آلات واوزار ایجاد کرتا ہے اور ان اوزار وآلات سے اپنی روزی پیدا کرنے میں نہ صرف سہولت پیدا کرتا ہے بلکہ مجموعی پیداوار میں اضافہ کرتا ہے۔ جو مجموعی خوشحالی میں اضافہ کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اپنی محنت سے جو اوزار وآلات وہ بناتا ہے ان پر اسے فخر بھی ہوتا ہے۔ وہ ان آلات واوزار میں ایک طرح اپنی ذات کا تماشا کرتا ہے اور اس طرح اپنی تخلیق میں خود اپنے آپ سے ملاقات بھی کرتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس کی محنت سے تخلیق کردہ آلات واوزار خود اس کی ملکیت ہوں اور وہ ان کو اپنے فائدہ کے لیے اپنے طور پر استعمال کرسکے لیکن جب صورت اس سے مختلف ہو اور اس کی تخلیق کردہ مشینیں خود اسے استعمال کرنے لگیں اور وہ ان مشینوں کا ایک پرزہ بن کر رہ جائے تو پھر وہ خود کو دیکھنے اور خود سے ملاقات کرنے کی خوشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی اپنی محنت اس کی غیر بن جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس میں ایک احساس اجنبیت پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نہ صرف خود سے بچھڑ جاتا ہے بلکہ یہ پوری زندگی اور کائنات اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبط صاحب کہتے ہیں کہ احساسِ اجنبیت کے اسباب اور انسانی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کی وجوہات انسان کے اندر نہیں ہوتیں بلکہ اس کے خارج میں قائم پیداواری عمل میں مضمر ہوتی ہیں لہٰذا انسان کی شخصیت کے

بحران کی اصلاح مطلوب ہوتو یہ کام پیداواری عمل کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔[1]

آلات و اوزار اور دوسری اشیاء انسان کی مادی تخلیق ہیں لیکن انسان مادی تخلیقات کے علاوہ غیر مادی تخلیقات پر بھی قادر ہے۔ زبان، شعر و ادب، فنون لطیفہ اور معاشرتی اقدار اس کی غیر مادی تخلیقات ہیں۔ یہ سب تخلیقات بھی اطراف کے حالات و کوائف ہی سے جنم لیتی ہیں البتہ ان تمام تخلیقات کی غایتِ اساسی مشترک ہوتی ہے۔ مثلاً زبان کا مشترکہ مقصد ابلاغ باہمی ہے۔ اسی طرح شعر و ادب اور فنون لطیفہ اطراف کے حالات کی معنویت کو ابھارنے کے ساتھ نشاط و مسرت کی کیفیت کو اجاگر کرنے، زندگی کو آگے بڑھانے، اور اسے نکھارنے سنوارنے میں مدد دیتے ہیں جبکہ معاشرتی اقدار حالات کی مطابقت میں اطراف کے لوگوں کے درمیان یگانگت اور سماجی انصاف کو ممکن بناتی ہیں چنانچہ حالات بدل جانے کے ساتھ معاشرتی اقدار میں بھی تبدیلی آنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر بدلے ہوئے حالات میں مروجہ معاشرتی اقدار سماجی انصاف کو ممکن بنانے کے بجائے ناانصافی کا سبب بن جائیں تو وہ اپنی غایتِ اساسی ہی کو کھو بیٹھتی ہیں چنانچہ ان میں مناسب تبدیلی ان کی اپنی غایت کا تقاضہ ہوتی ہے۔ بہر حال یہ تمام غیر مادی اقدار بھی انسان کی عقل و شعور اور اس کی تخلیق ہی کا نتیجہ ہیں لیکن وہ یہ تخلیق خلاء میں نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا یہ تخلیقی عمل بھی اس کے اطراف فطرتی و جغرافیائی حالات اور معیشتی و معاشرتی کوائف کے تناظر میں انجام پاتا ہے۔

انسان اور انسانیت کی جو تشریح ہم نے کی ہے اس سے دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کائنات سے الگ کوئی حقیقت نہیں ہے، جس کی بنا پر اسے فطرت کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے البتہ اپنی نوعی خصوصیات کی وجہ سے اسے فطرت کے دوسرے مظاہر و انواع پر ایک فوقیت حاصل ہے اور وہ فوقیت اس کے عقلی و سماجی ہونے میں مضمر ہے۔ اس کے عقلی، سماجی اور افادیت آفریں وجود کو ہم اس کی تخلیقی، تہذیبی اور جمالیاتی حقیقت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ شہد کی مکھیوں اور چڑیوں وغیرہ کو بھی سماجی حیوان کہتے ہیں اور انہیں اس معنی میں تخلیقی بھی کہتے ہیں کہ وہ چھتے اور گھونسلے وغیرہ بنانے پر قادر ہیں۔ سبط صاحب اس رائے سے متفق نہیں ہیں کیونکہ شہد کی مکھیاں اور چڑیاں اپنی جبلت کے تحت ایسا کرتی ہیں۔ ان چھتوں اور گھونسلوں میں وہ تنوع نہیں ہوتا جو انسان کے مکانوں میں نظر آتا ہے چنانچہ یہ کوئی تخلیقی عمل نہیں جو ان کی عقل و شعور کا نتیجہ ہو۔ سبطِ صاحب کے خیال میں صحیح معنی میں سماجی اور تخلیقی حیوان صرف انسان ہے۔

کچھ ماہرین علم بشریات نے انسان کے سماجی ہونے کے ایک اور پہلو کو بھی ابھارا ہے او ہے اس کا ضیافتی یا(Convivial) ہوتا۔ یعنی وہ اپنی طبیعت سے اپنے گروہ کے دوسرے افرا اپنی حاصل کردہ غذا میں شریک کرتا ہے۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ حجری زمانے میں بھی جب کوئی انسان کسی اچھے جانور کا شکار کر لیتا تھا یا کوئی عمدہ پھل حاصل کرتا تھا تو وہ اپنی اسی حاصل کردہ غذ میں اپنے گروہ کے دوسرے افراد کو شریک کرتا تھا۔ اپنی غذا میں دوسروں کو شریک کرنے کی یہ منفر خصوصیت صرف انسانوں ہی سے مختص ہے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ لوگ دودھ پلانے والے جانوروں اور چڑیوں کی مثال دیتے ہیں کہ دودھ پلانے والے جانور اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے علاوہ آہستہ آہستہ اپنے شکار میں بھی بچوں کو شریک کرتے ہیں۔ بلیاں اس کی واضح مثال ہیں۔ اسی طرح چڑیاں بھی اپنے بچوں کو چوگا دیتی ہیں۔ لیکن یہ مثالیں درست نہیں ہیں۔ کیونکہ اں سب جانوروں کا یہ عمل بہت مختصر مدت کے لیے ہوتا ہے اور سراسر ان کی جبلت کا تقاضہ ہے۔ یہاں ان کے اپنے ارادے یا اختیار کو دخل نہیں ہے جبکہ انسان اپنے ارادے اور اختیار سے دوسروں کو اپنی غذا میں شریک کرتا ہے۔

انسان کے سماجی ہونے کے سلسلے میں سیّد سبط حسن نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف 'موسیٰ سے مارکس تک' میں بتایا ہے:

> 'انسان اس سرزمین پر تقریباً تیس لاکھ برس سے آباد ہے مگر اس طویل مدت میں اس نے کبھی اکیلے زندگی بسر نہیں کی بلکہ کسی نہ کسی خاندان قبیلے یا جمعیت سے ضرور وابستہ رہا ہے۔ وہ تنہا رہ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اکیلا آدمی نہ اپنی حفاظت کر سکتا تھا نہ بال بچوں کی پرورش اور نہ خوراک کا سامان فراہم کر سکتا تھا، بلکہ اسے قدم قدم پر دوسروں کا تعاون درکار ہوتا تھا۔ دوسروں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ معاشرہ کے اندر ہی اس کے شعور نے ترقی کی، اس نے اپنے وجود کو پہچانا اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لیا۔'[۲]

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'انسان نے جو دریافتیں یا ایجادیں کیں وہ بھی اجتماعی تھیں۔ ان کا موجب

سماجی معیشی ڈھانچوں میں تفریق و امتیاز کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ تفریق کی اس صورت نے معاشرہ میں مختلف طبقات کو جنم دیا ہے جن میں سے ایک طبقہ صاحبانِ ملک کا اور دوسرا طبقہ ملکیت سے محروم محنت کرنے والوں کا ہے۔ ان طبقوں کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے مثلاً آقا و غلام، زمیندار و کاشتکار، سرمایہ دار و مزدور وغیرہ وغیرہ۔ ہر دور میں ان دو بڑے طبقوں کی تقسیم در تقسیم ایک الگ داستان ہے۔ جب ہم کسی مخصوص تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس تہذیب سے متعلق جماعت کے پیداواری عمل کو دیکھتے ہیں چنانچہ پیداواری عمل کی صورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن اس اہمیت کے باوجود کسی تہذیب کو صرف پیداواری عمل کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ پیداواری عمل کے ساتھ مختلف جغرافیائی حالات اور مختلف آب و ہوا بھی انسان کی سوچ، اس کے طرزِ احساس اور اس کے رہن سہن پر اثر انداز ہوتی ہے جس کی وجہ سے مختلف مقامات کی تہذیبوں میں یکساں پیداواری عمل کے باوجود تنوع نظر آتا ہے۔

انسانی تہذیب کے سلسلے میں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسانی تہذیب ایک معاشرتی حقیقت ہے اور اسے ہمیشہ ریاست سے ملا کر نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ ریاست معاشرتی نہیں بلکہ سیاسی حقیقت کا نام ہے۔ سبط صاحب نے اس باریک فرق کی وضاحت اپنی کتاب 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' میں بڑے بھرپور انداز سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'ریاست فقط ایک جغرافیائی یا سیاسی حقیقت ہوتی ہے اور قوم اور اسی کے واسطے سے قومی تہذیب ایک سماجی حقیقت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ریاست اور قوم کی سرحدیں ایک ہوں۔ مثلاً جرمن قوم ان دنوں دو ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہی حال کوریا اور ویت نام کا ہے۔ مگر جب ہم جرمنی، کوریا یا ویت نام کی قومی تہذیب سے بحث کریں گے تو ہمیں مشرقی اور مغربی جرمنی، جنوبی و شمالی کوریا اور جنوبی و شمالی ویت نام کو ایک تہذیبی یا قومی وحدت ماننا پڑے گا۔ دوسری بات یہ کہ ریاست کے حدود گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں مثلاً پاکستان کی سرحدیں آج وہ نہیں ہیں جو ۱۴ر اگست ۴۷ء کو تھیں مگر قوموں اور تہذیبوں کے حدود بہت مشکل سے بدلتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ بعض ریاستوں میں ایک ہی قوم آباد ہوتی

ہے جسے جاپان میں جاپانی قوم، اٹلی میں اطالوی قوم، اور فرانس میں فرانسیسی قوم، ایسی ریاستوں کو قومی ریاست کہا جاتا ہے بعض ریاستوں میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوتی ہیں جیسے کینیڈا میں برطانوی اور فرانسیسی قومیں، چیکوسلواکیہ میں چیک اور سلاف، عراق میں عرب اور کرد، سوویت یونین میں روسی اور ازبیک تاجیک وغیرہ۔ جن ملکوں میں فقط ایک قوم آباد ہوتی ہے وہاں ریاستی تہذیب اور قومی تہذیب (ایک ہی حقیقت کے) دو نام ہیں لیکن جن ملکوں میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوں وہاں ریاستی تہذیب کی تشکیل و تعمیر کا انحصار مختلف قوموں کے طرز عمل، طرز فکر اور طرز احساس کے ربط و آہنگ پر ہوتا ہے۔ اگر اتفاق اور رفاقت کی قوتوں کو فروغ ہو تو رفتہ رفتہ ایک بین قومی تہذیب تشکیل پاتی ہے اور اگر باہمی نفاق اور عداوت کا زور بڑھے، مختلف قومیں صنعت و حرفت میں، زراعت و تجارت میں، علوم و فنون میں ایک دوسرے (کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے ایک دوسرے) پر غلبہ پانے یا ایک دوسرے کا استحصال کرنے کی کوشش کریں یا ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ اگر ملک میں اعتماد کے بجائے شک و شبہ اور بدگمانی کی فضا پیدا ہو جائے تو مختلف تہذیبی اکائیوں کی سطح اونچی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان کے ملاپ سے کوئی ریاستی تہذیب ابھر کر سامنے آسکتی ہے۔'[۵]

تہذیب کے سلسلے میں ہم نے جو بحث کی ہے اور سبط صاحب کی تحریروں سے جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب خالص انسانی تخلیق ہے اور وہی اس کی تشکیل و ارتقا کا ضامن ہے۔ لیکن تہذیب کا مواد اسے پیدائشی طور پر نہیں ملتا بلکہ وہ اسے اپنے اطراف کے حالات اور اپنے تجربوں سے حاصل کرتا ہے۔ وہ تہذیبی عمل میں جبلی طور پر شریک نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کچھ اس کے اخذ و مواخذہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اخذ و مواخذہ کی یہ صلاحیت اس کی نوعی پہچان ہے، چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں 'انسان کے بغیر تہذیب کا وجود ممکن نہیں اور تہذیب کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں، تہذیب انسان کی نوعی انفرادیت ہے۔'[۶] یہی انفرادیت اس کو دوسرے

جانوروں سے نوعی اعتبار سے ممتاز کرتی ہے۔سبط صاحب جب تہذیب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ہر طرح کے آلات و اوزار سماجی اقدار کا نظام، زبان و ادب، علوم و فنون، رہن سہن، رسم و رواج، طرزِ فکر و طرز احساس ہوتا ہے۔

سبط صاحب کا خیال ہے کہ سماجی اداروں اور مختلف عقائد و افکار کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں بھی کرنا چاہیے تاکہ ان عوامل و محرکات کا سراغ مل سکے جو ان حقیقتوں کے ظہور کا سبب بنے۔اس انداز نظر کو فلسفہ تاریخ کی اصطلاح میں تاریخی ذہنیت کہتے ہیں۔یہ وہی انداز نظر ہے جس کے تحت علمائے سلف نے آیاتِ قرآنی کی شانِ نزول دریافت کی تھی اور یہ پتہ چلایا تھا کہ یہ آئتیں کب، کس موقع پر اور کس مقصد سے نازل ہوئی تھیں۔مگر تاریخ چونکہ ایک متحرک اور تغیر پذیر حقیقت ہے اور علامہ اقبال کے بقول چونکہ:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ حقیقتوں کا مطالعہ ان کے عالم حرکت و تغیر میں کریں نہ کہ عالم سکون و ثبات میں یعنی طرز معاشرت میں، سماجی اداروں میں اور عقائد و افکار میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کو نظر میں رکھیں۔سبط صاحب نے اپنے اس اندازِ نظر کی توثیق علامہ اقبال کے افکار کے حوالے سے کی ہے اور ان کے خطبات سے اقتباس پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ علامہ اقبال کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی رو سے کائنات ترقی پذیر حقیقت ہے۔اس سلسلہ میں سبطصاحب نے علامہ کے خطبات سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

'کائنات ترقی پذیر حقیقت ہے نہ کہ مکمل تخلیق جس کو اس کا خالق مدت گزری ایک بار تخلیق کر کے الگ ہو گیا اور اب وہ (کائنات) خلا میں مادہ کا بے جان ڈھیر ہے جس پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔'[۷] 'خدا کا تخلیقی عمل مسلسل جاری ہے لہٰذا ایٹموں کا شمار ممکن نہیں۔ہر لحظہ نئے ایٹم وجود میں آتے ہیں اور کائنات مسلسل بڑھتی پھیلتی رہتی ہے۔'[۸] 'کوئی شے ثابت و قائم نہیں ہے۔'[۹] 'تخلیقِ مسلسل کا تصور خالص اسلامی ہے۔'[۱۰] 'اسلام کی نظر میں زندگی کی روحانی اساس اپنے کو تغیر اور تبدیلی میں منکشف کرتی ہے۔'[۱۱] 'ماضی کا غلط احترام اور ضابطہ سازی اسلام کے داخلی نہج کے منافی ہے۔'[۱۲]

سبط حسن صاحب نے ان تمام حوالوں کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ جو لوگ فلسفۂ حرکت و تغیر اور فلسفۂ ارتقا کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں دراصل وہ اسلام اور اسلامی فکر کے ساتھ بھی زیادتی

کرتے ہیں۔

سبط صاحب کے خیال میں ریاست کا تصور کوئی مذہبی تصور نہیں ہے اور حضور نبی کریمؐ دنیا میں ریاست قائم کرنے کے لیے نہیں آئے تھے، انبیاء کا مقصد سلطنت قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگوں کی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ چند انبیا کو چھوڑ کر بیشتر انبیا کسی ریاست کے سربراہ نہیں تھے۔ جس طرح تہذیب و ثقافت انسان کی تخلیق اور ایک معاشرتی حقیقت ہے اسی طرح ریاست کا وجود بھی کوئی ازلی اور ابدی حقیقت نہیں ہے بلکہ اطراف کے حالات و کوائف کی مطابقت میں ہی اس کی تشکیل عمل میں آتی ہے اور اطراف کے حالات و کوائف کی تبدیلیوں سے اس کے تصور میں بھی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ریاست کا مقصد معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنا اور امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ جیسے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ادارے کس طرح تشکیل دیے جائیں اور صحیح معنی میں اقتدار کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ جمہوریت میں یہ اقتدار عوام کا حق ہے جو اپنی مرضی سے اپنے نمائندے چنتے ہیں اور پھر یہ نمائندے قانون بناتے ہیں جس کی روشنی میں عدلیہ اور انتظامیہ کے ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں عوام کا آزاد ہونا اور اپنی مرضی سے اپنے نمائندوں کا انتخاب کرنا ایک بنیادی شرط ہے۔ اس طرح جب یہ ادارے تشکیل پا جائیں تو عدل و انصاف کا قیام اور امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنا ان اداروں کا بنیادی فرض ہے۔ اگر یہ ادارے اپنا بنیادی فرض ادا کرنے کے بجائے استحصال کا بازار گرم کر دیں تو پھر ان کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا چنانچہ ریاست کی اقسام پر بحث کرنے کے بجائے ریاست کے مقاصد پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

سبط صاحب کا ایک اہم کارنامہ خرد افروزی، روشن خیالی اور معقول رویہ کی ترویج و اشاعت ہے۔ ہمارے معاشرہ میں سرسیّد نے عقلیت پرستی کو تحریک کی شکل دی اور علامہ اقبال نے اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا اور بتایا کہ اسلام کی روح تقلید نہیں بلکہ اجتہاد ہے اور اجتہاد معقولیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ سید سبط حسن نے بھی علامہ اقبال کی طرح حرکت و تغیر اور ارتقا کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے معقولیت ہی کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ علامہ نے اپنی بات مذہب و فلسفہ کی روشنی میں واضح کی تھی جبکہ سیّد سبط حسن نے اس حقیقت کو انسانی تاریخ، علم بشریات اور سماجی و

سائنسی علوم کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ تاریخ اور علم بشریات سبط صاحب کا خاص موضوع تھے اور انہوں نے ان موضوعات کے سلسلے میں تحقیق و جستجو کا جو طویل سفر طے کیا ہے اس کی مثال ہمارے ادیبوں میں خال خال ہی ملتی ہے۔ انہوں نے انسان، زندگی اور کائنات کو سمجھنے کے لیے ہزاروں لاکھوں سال کو آئینہ بنایا اور پھر اس آئینہ میں انسان، زندگی اور کائنات کی تصویروں کو دیکھا جو برابر بدلتی رہتی ہیں اور ہر تبدیلی کے پس پشت کچھ اسباب و محرکات بھی نظر آتے رہے ہیں۔ سبط صاحب نے ان تبدیلیوں اور ان کے اسباب سے معقولیت اور خرد افروزی کا ایک ایسا درس لیا ہے جس نے جہل اور توہم پرستی کے تمام پردے چاک کر دیئے ہیں۔

سبط صاحب کی تمام تصانیف توہم پرستی اور بے روح تقلید پرستی کے خلاف جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں 'ماضی کے مزار'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' اور 'انقلاب ایران' میں سے ہر ایک تصنیف خالص تاریخی ذہنیت کے ساتھ مطالعہ کی قابل قدر مثالیں ہیں۔ 'نوید فکر' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں تاریخ کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر بھی بڑے مؤثر انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'انقلاب ایران' میں تاریخی پس منظر کے ساتھ موجودہ صورت حال کو جس طرح اجاگر کیا گیا ہے وہ کچھ سبط صاحب ہی کا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظر و فکر کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ انقلاب ایران کے سلسلہ میں انہوں نے جن باتوں کی نشاندہی سات سال پہلے کی تھی آج وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہی حال ان کی دوسری کتابوں کا ہے جن میں تاریخ کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ہم اپنے عصر اور اپنے مسائل کی حقیقت کو بے پردہ ہوتے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف کا معاشرہ سے یہی (Relevance) انہیں معاشرہ کے لیے بامعنی بناتا ہے۔ ان کی انگریزی کتاب (Battle of Ideas) میری نظر سے نہیں گزری ہے چنانچہ اس کے بارے میں کوئی تبصرہ میرے لیے ممکن نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ تصنیف بھی ان کے مزاج سے الگ نہیں ہوگی۔

علمی و فکری جہت سے الگ سید سبط حسن کا اسلوب تحریر بھی سادگی و پُرکاری کا ایک منفرد نمونہ ہے۔ شگفتگی ان کی تحریر کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ وہ لفظوں کے استعمال میں کبھی فضول خرچی سے کام نہیں لیتے۔ ہم معنی الفاظ کی تکرار یا غیر ضروری صفات کی بھرمار سے ان کی تحریریں بالکل پاک ہیں۔ ان کی سوچ میں کسی طرح کا الجھاؤ بالکل نہیں تھا چنانچہ کم سے کم الفاظ کے باوجود ان کے بیان

میں کس طرح کی گنجلک کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے جس کی معنویت ان کی فکر اور ان کے عمل میں موجود نہ ہو۔ وہ لفظوں کو لفظی معنیٰ میں کم اور اپنے فکر و عمل کی ہم آہنگی میں زیادہ دیکھتے تھے۔ وہ لفظوں کو جاننے سے زیادہ ان کو محسوس کرنے پر توجہ دیتے تھے چنانچہ جو الفاظ ان کی تحریروں میں آجاتے تھے وہ ان کی فکر اور احساس کا حصہ بن جاتے تھے۔ سادگی، شگفتگی اور گہری معنویت کے ساتھ ان کی تحریر میں ایک کاٹ بھی تھی اور وہ اس کاٹ کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کرتے تھے، جہاں خالص حکمی بات ہوتی وہ انتہائی سنجیدگی سے کہتے لیکن جب بات کو زیادہ مؤثر بنانے کی ضرورت ہوتی تو وہ طنز کو بروئے کار لاتے جس سے ان کی تحریر کی کاٹ کا اندازہ ہوتا تھا لیکن وہ بنیادی طور پر ایک علمی اور مہذب شخصیت کے حامل تھے، چنانچہ ان کا طنز یا تحریر کی کاٹ کبھی بھی پھکو پن کی صورت اختیار نہیں کرتی تھی۔

خیر یہ سب باتیں تو ان کے علم و ادب اور فکر و خیال سے متعلق تھیں لیکن ان کی گوری رنگت، خوبصورت خدوخال، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور متناسب سڈول جسم بھی کچھ کم دلکش چیزیں نہیں تھیں۔ خوش قامتی و خوش لباسی کے ساتھ زیر لب مسکرانے کی ادا ان کے اندر موجود احساس جمال ہی کا ایک عکس تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خالی خولی دانشور ہی نہیں تھے بلکہ اپنی ذات میں یکسر عمل تھے، انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے افکار کو بسر کرنے میں صرف کی۔ مصلحت سے انہیں اللہ واسطے کا بیر تھا۔ انہوں نے اپنے اصولوں سے ہٹ کر کسی قیمت پر بھی کبھی کوئی سودا نہیں کیا۔ الغرض ہم جب بھی ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو سینہ پر ایک گھونسہ لگتا ہے اور بے اختیار میر کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حوالہ جات

۱۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے سبطِ حسن کی تصنیف 'موسیٰ سے مارکس تک' کا باب 'مارکس کا تصور بیگانگی'، کراچی: مکتبہ دانیال ۱۹۹۷ء

۲۔ سبطِ حسن 'موسیٰ سے مارکس تک'، ایضاً، ص ص ۱۹۔۱۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۔ سبطِ حسن 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، کراچی مکتبہ دانیال، ۲۰۱۵ء، ص ۲۷

۵۔ ایضاً، ص ص ۲۹۴۔۲۹۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۱

۷۔ Sir Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam,* Lahore: Shaikh Muhammad Ashraf, 1960, P.55

۸۔ ایضاً، ص ۶۸

۹۔ ایضاً، ص ۷۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص ص ۱۵۲۔۱۵۱

سبطِ حسن اور 'افکار تازہ'

بیرسٹر عبدالودود

سفید لہراتے بال، کشادہ پیشانی جو بالوں کی کمی سے اور بھی کشادگی کی طرف مائل، درمیانہ قد، چال ڈھال، گفتگو، رکھ رکھاؤ ہر زوایہ سے علمیت جھلکتی تھی اکثر انگریزی لباس زیب تن، ہاتھ میں پائپ اور تمباکو، گفتگو میں نرمی، یہ تھے سبطے صاحب، جن کو اکثر ان کے نیاز مند سبطے بھائی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

سیّد صاحب، ساری زندگی لوگوں میں شعور بیدار کرتے رہے، انہوں نے کبھی ترقی پسند فلسفہ سے روگردانی نہیں کی، جوانی میں جو آدرش اپنایا تو آخر دم تک اس سے نباہ کیا۔ وہ علم و دانش کا ایک مینارہ تھے۔ باوجود پیرانہ سالی کے جوانوں سے بڑھ چڑھ کر کاموں میں شریک رہتے۔ ۱۹۸۵ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس لندن میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ کراچی میں ہونے والی تقریبات میں وہ ذاتی طور پر منہمک تھے بلکہ وہ تو ہوئی ہی ان کی وجہ سے، اس کے وہ روحِ رواں تھے اور اسی سلسلے میں وہ ہندوستان بھی تشریف لے گئے۔

ہر میدان میں جہاں بھی شرکت کی وہ ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ خواہ وہ سیاست ہو، صحافت

سبطِ حسن صاحب کی وفات کے بعد ان کے ادبی مضامین پر مشتمل، سید جعفر احمد کی مرتبہ کتاب 'افکار تازہ' پر یہ مضمون بیرسٹر عبدالودود نے سبطِ حسن صاحب کی برسی کے موقع پر منعقدہ سیمینار میں پڑھا جو کراچی پریس کلب میں منعقد ہوا ہمارے لیے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ یہ سبطِ حسن کی کون سی برسی تھی۔ اُن کا انتقال ۱۹۸۶ء میں ہوا تھا جبکہ مذکورہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ مضمون کے آخر میں بیرسٹر صاحب نے جو تاریخ درج کی ہے وہ بہت ہلکی سیاہی میں ہونے کی بنا پر پڑھنی مشکل ہے۔ امکان غالب ہے کہ یہ مضمون ۱۹۸۹ میں سبطِ حسن صاحب کی تیسری برسی پر پڑھا گیا ہوگا (مرتب)۔

ہو، تصنیف وتالیف ہو۔ جو کام بھی اپنے ذمے لیا اس کو بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ پاکستان بننے سے قبل اور اس کے بعد ملک میں سماجی تبدیلی کے لیے کوشاں رہے اور اس جدوجہد میں جو افتادگانِ خاک کی تمناؤں، خوشیوں، خوابوں کے حصول کی جدوجہد تھی جو سنوارنے اور سنوارے جانے کی جدوجہد تھی اس کے لیے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں، متعدد مقدمے قائم ہوئے۔ قید و بند میں رہے مگر ان کے قدم کبھی ڈگمگائے نہیں، نہ معاشی سختیاں ان کو اپنے آدرش سے دور کر سکیں۔

اپنی صحافتی زندگی میں دورانِ طالب علمی ہفت روزہ 'پیام' سے متعلق رہے، بعد میں 'بمبئی کرانیکل' اور 'نیشنل ہیرالڈ'، 'قومی جنگ' اور 'پیپلز وار' میں مضامین لکھتے رہے، 'امروز'، 'پاکستان ٹائمز'، اور 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں ان کے مضامین چھپتے رہے۔ 'لیل ونہار' کے تو وہ مدیر تھے۔ ایسا ہفت روزہ تو پھر نہیں نکلا۔ جو معیار اس کا تھا انگریزی ہفت روزے بھی اس کی برابری کرنے سے قاصر تھے۔ اور جب یہ بھی فوجی آمریت کی نذر ہو گیا تو وہ 'ڈان'، 'ویو پوائنٹ' میں مضامین لکھتے رہے۔ 'پاکستانی ادب' جاری کیا۔

مگر جو اثر انہوں نے چھوڑا ہے وہ ایک مارکسی دانشور اور ادیب کا ہے اور جو فکری کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہے شاید ہی کسی اور اردو کے ادیب یا دانشور نے انجام دیا ہو۔ انہوں نے اپنے افکار ہی ورثے کے طور پر چھوڑے ہیں۔ 'شہر نگاراں'، 'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'انقلاب ایران' اور 'نوید فکر' تو ان کی زندگی میں ہی طبع ہو چکی تھیں اور بیشتر کے کئی ایک ایڈیشن بھی چھپ چکے تھے لیکن بعد از انتقال 'سخن در سخن' اور 'افکارِ تازہ' ہم کو ملیں۔

سبطے صاحب کے افکار کی تابندگی آج بھی قائم ہے اور یہ وجہ ہے کہ آج آپ کے ہاتھ میں ان کے مقالات کا مجموعہ 'سخن در سخن' کے نام سے موجود ہے۔ سبطے صاحب گو کہ ہم میں موجود نہیں مگر ان کی تحریر آج بھی ذہن کو جلا بخشنے کے لیے، سائنسی علوم کی ترویج کے لیے، مارکسی فکر کو عام کرنے کے لیے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک پھولوں کا گلدستہ ہے جو خوبصورت بھی ہے اور خوشبودار بھی۔

سبطے صاحب کی تحریریں نہ صرف ترقی پسند فکر کی آئینہ دار ہیں بلکہ ان کی ایک واضح سمت بھی ہے، ان کا انداز آسان اور دلکش ہے، زبان میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا قاری طالب علم بھی ہے مزدور بھی اور محقق بھی اور کسی کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں

ہوتی اس میں اردو داں بھی ہیں اور دوسری قومی زبانوں کے قاری بھی۔

سبطے صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا، بولتے تو کم تھے اور ان کو بلوانے کے لیے مجبور کرنا پڑتا تھا، یا پھر کوئی مجلس کا اہتمام، مگر اردو، فارسی انگریزی ادب پر ان کی نظر بڑی وقیع تھی، اقتصادیات، عمرانیات اور سیاست پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ 'ماضی کے مزار'، تو علمِ بشریات میں ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے لیے اردو دان کی ہمیشہ مرہونِ منت رہے گی۔ سماجی علوم کا مطالعہ کر کے انہوں نے مارکسی فکر کے حوالے سے اس کو مربوط کیا ہے۔

اس لیے سبطے صاحب کو یاد رکھنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم بقول ان کے اس ورثے کو عرس منانے کے لیے استعمال نہ کریں بلکہ ہم سماجی علوم کو نئے ادراک کی روشنی میں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں۔ زیرِ نظر کتاب میں سیّد صاحب نے جہاں خوبصورت اور دلنشیں زبان استعمال کی ہے وہیں اس وقت کے سماجی حالات اور رشتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ صاحبِ مضمون پر تنقید بھی کی ہے۔ سماجی محرکات سے بھی روشناس کرایا ہے اور سبطے صاحب کا ادیب بھی ان کے ساتھ رہا ہے۔ خوبصورت اشعار سے بھی نفسِ مضمون کی گل افشانی کی ہے۔

'امیر خسرو ایک عظیم تہذیبی ورثہ'

'امیر خسرو ایک عظیم تہذیبی ورثہ' کے عنوان سے اس میں مقالہ شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے جہاں امیر خسرو کی شخصیت سے آگاہی ہوتی ہے۔ وہیں اس زمانے کے سماجی اور معاشرتی حالات کی بھی بھرپور عکاسی موجود ہے۔ زبان کی چاشنی بھی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> 'امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری قرونِ وسطیٰ کے تہذیبی امتزاج کا نہایت حسین و جمیل مرقع ہے۔ وہ دیہاتی بھی تھے، درباری بھی، اور خانقاہی بھی۔ اُن کی ساری زندگی اسی مثلث کی حدود میں بسر ہوئی مگر ان کا کمال ہنر یہ ہے کہ وہ آخر عمر تک تینوں سے نباہ کرتے رہے۔ دہلی میں خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ بادشاہ تخت پر بیٹھتے اور قتل ہوتے رہے۔ نظام المشائخ بھی معتوب اور مطعون کیے جاتے رہے لیکن نہ امیر خسرو کی وابستگیوں میں فرق آیا اور نہ ان کا بال بیکا ہوا۔ کردار کی اس لچک کو آپ جس نام سے

چاہیں یاد کریں لیکن امیر خسرو نے اگر حفظِ ذات کو اصولی باتوں پر ترجیح نہ دی ہوتی تو آج شاید ان کا کلام بھی ہم تک نہ پہنچتا۔ ہندی اُن کی مادری زبان تھی۔ ترکی اور فارسی ان کو باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ سنسکرت، عربی اور پنجابی انہوں نے خود سیکھی تھی۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کا شوق ان میں نانا کی حویلی میں پیدا ہوا اور نوابوں کی بزمِ نشاط اور صوفیوں کی محفلِ سماع میں اس حد تک چمکا کہ خود راگ راگنیاں ایجاد کرنے لگے۔ ملتان، لکھنؤ، اودھ اور دکن کے دور دراز سفر نے ان کے حسی تجربات و مشاہدات میں بیش بہا اضافہ کیا۔

'اس مخلوط تہذیب کی داغ بیل، جس میں امیر خسرو نے پرورش پائی غزنویوں کے عہد میں لاہور اور ملتان میں پڑی تھی البتہ پروان چڑھی سلاطینِ دہلی کے دور میں۔ اس تہذیب کی تشکیل، ترک۔ ایرانی تہذیب اور مقامی تہذیبوں کے قوام سے ہوئی تھی۔ تہذیب کیا تھی کسی مرصع غزل کا ہیولا تھا جس کو امیر خسرو نے کاغذی پیرہن پہنایا۔

'لیکن تھی یہ شہر کے خوشحال طبقوں کی تہذیب۔ عام لوگوں تک تو اس کی تلچھٹ ہی پہنچتی تھی۔ وہ بھی چھن چھنا کر۔ امیر خسرو کے کردار کا یہ بڑا تابناک پہلو ہے کہ وہ عوام کی خوشیوں اور غموں میں بھی برابر کے شریک رہے مگر ان کے پاس وہ خالی ہاتھ نہیں بلکہ گیتوں، گانوں اور دوہوں کا تحفہ لے کر جاتے تھے۔ سات سو برس گذر چکے ہیں لیکن ان کی یہ عوامی شاعری (جس کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا) اب بھی زندہ ہے اور برصغیر کے کونے کونے میں ان کے نام کو روشن کیے ہوئے ہے۔'[۱۷]

'دورِ مشروطہ کی شاعری'

یہ مضمون سبطے صاحب نے اپنی کتاب 'انقلابِ ایران' کے لیے تحریر کیا تھا مگر کتاب کی ضخامت کے سبب شامل نہیں کیا۔ ایران میں بیداری کی لہر پیدا کرنے میں مشروطہ کی تحریک نے اہم کردار

ادا کیا ہے۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی قربانیاں دی گئیں، جد و جہد کس کس طرح جاری رہی۔ بقول سطلے صاحب 'ایرانی انقلاب سوشلسٹ انقلاب نہیں تھا۔ اور نہ یہ سماجی انقلاب تھا کہ پرانے سماجی رشتے بدل جاتے۔ یہ صرف شاہ دشمن اور سامراج دشمن سیاسی انقلاب تھا جس کا مقصد سرمایہ داری، نظام میں رہتے ہوئے ملادی اور اوپری طبقات کی حکمرانی قائم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ گذر جانے کے باوجود عام آدمی اسی طرح مشکلات میں ہے۔'

دورِ مشروطہ کی شاعری سے متعارف کراتے ہوئے سطلے صاحب لکھتے ہیں:

'مشروطہ کی تحریک میں نئی اور پرانی نسلوں کے شاعر برابر کے شریک تھے۔ شانہ بشانہ لڑے اور انہوں نے بڑا جاندار ادب تخلیق کیا...... نئی نسل کے شاعروں نے ثابت کردیا کہ جذبات میں اگر زندگی کی حرارت ہو۔ فنکار اگر اپنے حسی تجربات میں مخلص ہو اور زبان پر قدرت رکھتا ہو تو دل سے نکلی ہوئی باتیں ضرور اثر کرتی ہیں۔

دورِ مشروطہ کے شاعروں میں امیری، دہخدا، اشرف، ایرج مرزا ملک الشعرا بہار، عارف قزدینی، فرخی یزدی، ابوالقاسم لاہوتی اور عشقی نے بڑی شہرت پائی۔'[۲]

سطلے بھائی نے ایرج مرزا کا قابلِ غور تعارف پیش کیا ہے:

'ایرج مرزا نے چھ اشعار کا ایک ایسا قطعہ لکھا ہے جس کی بدولت وہ دنیائے ادب کی تاریخ میں اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک انسانی معاشرے میں ماں کا وجود باقی ہے۔ ایرج نے ماں کی تعریف میں جو اشعار لکھے ہیں ان میں نہ فلسفیانہ موشگافی ہے، نہ تخیل کی پرواز ہے اور نہ بیان کا زور بلکہ محبت اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کے حوالے سے کیا گیا ہے جن سے ہر شخص کو بچپن میں واسطہ پڑتا ہے البتہ ہم بڑے ہو کر عموماً ان تجربات کو فراموش کر دیتے ہیں حالانکہ ہمارے بچپن کا انحصار نہیں پر ہوتا ہے۔

گویند مرا چو زاد مادر | پستاں بہ دہن گرفتن آموخت
شبہا برگا ہوا رہِ من | بیدار نشست و خفتن آموخت
لب خند نہاد برلبِ من | ہر غنچۂ گل شگفتن آموخت
دستم بہ گرفت وپا بہ پابرو | تا شیوہ راہ رفتن آموخت
یک حرف دوحرف برزبانم | الفاظ نہاد و گفتن آموخت
پس ہستیٔ من زہستیٔ اوست | تا ہستم وہست دارمش دوست

(ترجمہ) کہتے ہیں کہ جب ماں نے مجھ کو جنا تو منہ سے چھاتی کو پکڑنا سکھایا راتوں کو میرے پالنے کے پاس بیٹھ بیٹھ کر جاگی اور مجھے سونا سکھایا۔ میرے ہونٹوں پر اپنے مسکراتے ہونٹ رکھے اور پھول کی کلی کو کھلنا سکھایا۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے پاؤں پاؤں لے چلی، یہاں تک کہ مجھ کو راستہ چلنا سکھایا۔ میرے منہ میں ایک حروف دوحرف کر کے الفاظ ڈالے اور مجھ کو بولنا سکھایا۔ لہٰذا میری ہستی اس کی ہستی سے ہے، جب تک زندہ رہوں گا اس کو دوست رکھوں گا۔ [۳]

سبطے صاحب اس مضمون میں ان بلند قامت ایرانی شعراء سے ہی تعارف نہیں کراتے بلکہ اس تجسس کی سلاخوں کے پیچھے جو روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں ان کی ضیاء بھی ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔

'انکار کی جرأت'

جرأتِ انکار پر اگر صرف اتنا ہی لکھا جاتا تو کافی تھا مگر اس کے پیچھے جو شخصیت سبطے صاحب نے اُجاگر کی ہے وہ پست قد ہونے کے باوجود سرو کی طرح بلند قامت تھی۔ پاکستان کے ابتدائی دور میں میاں افتخار الدین صاحب نے جو آگہی کی شمع روشن کی اور وطن میں بسنے والوں کو اچھے اور برے سے آگاہی دی وہ اس ملک میں اندھیروں کے خلاف، جبر کے خلاف جدوجہد کی تاریخ کا حصہ تھی اور سبطے صاحب کے قلم نے میاں صاحب کی جو تصویر کشی کی ہے وہ وہی کرسکتا تھا جو خود اس جدوجہد میں شریک ہو۔ کس طرح ملک کے وجود میں آتے ہی یہاں کھیل کھیلا گیا کس طرح عوام کے حقوق غصب کیے گئے اور ذاتی اور طبقاتی فائدے حاصل کیے گئے۔ شہری آزادیوں اور جمہوری

حقوق کی جس طرح پامالی ہوئی اس کے بارے میں سبطے صاحب لکھتے ہیں:

'کسی قوم کا سماجی اخلاق ایک دن میں نہیں بگڑتا۔ دیمک پہلے ایک کڑی میں لگتی ہے پھر دوسری میں اور پھر تیسری میں اور اگر روک تھام نہ کی جائے تو ایک دن پوری عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی جمہوریت اور شہری آزادی کا یہی حشر ہوا۔ ابتداء چھوٹی چھوٹی بدعنوانیوں سے ہوئی مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی اور دیمک اندر ہی اندر اپنا کام کرتی رہی۔ کالے قوانین کا نشانہ بننے والے مزدور اور کسان کارکن جب دوسری جماعتوں سے کہتے کہ آؤ ہم سب مل کر اس بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کریں تو ان کی تجویز کو یہ کہہ کر بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا کہ تم تو پاکستان کے دشمن ہو۔ تم اگر سیفٹی ایکٹ میں پکڑے جاتے ہو تو ہم سے مطلب۔ ان کو کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب تمام سیاسی جماعتوں کو پاکستان کا دشمن قرار دے دیا جائے گا۔ آئین منسوخ کر دیا جائے گا۔ اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی۔ سماجی جماعتیں خلافِ قانون قرار پائیں گی اور جلسوں جلوسوں، تقریروں اور تحریروں کی آزادی سب سے چھین لی جائے گی۔'[۴]

ہر دور میں ابن الوقت پیدا ہوتے ہیں جو ذاتی جاہ اور منصب کے لیے قدموں کی آزادی کو گروی رکھوا دیتے ہیں۔

'ہماری اطلاع تو یہ ہے کہ پروگریسو پیپرس لمیٹڈ پر قبضے کی ترکیب فیلڈ مارشل کو بعض دانشوروں نے سجھائی تھی جو ان دنوں شاہ کے مصاحب بنے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جس تلوار سے وہ پروگریسو پیپرس کا سر قلم کر دیں گے وہی تلوار ایک دن ان پر بھی چلے گی۔'[۵]

'سردار جعفری'

سردار جعفری پر سبطے صاحب کا مضمون خود اپنے اوپر خود نوشت بھی ہے اس میں آپ کو سردار جعفری

کے ساتھ بنے بھائی، مجاز، فیض، ڈاکٹر اشرف اور دوسرے جیتے جاگتے نظر آئیں گے ترقی پسند تحریک، نیا ادب، ڈاکٹر رشید جہاں کے ساتھ اور افتادگانِ خاک کی خوشیوں، غموں، آرزوؤں اور امنگوں کے لیے جدوجہد آپ کو نظر آئے گی۔ سبطے بھائی لکھتے ہیں:

'ادیب، خطیب، شاعر، افسانہ نویس، ڈرامہ نگار، نقاد، فلم ساز اور پھر ہمارے دوست علی سردار جعفری سلامت رہیں۔ ان کے فن پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں نہیں ہے البتہ جو شب و روز ہم نے کبھی سردار کی سنگت میں گذارے تھے ان کی یادوں کے چراغ ذہن کے اُفق پر کہکشاں کی مانند ہنوز روشن ہیں۔ یادش بخیر وہ بھی کیا دن تھے اور کتنے خوش قسمت ہیں ہم لوگ جنہوں نے اس تاریخ ساز دور کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اس دور کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ ان دنوں یوں محسوس ہوتا تھا گویا نئی دنیا اور نیا آدم بنانے کی اُمنگ نئے سرے سے جوان ہوئی ہے۔ ہندوستان کی نشاۃِ ثانیہ کا یہ زمانہ ہر چند کہ بہت مختصر تھا لیکن اُس نے ہم کو ایک نیا ذہن، ایک نیا آہنگِ فکر و نظر، ایک نیا جمالیاتی ذوق اور تجربات اور احساسات کو فنی سانچوں میں ڈھالنے کا نیا سلیقہ عطا کیا۔ وہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے ہمارے ادب نے رقص و موسیقی نے، گیت گانوں، فلموں اور تصویروں نے نئے سفر کا آغاز کیا۔ سردار جعفری اُسی مردم خیز عہد کی پیداوار ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں نہیں بلکہ انہوں نے اپنی حسی ریاضتوں سے ترقی پسند ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اس میں نئے معنی اور نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔[٦]

سردار جعفری سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۳۸ء میں الٰہ آباد میں ہوئی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ میں دکن سے وطن جاتے وقت لکھنؤ میں رُکا اور اپنے پرانے دوست اسرار الحق مجاز سے ملنے گیا تو وہ کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے الٰہ آباد جا رہے تھے۔ کہنے لگے تم بھی کیوں نہیں

چلتے۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور ڈاکٹر اشرف تم کو اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔
الہ آباد میں ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کی وجہ سے بائیں بازو کے بھی چوٹی کے دانشوروں کا جمگھٹا تھا۔ ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور سجاد ظہیر سب وہیں براجمان تھے۔ مجاز نے بتایا کہ سردار جعفری لکھنؤ ہی میں رہتے ہیں اور مجاز کے ساتھ مل کر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ مجاز کا مجموعہ آہنگ، سردار جعفری کی کہانیوں کا مجموعہ منزل، اور حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ انوکھی مصیبت، چھاپ چکے ہیں۔ میں نے سردار کی چند نظمیں تو پڑھی تھیں لیکن اس وقت تک یہ خبر نہ تھی کہ وہ افسانہ بھی لکھتے ہیں۔ [۷]

دراصل ان کی انوکھی شخصیت نے مجھ کو مبہوت کر دیا تھا۔ گندمی رنگ، بھرا بھرا کتابی چہرہ سر پر ریشم کے سے ملائم بالوں کا ڈھیر، انگلیوں کا رنگ تمباکو نوشی کی کثرت سے سیاہی مائل اور زرد آنکھیں منگولوں کی سی غلافی مگر بڑی بڑی اور ان میں چمک ایسی گویا دیئے روشن ہوں اور پھر ان کی گرجدار آواز جس میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ مجاز جتنے کم سخن بلکہ شرمیلے تھے سردار جعفری اتنے ہی تیز طرار اور جلد بے تکلف ہو جانے والے۔ وہ بولتے تو یوں محسوس ہوتا گویا جلسۂ عام میں تقریر کر رہے ہوں۔

رات کے وقت یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ وہاں سردار جعفری نے اپنی نظم بغاوت بڑے گھن گرج سے پڑھی۔ ان دنوں وہ شعر ترنم سے پڑھتے تھے۔ ترنم کی لٹھ گھماتے تھے مگر ان کی پاٹ دار آواز سے ہال کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ نظم طلباء کی ذہنی کیفیت کے عین مطابق تھی لہٰذا شاعر کو ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی تھی۔ [۸]

دوسری جنگِ عظیم سر پر کھڑی تھی جس وقت مجاز، سردار جعفری اور میں نے مل کر ماہنامہ 'نیا ادب' اور ہفت روزہ 'پرچم' لکھنؤ سے جاری کیا۔ اسپین میں جمہوریت کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ جنرل فرانکو نے ہٹلر اور مسولینی کی

فوجی مدد سے اپنی فاشسٹ حکومت قائم کرلی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فاشسٹ نواز حکومتوں نے چیکوسلوالیہ کو ہٹلر کے حوالے کردیا تھا اور سب ہی مغربی طاقتوں کی کوشش تھی کہ نازی لٹیروں کا رخ کسی صورت سوویت یونین کی جانب پھیر دیا جائے۔[9]

'نیا ادب' کی مجلسِ ادارت میں یوں تو مجاز بھی تھے اور میرا نام بھی شامل تھا مگر پرچے کے روحِ رواں دراصل سردار جعفری تھے......'[10]

'نئی بربریت کا پیمانہ امروز و فردا'

تھامس مان پر مضمون ہے مگر کس طرح سے وہ بربریت پر تنقید کرتے ہیں کس طرح لوگوں کے ذہنوں کو اس کے بہیمانہ رول سے آگاہ کرتے ہیں:

'یہ نئی بربریت کچھ ایسی نئی بھی نہیں۔ جب بھی نئے نظریہ حیات، کسی نئی فکر نے مروجہ خیال کی راہوں سے انحراف کیا ہے۔ جب بھی دونوں میں تصادم ہوا ہے۔ تو برسرِاقتدار نظریے کے حامیوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ عسکری صاحب نے یورپ کی آزادخیالی کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ مگر خود اس روایت کو قائم کرنے والوں پر کیا گذری تھی۔ کتنا خون بہا۔ کتنی جانیں تلف ہوئیں۔ کتنے گھر اجڑے۔ ادیبوں اور فنکاروں پر کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ کیسی کیسی قربانیاں انہوں نے دیں، اپنی نئی تہذیبی قدروں کی خاطر، تب جاکر یورپ میں آزاد خیالی کی روایت پائیدار ہوئی۔ مگر یہ پائیداری بھی فقط اعتباری تھی۔ چنانچہ جب کبھی کوئی شدید سماجی بحران آیا تو آزادخیالی کی دیوی کا مندر سنسان ہوگیا۔ کیا پہلی جنگ عظیم میں رومان رولاں کو اس وجہ سے فرانس سے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ میں پناہ نہیں لینی پڑی کہ وہ جنگ کا مخالف تھا۔ کیا مشہور فلسفی برٹرنڈ رسل کو قید نہیں کیا گیا تھا؟[11]

یہ بربریت ہر جگہ ایک نئے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہٹلر کتابیں جلاتا

تھا۔ انگریز اپنے مقبوضات میں ادیبوں اور فنکاروں کو جیل بھجواتا تھا اور اب بھی اسی پالیسی پر کاربند ہے۔ بعض اوقات ادبی رسالے بھی اس عتاب کی زد میں آجاتے تھے۔ خود اپنے ملک کا جائزہ لیجیے ادیبوں کو اور ان کی ادبی تخلیقات کو ادب کے معیار پر نہیں جانچا جاتا بلکہ معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ 'غالب کے طرفدار' ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو فیض ہوں یا ندیم، عسکری ہوں یا ابراہیم جلیس ان کی آواز ریڈیو اسٹیشن سے بھی نہیں سنی جاسکتی۔ [۱۲]

تھامس مان یورپی تہذیب کا مداح بھی تھا اور مزاج داں بھی۔ ترجمان بھی تھا اور نقاد بھی اپنی تہذیب سے محبت بھی کرتا تھا اور اس کی خامیوں اور خرابیوں پر بھی نظر رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ان ناولوں اور افسانوں میں اگر یورپ کے اونچے طبقے کی مدقوق اور مرتی ہوئی تہذیب کے نمائندوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، ان کے جذبات اور احساسات کی ہلکی سے ہلکی لہر اور ان کے کردار اور عمل کی خفیف حرکت کو مسحور کن حقیقت نگاری کے دام میں گرفتار کیا ہے۔ [۱۳]

سبطے صاحب روزولٹ کے مرنے کے بعد امریکہ کے سامراجی رول کے نتیجے میں جو تبدیلیاں آئیں اور کس طرح وہاں سامراج کے مفادات کی مطابقت میں روشن خیال ادیبوں اور ان کے افکار کو رد کر دیا۔ اس کی طرف قاری کی توجہ دلاتے ہیں۔

تھامس مان یورپ سے بیزار ہو کر امریکہ گیا تھا۔ وہ زمانہ امریکی جمہوریت کے فروغ کا زمانہ تھا۔ روزولٹ کا زمانہ تھا۔ لیکن روزولٹ کے بعد تو امریکہ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جیسے ساری قوم دیوانی ہوگئی ہو۔ جس بربریت نے اُسے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی کتابوں کو آگ لگائی تھی۔ اس کا حق شہریت چھینا تھا۔ وہ اب زیادہ شدت سے امریکہ پر مسلط تھی۔ ہٹلر اس بربریت کو 'قومی اشتراکیت' کہتا تھا۔ امریکہ میں اس کا

نام 'آزاد جمہوریت' پڑ گیا تھا۔ تھامس مان جن چیزوں کو تہذیب کے منافی خیال کرتا تھا امریکہ میں وہ سب ایک ایک کر کے نمودار ہوئیں۔

'امریکہ میں تہذیب اگر دم توڑ رہی تھی تو یورپ میں تہذیب نئے روپ میں نمودار ہو رہی تھی، اس پرندکی مانند جو آگ میں جل کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔[۱۴]

مگر تھامس مان اپنی زندگی کا 'رخ متعین کر چکا تھا۔' اس نے ایک اور قدم اٹھایا۔ امن کمیٹی کی اپیل پر دستخط کر دیئے۔ مگر امن چاہنے والوں کو امریکہ کبھی معاف نہیں کر سکتا کیونکہ امن پسندی تو کمیونسٹوں کا جال ہے اور تھامس مان اس جال میں پھنس گیا۔ جس طرح ژاں پال سارتر اس جال میں پھنس گیا۔ اور برٹرنڈ رسل اور جولیو کیوری۔ تھامس مان کے لیے امریکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا۔[۱۵]

نئی بربریت کی علامت یہ ہے کہ جب تک آپ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں وہ آپ کا دامن موتیوں سے بھرتی رہے گی۔ آپ کو اپنا نجات دہندہ بھی تسلیم کرنے سے گریز نہ کرے گی۔ البتہ جہاں آپ نے نکتہ چینی کی یا آزاد خیالی کا ثبوت دیا خواہ آپ کی باتوں میں کتنی ہی صداقت کیوں نہ ہو اور کتنی ہی نیک نیتی اور خلوص سے آپ نے یہ باتیں کیوں نہ کہی ہوں آپ رد کر دیئے جائیں گے۔ نئی بربریت کے نقادوں نے تھامس مان۔ ژاں پال سارتر اور برٹرنڈ رسل کے افکار اور ادب کو نہ پہلے جمالیاتی قدروں کی روشنی میں جانچا تھا اور نہ اب جانچتے ہیں۔ جماعتی اور طبقاتی مفاد پہلے بھی ان کا پیمانہ تھا اور اب بھی ہے اور کتنا شکستہ اور ناپائیدار ہے۔ پیمانۂ امروز و فردا۔'[۱۶]

اس مجموعے میں مضامین تو تیرہ کے قریب ہیں اور ہر مضمون اپنی جگہ پر مغز، آپ پڑھتے جائیے اور جی نہیں بھرے گا۔

منشی پریم چند پر مضمون، کسان اور آزادی و دیہی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

جوش صاحب پر مضمون، شاعر انقلاب سے بغض وعناد رکھنے والوں کو کھلا جواب ہے ہر مضمون پڑھتے جایئے اور قد آور شخصیت تناور شخصیت بن کر قاری کو مسحور کر لیتی ہے۔ 'داغ کی شخصیت اور شاعری' پر تو مضمون اس قدر خوبصورت ہے کہ اس کو کئی بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ شخصیت بھی ابھر کر آجاتی ہے اور دلی کی بربادی بھی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس زمانے کے سماجی حالات، سیاسی، معاشرتی رکھ رکھاؤ بھی۔ ایک محقق کی طرح سبطے صاحب نے یہ مضمون لکھا اور اس قدر بھرپور مضمون داغ پر میری نظر سے نہیں گذرا۔ خاصے کی چیز ہے۔ پڑھ کر ہی لطف لیا جاسکتا ہے۔

ایک جگہ زباں بندی کا ذکر کرتے ہوئے سبطے صاحب نے داغ کا ایک شعر تحریر کیا ہے۔

لب بند، نفس بند، دہن بند، زباں بند — ہے قہر اگر اب بھی، نہ ہو رازِ نہاں بند

سبطے صاحب لکھتے ہیں 'داغ نے اس پر آشوب زمانے کا نقشہ بڑی سچائی، بڑی فنی چابکدستی، اور بڑے جوش سے کھینچا ہے اور اگر ادب روحِ عصر کا آئینہ ہے اور ادیب اپنے عہد کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے تو داغ کا کلام بلاشبہ اس دور کے آلام ومصائب کی بولتی تصویر۔' [۱۷]

علامہ نیاز فتح پوری اور حریت فکر' پر مضمون میں وہ اظہارِ خیال کی آزادی، سائنسی علوم کے پھیلاؤ کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> 'نیاز فتح پوری کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے ہماری نئی نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں سے ہماری فکر کا افق وسیع ہوا اور ہم لوگوں میں جن کو بچپن سے ہاں کہنے اور اقرار کرنے کی تعلیم دی گئی تھی سوال کرنے کی جرأت پیدا ہوئی جو حریتِ فکر کا حرفِ آغاز ہے۔' [۱۸]

فراق صاحب پر تو مضمون فراق صاحب کا ہم سے آمنے سامنے تعارف ہی نہیں کراتا بلکہ خود سبطے بھائی کا بھی تعارف کراتا ہے۔

سبطے صاحب لکھتے ہیں:

> 'باتوں کی کہکشاں اُفق تا افق پھیلی رہتی تھی۔ باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور بات سے بات پیدا کرنا ان کو خوب آتا تھا۔ مگر ان کو گوئٹے کی طرح کوئی ایکر مان نہ ملا۔ نہ ڈاکٹر جانسن کی مانند کوئی باسؔ ویل جو ان کی

باتوں کو قلم بند کرتا۔ افسوس کہ یہ بصیرت افروز باتیں ہوا کی لہروں میں کھو گئیں۔'[19]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور عسکری صاحب کی جدیدیت پر مضامین Polimical ہیں وہ ان حضرات کے اُٹھائے ہوئے سوالوں اور اعتراضات کا جواب علم و منطق سے دیتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے لیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو پر اعتراضات کے جواب میں جو دلائل انہوں نے دیئے ہیں اس سے 'لذت پسندی'، 'عریانی برائے عریانی' کے پیروکاروں اور سماجی پستیوں کو آشکار کرنے والوں کے درمیان جو حد ہے وہ پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے میں شاہ لطیف کی شاعری پر بھی مضمون شامل ہے جو نہ صرف سندھ کی اس دھرتی، کے محبوب شاعر پر ایک فکر انگیز تحریر ہے بلکہ سماجی تعلقات، آپس کے تضادات، وابستگیوں کے ٹکراؤ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ وہ شاہ صاحب کی سندھ سے محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'شاہ عبداللطیف سندھی تہذیب کا نقطۂ عروج ہیں۔ ان کے کلام میں سندھ کی روح تڑپتی ہے۔ سندھ کا دل دھڑکتا ہے۔ سندھ کی زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ شاہ لطیف کو یہاں کے ٹیلوں، پہاڑوں، ندی نالوں، جھاڑیوں اور جنگلوں بے آب و گیاہ ریگستانوں، جھیلوں اور تالابوں سے اتنا پیار تھا کہ شاید ہی کسی داستان کا ایک صفحہ ایسا ہو جس میں سرزمین سندھ کے گن نہ گائے گئے ہوں...... (اور یہ) شاہ لطیف کی انسان دوستی کا ثبوت ہے۔'[20]

یہ وہی محسوس کر سکتا ہے جس کو خود بھی اپنی دھرتی سے پیار ہو جو اس کے دکھ، اس کی چبھن، اس کی تکلیفوں سے واقف ہو جس کو اس میں بسنے والوں کے مصائب و مشکلات کا اندازہ ہو اور پھر سبطے بھائی تو ان کے حل سے بھی واقف تھے اور تا حیات وہ ان دکھوں، تکلیفوں، مصائب اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

وہ تو عالم باعمل تھے۔ اور بقول سیّد جعفر احمد کے جب بھی کبھی پاکستان کی تہذیبی تاریخ لکھی جائے گی اور اس میں روشن خیالی و سائنسی اندازِ فکر کی جہت پر تحقیق ہوگی تو یہ سبطے صاحب کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگی۔

حوالہ جات

۱۔ 'امیر خسرو۔ ایک عظیم تہذیبی ورثہ'، 'افکارِ تازہ'، مرتب: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، کراچی: مکتبۂ دانیال، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص ص ۱۸۔۱۷

۲۔ 'دورِ مشروطہ کی شاعری'، ایضاً، ص ص ۸۶۔۸۵

۳۔ ایضاً، ص ص ۹۳۔۹۲

۴۔ ایضاً، ص ص ۲۰۷۔۲۰۶

۵۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۶۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۳۷

۸۔ ایضاً، ص ص ۲۳۸۔۲۳۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۱۱۔ ایضاً، ص ص ۱۸۳۔۱۸۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۱۳۔ ایضاً، ۱۸۷

۱۴۔ ایضاً، ص ص ۱۸۹۔۱۸۸

۱۵۔ ایضاً، ص ص ۱۹۱۔۱۹۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۱۷۔ ایضاً، ص ص ۷۶۔۷۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۳

سبطِ حسن

شہزاد منظر

سیّد سبطِ حسن کے انتقال کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت مصنف کیا تھے، یعنی مستقبل میں انہیں کس حیثیت سے یاد کیا جائے گا؟ جو لوگ بہت سی حیثیتوں کے مالک ہوتے ہیں، ان کی اصل حیثیت کے بارے میں فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ سیّد سبطِ حسن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ سیاست داں بھی تھے اور دانشور بھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مورّخ بھی تھے اور نظریہ داں بھی، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر کیا تھے؟ اگر ان کے کیریئر اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو وہ صرف اور صرف صحافی اور مورّخ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے ان دونوں شعبوں میں زیادہ عرصے تک اور ٹھوس کام کیا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی انہیں ادیب ثابت کرنا چاہے تو وہ بھی بہت آسانی سے ثابت کر سکتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے کافی تعداد میں ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ 'نیا ادب' جیسا معیاری اور تاریخ ساز جریدہ شائع کیا ہے اور ترقی پسند ادبی تحریک کو منظّم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایسی صورت میں سیّد سبطِ حسن کو کسی ایک صنف یا شعبے تک محدود رکھنا بہت مشکل ہے۔ وہ بیک وقت بہت کچھ تھے اور انہوں نے ہر شعبے میں اپنی شخصیت اور اپنی بے پناہ قابلیت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی مثال اگر کسی سے دی جا سکتی ہے تو وہ ابوالکلام آزاد جیسی ہمہ جہت شخصیت ہے، جو سیّد سبطِ حسن کی طرح بیک وقت بہت کچھ تھے۔ اس مضمون کا مقصد صرف ان کے ادبی

یہ مضمون ٹورنٹو (کینیڈا) سے شائع ہونے والے ادبی جریدہ 'اردو انٹرنیشنل' میں شائع ہوا (مرتب)۔

کارناموں پر روشنی ڈالنا ہے اس لیے میں اپنی بحث صرف ان کے ادبی کام تک محدود رکھوں گا۔

سبطِ حسن کا ابتدا سے شعروادب سے گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ اگرچہ اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کے لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا، وہ لکھنؤ، جو عرصہ دراز تک مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تھا اور جو اس صدی کی تیسری دہائی تک اہم ادبی، تہذیبی اور ثقافتی مرکز رہا۔ سبطِ حسن کے اعظم گڑھ اور علی گڑھ میں تعلیم کے دوران اس دور کے نہایت ذہین اور باذوق طلبا سے گہرا رابطہ قائم ہو چکا تھا، جو بعد میں برصغیر کے اہم اور ممتاز ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور کہلائے۔ ان کے اس دور کے احباب میں اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، اسرار الحق مجاز اور علی سردار جعفری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ دور اردو ادب اور برصغیر کے مسلمانوں کا نہایت زرّیں دور تھا، جس میں بڑے بڑے عظمٰی پیدا ہوئے۔ اسی دور میں پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی، جس نے اردو ادب کا رخ موڑ دیا۔ علی گڑھ کی تعلیم کے دوران ہی وہ ترقی پسند اور بائیں بازو کے ادبی اور سیاسی افکار سے متعارف ہوئے اور اردو کے ان نوجوان ترقی پسند ادیبوں میں شامل ہو گئے، جنہوں نے بعد میں 'نیا ادب' جیسا اہم اور معیاری جریدہ شائع کیا، جو اردو کا پہلا ترقی پسند جریدہ تھا اور جس کا دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں شہرہ ہو گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں ان کے رفقاء، مثلاً اسرار الحق مجاز اور علی سردار جعفری شاعر کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کے مالک تھے اور سبطِ حسن اس وقت تک بحیثیت ادیب منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اس کے باوجود ان کی غیر معمولی قابلیت کے پیشِ نظر 'نیا ادب' کی ادارت کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی اور انہوں نے بڑی صلاحیت کے ساتھ اس جریدے کو شائع کیا۔ سبطِ حسن بڑے روشن خیال اور وسیع المشرب شخص تھے اور اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں کو بھی برداشت کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے 'نیا ادب' میں محمد حسن عسکری کا وہ مشہور اور متنازعہ افسانہ 'پھسلن' شائع کیا جسے ماہنامہ 'ساقی' کے مدیر اور صاحبِ طرز ادیب شاہد احمد دہلوی نے بڑی تعریف کے باوجود شائع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ یہ وہی شاہد احمد دہلوی ہیں جو بعد میں ان کے دوست بن گئے اور وہ ان کے مضامین بڑے اشتیاق سے شائع کرتے رہے۔ یہ نئے طرز کے ادب کے منظرِ عام پر آنے کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک 'نیا ادب' اور ترقی پسند ادب کے مابین فرق پیدا نہیں ہوا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جا رہا تھا۔ یوں تو 'انگارے' کی اشاعت کے بعد سے ہی جدید ادیبوں کے خلاف

قدامت پسند حلقوں کی مہم شروع ہو چکی تھی اور ان پر فحش نگاری اشتراکیت کے پروپیگنڈے اور نظم آزاد جیسی قبیح صنفِ شاعری کو فروغ دینے کا الزام لگایا جا رہا تھا لیکن اس صدی کی چوتھی دہائی میں نئے اور ترقی پسند ادب کے خلاف اس مہم نے شدت اختیار کر لی تھی۔ 'عالمگیر'، 'خیام'، 'دین دنیا' حتیٰ کہ نیاز فتح پوری کے 'نگار' تک نے اس کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا اس مہم میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں اثر لکھنوی اور علی اختر تلہری وغیرہ شامل تھے۔ اس دور میں کوئی ایسا جریدہ نہیں تھا جس میں نئے ادب کے خلاف مضامین شائع نہیں ہو رہے تھے۔ اس دور میں 'نیا ادب' کے سوا ترقی پسند ادیبوں کے پاس اپنا کوئی جریدہ نہیں تھا، البتہ 'ساقی'، 'ادبی دنیا' اور 'ادبِ لطیف' ایسے جریدے تھے جو نئے طرز کا ادب شائع کر رہے تھے۔ اس دور میں ترقی پسندوں کے علاوہ 'ساقی' میں محمد حسن عسکری اپنے کالم 'جھلکیاں' میں قدامت پسند ادبی حلقوں کے اعتراضات کا پلٹ کر جواب دے رہے تھے۔ ایسے دور میں نئے اور ترقی پسند ادب کے خلاف علی اختر تلہری نے 'مداوا' کے نام سے مخالفانہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا، جس میں جدید ادیبوں پر شدید اعتراضات کیے گئے تھے۔ اس کتاب کا ادبی حلقوں میں بڑا چرچا رہا اور کئی سال تک ادبی جریدوں میں اس کی حمایت اور مخالفت میں بحث و مباحثہ جاری رہا۔ سبطِ حسن 'نیا ادب' میں ترقی پسند ادب کی وضاحت میں کئی مضامین شائع کر چکے تھے، لیکن قدامت پسند حلقوں کے اس حملے کا جواب دینا ضروری تھا چنانچہ وہ سجاد ظہیر کی معیت میں قدامت پسند ادبی حلقوں کے خلاف لڑتے رہے۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیّد سبطِ حسن حیدرآباد دکن چلے گئے اور قاضی عبدالغفار کے اخبار 'پیام' سے وابستہ ہو گئے۔ حیدرآباد میں ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا اور وہ صحافت کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی گہرے طور پر وابستہ رہے۔ اس دور کے بارے میں انہوں نے 'شہرِ نگاراں' کے نام سے بہت ہی خوب صورت یادداشت لکھی ہے۔ حیدرآباد میں ان کا اصلی کارنامہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل ہے۔ سیّد سبطِ حسن نے اس دوران بہت کم لکھا اور اپنا زیادہ تر وقت صحافت اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے تنظیمی کاموں میں صرف کیا۔ سیّد سبطِ حسن کو عام طور پر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، جو غلط ہے۔ ان کا ترقی پسند تحریک سے براہِ راست تعلق تو لکھنؤ کے قیام میں ہی ہو چکا تھا لیکن انہوں نے حیدرآباد میں انجمن کی بنیاد سجاد ظہیر کے ایما پر ڈالی۔ اس کام میں ان کے ساتھ جن ادیبوں نے تعاون کیا ان میں مخدوم محی الدین،

مسلم ضیائی، نظر حیدرآبادی اور ابراہیم جلیس وغیرہ شامل ہیں۔ مخدوم، سبطِ حسن کے خاص دوستوں میں سے تھے، ان دونوں نے ریاست حیدرآباد میں ایک ایسے دور میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کا چراغ روشن کیا جب دیسی ریاستوں میں جاگیردارانہ ظلم واستبداد اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور جہاں سیاسی سرگرمی یا آزادئ تحریر وتقریر کا دور دور تک نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ ریاست حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی خودمختار ریاست تھی چنانچہ وہاں یہ نظام نہایت پختہ بنیادوں پر قائم تھا۔ ایسی جگہ ترقی پسند ادبی تحریک کو فروغ دینا اور بائیں بازو اور انقلابی خیالات کے حامی آدمیوں کو منظم کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ انہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا اور ترقی پسند مصنّفین کی بڑی بڑی کانفرنسیں اسی ریاست میں منعقد کیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران سیّد سبطِ حسن بمبئی آ گئے اور اخبارات سے وابستہ رہنے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تنقیدی نشستوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ یہ دوران کے مطالعے اور صحافتی اور سیاسی عمل میں حصہ لینے کا دور ہے۔ ان کی زندگی کا تیسرا اور سب سے اہم دور پاکستان میں شروع ہوا اور میاں افتخارالدین کے ہفت روزہ 'لیل ونہار' کے اجراء کے بعد انہوں نے اردو صحافت کو ایک نئے طرز کے ہفت روزہ سے متعارف کرایا جو بلاشبہ دنیا کے کسی بھی ملک کے ہفت روزہ کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہفت روزہ 'لیل ونہار' کی ایک بڑی خصوصیت اس کا ادبی مزاج بھی ہے۔ اس میں اردو کے صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات اشاعت کی غرض سے بھیجنا اعزاز تصور کیا۔ ایوب خان کے دور میں 'لیل ونہار' کی ملازمت سے برطرفی اور دو سال تک لکھنے کی آزادی سے محروم کردیئے جانے کے بعد سیّد سبطِ حسن نے بڑی صعوبت کی زندگی بسر کی۔ لاہور سے کراچی منتقل ہونے کے بعد انہیں قدرے آسودگی نصیب ہوئی اور انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت تصنیف وتالیف میں صرف کیا۔ اس دوران انہوں نے 'ماضی کے مزار'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، 'انقلابِ ایران'، 'کارل مارکس'، اور 'نویدِ فکر' جیسی خالص علمی اور فکری تصانیف پیش کیں۔ یہ وہ تصانیف ہیں، جن کا تاریخ اور علمِ بشریات سے تعلق ہے اور جس میں انہوں نے تاریخ وتہذیب کی مارکسی نقطۂ نظر سے تعبیر کی ہے۔ ان تصانیف کا اگرچہ ادب سے براہِ راست تعلق نہیں ہے لیکن ان کا ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی سے گہرا تعلق ہے اور ان کی روشنی میں ہمیں اپنے معاشرے، اپنی

تہذیب اور ادب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔
انتقال سے تقریباً دس سال قبل سیّد سبطِ حسن نے 'پاکستانی ادب' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو ایک سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ یہ ماہنامہ اردو کے ادبی رسائل میں اس اعتبار سے منفرد تھا کہ اس میں اردو کے علاوہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ادب کو بہت اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا اور اس ماہنامہ کا اپنا خاص مزاج تھا۔ 'پاکستانی ادب' مزاج کے اعتبار سے اگرچہ ترقی پسند رجحان کا حامل تھا، لیکن اس میں مختلف مکتبِ فکر کے ادباء بھی لکھتے تھے اس سے سیّد سبطِ حسن کی وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کے نزدیک وسیع المشربی کا مطلب نظریے کے معاملے میں مخالفین سے مصالحت نہ تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے 'ادب میں کمٹ منٹ کا سوال' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ 'پاکستانی ادب' میں اشاعت کی غرض سے دیا تھا، جو انہیں بہت پسند آیا لیکن انہیں اس کے آخری حصے پر شدید اعتراض تھا۔ میں نے کمٹ منٹ سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ادیب کو نظریے سے تو کمٹ منٹ کرنا چاہیے، لیکن سیاسی جماعت سے نہیں، اس لیے کہ سیاسی جماعتیں اپنی ضرورت اور حکمتِ علمی کے تحت اپنی پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں، جبکہ ادیب ہر لمحہ اپنی کمٹ منٹ نہیں بدلتا، علاوہ ازیں ادیب سیاسی جماعت میں شامل ہو کر اس کے سیاسی اور فکری ضبط و نظم کا پابند اور آزادانہ فکر و عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔ سیّد سبطِ حسن کو میرے اس موقف سے شدید اختلاف تھا، چنانچہ طویل بحث و مباحثے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ کو مقالے کے جن حصوں سے اختلاف ہے آپ انہیں حذف کر دیجیے چنانچہ انہوں نے وہ مقالہ قطع و برید کے بعد شائع کیا۔ وہ ان مدیروں میں سے تھے جو مصنف سے اختلافِ رائے کی صورت میں اس سے مشورہ کیے بغیر ایک سطر بھی حذف نہیں کرتے تھے۔ اس سے ان کی صحافتی دیانت داری اور ضابطۂ اخلاق کی پابندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں 'پاکستانی ادب' بہت عزیز تھا اور وہ اسے ہر حال میں جاری رکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ اس بات سے پریشان تھے کہ ادارتی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کی تصنیف و تالیف کے کام میں بہت حرج ہو رہا ہے، جسے وہ ہرگز برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی شخص 'پاکستانی ادب' کی ذمہ داری سنبھال لے اور انہیں پڑھنے اور لکھنے کے کام کے لیے آزاد چھوڑ دے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے علمی کاموں کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔
سیّد سبطِ حسن نے اپنی مستقل تصانیف کے علاوہ شعر و ادب سے متعلق متفرق تنقیدی مضامین

بھی تحریر کیے ہیں جو آج بھی مختلف رسالوں میں منتشر ہیں اور مجموعے کی صورت میں شائع نہ ہونے کے باعث ان کی تنقید نگاری سے بحث کرنے میں دشواری درپیش ہے۔ اس کے باوجود میں اس مضمون میں ان کے ایک انتہائی اہم اور متنازع فیہ مقالے سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس نے اپنے زمانے میں بڑا ہنگامہ برپا کیا تھا اور اقبال پرست اور ترقی پسند مخالف حلقوں نے اس کی بنا پر ترقی پسند ادیبوں پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ یہ ان کا مقالہ 'فلسفۂ شاہین' ہے جو پہلی بار ۱۹۳۰ء میں روز نامہ 'پیام' حیدر آباد میں شائع ہوا اور پھر 'نیا ادب' لکھنؤ میں نقل کیا گیا۔

اقبالؔ ترقی پسند ادیبوں کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسندوں کو اقبالؔ کی تفہیم اور انہیں مکمل طور پر قبول کرنے میں نظریاتی دشواریاں حائل رہی ہیں اس لیے کہ اقبال خود ایک مفکر شاعر تھے اور ان کی شاعری کا بڑا حصہ مابعد الطبعیات پر مبنی تھا۔ اقبال کی شاعری میں بیک وقت کئی متضاد اثرات و رجحانات نظر آتے ہیں۔ وہ قوم پرست بھی تھے اور شریعتِ اسلامی کے سرگرم مبلغ بھی، وہ جزوی طور پر اشتراکیت سے بھی متاثر تھے اور نیٹشے کے نظریۂ مافوق البشر سے بھی۔ ان تمام باتوں نے اقبالؔ کے ضمن میں ترقی پسند ادیبوں کو عرصۂ دراز تک ذہنی الجھن اور تذبذب میں مبتلا رکھا اور وہ اقبال کو کبھی رد اور کبھی قبول کرتے رہے، اس کی ایک وجہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی عہد میں کلیہ پرستی تھی، یعنی ترقی پسند ناقد پہلے کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں کوئی کلیہ یا مفروضہ وضع کر لیتے تھے۔ اور پھر اس کو ثابت کرنے کے لیے اس کی تخلیقات سے چن چن کر مثالیں پیش کرتے تھے۔ تنقید نگاری میں کلیہ پرستی صرف ترقی پسندوں کی ہی خصوصیت نہیں تھی۔ یہ رجحان ہر دور میں پایا گیا ہے اور غیر ترقی پسند ادیبوں میں بھی عام ہے۔ اس کا مظاہرہ عمرِ خیام کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے اکثر ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند نقاد اقبال کو اشتراکی اور اسلام پسند نقاد اقبال کو شاعرِ اسلام ثابت کرتے رہے ہیں۔ سوال اقبالؔ کو اشتراکی یا اسلام پسند ثابت کرنے کا نہیں۔ سوال اقبال کی مکمل تفہیم، تحسین اور تعبیر کا ہے۔ سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اقبالؔ کو بعض ناقدین جزوی طور پر قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بری طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

ترقی پسند ناقدین میں دو ناقد ایسے تھے جنھوں نے سب سے پہلے اقبالؔ پر ان کی قوت پرستی اور فسطائیت نوازی کے باعث کڑی نکتہ چینی کی۔ یہ ناقد اختر حسین رائے پوری اور سیّد سبطِ حسن تھے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے تنقیدی مقالے 'ادب اور زندگی' (مطبوعہ سہ ماہی 'اردو'

حیدرآباد، دکن ۱۹۳۵ء) اور سیّد سبطِ حسن نے اپنے مقالے 'فلسفۂ شاہین' (مطبوعہ روزنامہ 'پیام' حیدرآباد ۱۹۳۷ء) میں پہلی بار اقبال کے فسطائیت پسند رجحان کا سراغ لگایا اور اختر حسین رائے پوری نے تو واضح طور پر اقبال کو فاشسٹ قرار دیا۔ اس لیے سیّد سبطِ حسن کے مقالے سے بحث کرنے سے قبل اس دور کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اقبال کے بارے میں سیّد سبطِ حسن کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اختر حسین رائے پوری اور سیّد سبطِ حسن نے جب اقبال کے بارے میں قلم اٹھایا تو یہ وہ دور تھا جب ہٹلر کی نازی پارٹی جرمنی میں برسرِ اقتدار آ چکی تھی اور دنیا میں فاشزم اور جنگ کے گھنے بادل تیزی کے ساتھ چھا رہے تھے اور فاشزم بطور فلسفہ بعض ممالک میں تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا تھا۔ ہندوستان جیسے غلام ملک میں ہٹلر اور مسولینی کی شخصیتوں میں اس لیے بھی بڑی کشش محسوس ہو رہی تھی کہ ان دونوں نے اپنی اپنی مغلوب اور شکست خوردہ قوموں کو نہ صرف متحد و منظم کیا تھا بلکہ ان میں قوم پرستی کی نئی روح بھی پھونک دی تھی، چنانچہ غلام ہندوستان کا دانشور طبقہ ابتدا میں ان دونوں سے گہرے طور پر متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال نے مسولینی پر نظمیں لکھیں اور اقبال نے تو نیٹشے کے نظریۂ مافوق البشر سے اپنے مردِ مومن اور فلسفہ شاہین کا تصور تک مستعار لیا۔ اس سے ہر شخص واقف ہے کہ ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد نازی جرمنی میں بربریت کا وحشت ناک دور شروع ہوا، جس کے مظالم سے مہذب دنیا کانپ اٹھی۔ عین اس زمانے میں اختر حسین رائے پوری اور سیّد سبطِ حسن اشتراکیت کے فلسفے سے متاثر ہوئے اور روس میں اس کی عملی تعبیر سے گہرا اثر قبول کیا۔ اس دور کے بارے میں بحث کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ اس وقت تک اردو تنقید نے پاؤں پاؤں چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ حالؔی کے دور سے اگرچہ تنقید نگاری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ لیکن اردو میں فکری اور نظریاتی تنقید نگاری کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ اختر حسین رائے پوری پہلے نقاد تھے جنھوں نے مارکسزم کی بنیاد پر شعر و ادب کو پرکھنا شروع کیا تھا اور ٹیگور اور اقبال کے افکار و اشعار کے مطالعے سے مخصوص نتیجہ اخذ کیا تھا جو اگر آج خام نظر آتا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، لیکن یہ مقالہ جس وقت شائع ہوا تھا اس وقت اردو ادب میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے برملا اعلان کیا کہ:

'وہ (اقبال) اسلام کے نام پر ایک تصورِ عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی

رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری Neo Capitalism کے سوا کچھ نہیں ہے___ وطنیت کا مخالف ہوتے ہوئے بھی اقبال قومیت کا اس طرح قائل ہے، جس طرح مسولینی۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی۔ فاشسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے___ سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو مٹا کر نظامِ معاشی کو از سرِ نو قائم کرنے کے لیے اقبال ایک تصورِ عالم پیش کرتا ہے، لیکن ایک بین الاقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین الاقوامی طبقہ نہیں، بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اقبال کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے۔ اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاشسیت میں دیکھ کر وہ جوش میں آ جاتا ہے___ مختصر یہ کہ اقبال اسلامی فاشسٹ ہے اور اس کا ردِ عمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ہندو فاشزم کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔'[1]

اس مقالے کو شائع ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے۔ اس دوران اقبال کے بارے میں اختر حسین رائے پوری کے خیالات میں کافی تبدیلی آ چکی ہے، جس کا انہوں نے اپنی یادداشت 'گردِ راہ' میں اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

'اس وقت جب یہ مقالہ تحریر کیا تھا میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی (اقبال کی) شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اقرار کروں۔ غمِ دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا۔'[2]

میں نے اقبال کے بارے میں سبطِ حسن کے مقالے سے بحث کرتے ہوئے اختر حسین رائے پوری نے اس لیے بحث کی کہ سبطِ حسن نے بھی اپنے مضمون 'فلسفۂ شاہین' میں اقبال کو

فاشسٹ تو نہیں البتہ فرد پرست اور قوت پسند قرار دیا تھا اور اقبال کے بارے میں اختر حسین رائے پوری اور سبطِ حسن کا اندازِ فکر یکساں تھا تاہم اقبال کے بارے میں ان کا لب ولہجہ اختر حسین رائے پوری کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ اور علمی تھا۔ سبطِ حسن اپنے زیرِ بحث مقالے میں لکھتے ہیں:

'اقبال کے اس فلسفۂ خودی کا لازمی اور منطقی نتیجہ فرد پرستی ہے___ اقبال شخصیت پرست ہے، تحریک پرست نہیں۔ اسی وجہ سے اقبال اقتدار پرست ہے اور دیوانگی کی حد تک اقتدار پرست۔ وہ ہر قوت کا استقبال کرتا ہے۔ ہر صاحبِ اختیار سے متاثر ہوتا ہے۔ قوت واقتدار کی مدح سرائی اس کی شاعری کا اضطراری پہلو ہے اور اس دُھن میں وہ تحقیق وجستجو اور عقل وتمیز کو بھی خیر باد کہہ دیتا ہے۔ اس لیے وہ موسولینی کی تعریف کرتا ہے___ شاہین کا فلسفہ اسی اقتدار پرستی کا منطقی نتیجہ ہے، جس کی تلقین اقبال نے یورپ کے آخری سفر اور موسولینی سے ملاقات کے بعد شروع کی۔ اس سے پہلے یورپ میں کہیں شاہین کے فلسفہ کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ شاہین نے انسانی زندگی کی حقیقت کا روپ بھرا تھا۔

اقبال یورپ کی تین شخصیتوں سے بہت متاثر ہوا ہے۔ نیٹشے، برگساں اور سوریل اور ان کے نظریوں کے نقوش اقبال کے کلام میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو 'جنگل کے قانون' کے قائل تھے۔ بہت دن تک ان کے نظریات نے کہیں حقیقت کا جامہ نہیں پہنا۔ ۱۹۲۳ء میں جب اٹلی میں فاشزم راج قائم ہوا تو ان کی مرادیں پوری ہوئیں___ اقبال کو یقین ہونے لگا کہ انسان کی بقا اور ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ نیٹشے، برگساں اور سوریل کے نظریوں پر عمل کرے۔ اٹلی میں فاشزم کی کامیابی اور دوسرے ملکوں میں فاشزم کی بڑھتی ہوئی قوت نے اقبال کے رہے سہے شکوک بھی دور کر دیئے___ اقبال نے غیر ارادی طور پر بلا سمجھے بوجھے شاہین کو اپنا محبوب پرند نہیں بنایا ہے

اس نے شاہین، باز اور عقاب کو جان بوجھ کر چنا ہے کیونکہ ان میں وہ

خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اقبال کے مکمل انسان (سپر مین) میں ہونی چاہئیں۔ اقبال ان پرندوں کو اس وجہ سے نہیں پسند کرتا کہ وہ خوش رنگ، خوش گلو، امن پرست اور تعمیر پسند ہیں بلکہ اس وجہ سے پسند کرتا ہے کہ وہ مجاہد ہیں۔ جابر و قہار ہیں۔ بلندی کی طرف جاتے ہیں۔ کسی سے خوف نہیں کھاتے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو مردِ کامل میں ہونی چاہئیں۔' [۳]

سبطِ حسن اس کے بعد سوال کرتے ہیں۔ 'کیا بیسویں صدی کا مردِ کامل ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا انسان کی روحانی اور مادّی آزادی اور ترقی فلسفۂ شاہین کی مرہونِ منت ہوگی؟' جیسا کہ میں نے اس سے قبل لکھا ہے ترقی پسندوں میں اقبال کی تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا اپنا نظریاتی کمٹ منٹ اور تعصب ہے جو انہیں اقبال کو مکمل طور پر قبول کرنے سے روکتا ہے۔ آج یہ تسلیم کرنے میں قطعی تامل نہیں کرنا چاہیے کہ پچاس سال گزر جانے کے بعد ہم اس ضمن میں خواہ کوئی بھی تاویل کیوں نہ پیش کریں، یہ حقیقت ہے کہ ابتدا میں ترقی پسندوں سے اقبال کی تفہیم میں کوتاہی ہوئی۔ اس کی وجہ، جیسا کہ اختر حسین رائے پوری نے اعتراف کیا ہے، اقبال کا جزوی مطالعہ اور مفروضہ سازی تھی اور جس کے باعث ترقی پسند اقبال کی شاعری کو معروضی طور پر پرکھ نہ سکے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ترقی پسندوں نے اقبال کے سلسلے میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور اقبال کا ازسرِنو مطالعہ کر کے اپنے مؤقف پر نظرِ ثانی کی، سبطِ حسن کو بھی احساس تھا کہ ترقی پسندوں کی جانب سے اقبال کی تفہیم میں غلطی ہوئی ہے، چنانچہ انہوں نے ایک پینل انٹرویو میں (جسے محمد علی صدیقی، مظہر جمیل اور مسلم شمیم نے لیا تھا) اقبال سے بحث کرتے ہوئے کہا:

'اقبال کے ہاں تغیر، ارتقا اور حرکت کا جو تصور ہے وہ انتہائی انقلابی اور زندگی سے بھرپور ہے۔ اسی طرح ان کا انسان کا جو تصور ہے وہ بھی مشرق کے مروجہ تصورات کے مقابل بالکل نیا ہے اور اس سے قبل صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ مشرق کے دوسرے مذاہب میں بھی ارتقا کا کوئی تصور تھا ہی نہیں۔ چاہے وہ ہندوازم ہو یا بدھ مت یا عیسائیت۔ سارے ہی مذاہب میں انسان کی ارضی زندگی کو کسی نہ کسی صورت زوال کا نتیجہ قرار دیا گیا یعنی وہ آدم کو جنت سے نکالے جانے کا تصور ہے۔ نافرمانی کی پاداش اور گناہ کے

کفارے کے طور پر تو یہ دراصل انسان کے زوال کی داستان ہے اور اسے Fall of Man...... سے تعبیر بھی کیا جاتا ہے، ہے۔ اسی طرح ہندوازم میں یہ زندگی کلجگ ہے جو انسان اپنی سزا کے طور پر بھوگ رہا ہے۔ ابتدا میں ست یگ تھا۔ انسان کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ انسان کے بارے میں یہ تصور مشرق میں بھی تھا اور مغرب میں بھی اور اٹھارویں صدی سے پہلے تو مجھے کسی فلسفے اور فکری نظام میں انسانی زندگی کے بارے میں ارتقا اور ترقی کا وہ تصور نہیں ملتا جو اٹھارویں صدی کے بعد عام ہوا۔ اب آپ اس نقطہ نظر سے اپنے ادب کو دیکھ لیجیے۔ وہاں ترقی کا تصور نہیں ملے گا۔ بس زوال ہی زوال ہے۔ غالب تک کے ہاں دیکھیے وہ کہتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اب آپ اس سارے پس منظر میں اقبال کے تصورِ بشر کو دیکھیے۔ کہتے ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

دیکھیے اقبال نے فکر پر کیسا روشن دریچہ کھول دیا ہے۔ اب تک جو انسان گناہ کی پاداش بھگت رہا تھا، اقبال نے اسے وجہِ تخلیقِ کائنات قرار دے دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب میں Progress کا تصور اٹھارویں صدی کے بعد تیزی سے مقبول ہونا شروع ہو گیا تھا، لیکن اقبال سے پہلے ہمارے ہاں اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اقبال نے ان تمام جدید تصورات سے ہمارے فکروادب کو متعارف کروایا اور جس کمال، خوبی، ہنرمندی اور فن کاری سے انہیں شعری قالب میں ڈھالا ہے وہ بجائے خود بے مثال ہے، بلکہ مجھے معاف رکھیں میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ترقی پسند شاعری اپنی تمام توانائی، دلکشی، نموپذیری اور حقیقت آفرینی کے باوجود ملوکیت، سرمایہ داری، سامراج اور محنت پر جو کچھ اقبال نے لکھ دیا ہے اس کے پاسنگ برابر ایک نظم بھی اپنے ہاں سے پیش نہیں کر سکتی۔ اقبال نے اصل میں اس میکنزم کو

سمجھ لیا تھا جس کے ذریعے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج میں محنت کش کا استحصال ہوتا ہے۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں قدرِ فاضل کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں کا content انتہائی طاقتور اور حقیقت پسندانہ رہا ہے اور اس content کے اظہار کے لیے انہوں نے جو پیکر تراشے ہیں وہ بھی اتنے ہی دلکش ہیں ورنہ اقبال کی شاعری بھی تاثیر سے عاری رہ جاتی۔ ابھی تک اقبال کے امکانات اور اثرات کو صحیح طور پر دریافت نہیں کیا گیا ہے اور انہیں متنازع موشگافیوں میں الجھا دیا گیا ہے۔ ہم تو اقبال کو ان کے سارے تضادات کے ساتھ اپنا ہی شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں جو خوبیاں ہیں وہ ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں۔ چلئے ان کی شاعری کا مابعد الطبعیاتی حصہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہ ہو تو نہ ہو جیسے بنیاد پرستوں کے لیے ان کا تصورِ کائنات، تصورِ انسان اور تصورِ مذہب قابلِ قبول نہیں ہے تو اس سے اقبال کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔''[۴]

حوالہ جات

۱۔ اختر حسین رائے پوری، 'ادب اور زندگی' مشمولہ سہ ماہی 'اردو' ایڈیٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دہلی، جولائی ۱۹۳۵۔

۲۔ اختر حسین رائے پوری، ''گرد راہ'' کراچی مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء، ص ۸۵

۳۔ سید سبط حسن 'فلسفۂ شاہین' روزنامہ 'پیام' حیدر آباد دکن، ۱۹۳۷ء

۴۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد، 'ادب اور روشن خیالی'، انٹرویو۔ا، کراچی مکتبۂ دانیال ۲۰۱۶ء، ص ص ۱۵۸۔۱۵۶

سیّد سبطِ حسن کا اسلوبِ نگارش

مظہر جمیل

سیّد سبط حسن اردو کی نان فکشنل Non Fictional نثر نگاری میں ایک منفرد اسلوب نگارش کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت اور پہلو دار رہی ہے۔ ترقی پسند دانشور اور مفکر کی حیثیت سے وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھے، ملک کی بہتری میں عملی دلچسپی کے پیش نظر وہ وطن عزیز کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلیوں کے خواہش مند بھی تھے، کبھی ایک سرگرم کارکن کے کردار میں محنت کشوں کی طبقاتی جدو جہد میں شامل نظر آتے ہیں تو کبھی عامل صحافی کے طور پر اقوام متحدہ میں رپورٹنگ کرتے اور امریکہ میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے دکھائی دیتے ہیں، 'لیل ونہار' اور 'پاکستانی ادب' کے صفحات میں ان کے اداریے ایک علیحدہ موضوع ہیں۔ خواہ ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے بین الاقوامی کانفرنسوں کا اہتمام ہو یا کوئی اور تہذیبی و سیاسی اجتماع، وہ ہر جگہ روشن خیالی کی مشعل لیے، علم و شعور اور منطق و دلیل کی وکالت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کتنے ہی روپ تھے، اور وہ ہر روپ میں ایک پیکر خوبی تھے۔ وہ بہت کچھ تھے لیکن بنیادی طور پر ایک مارکسی عالم اور روشن خیال ترقی پسند دانشور تھے، ان کے مزاج میں کٹ حجتی، ملائیت یا ادعائیت کا شائبہ بھی نہ تھا کہ ان کا علم محض شوق مطالعہ کا حاصل یا دفع وقتی کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے مارکسی فلسفہ کو ایک سائنس کی طرح پڑھا، اور صدیوں پر پھیلے ہوئے انسانی تجربات کی تاریخ کی روشنی میں پرکھا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ

یہ مضمون 'طلوعِ افکار' (کراچی) کے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شامل ہوا (مرتب)۔

افکار و اقدار انسانوں کے باہمی روابط اور معاشرتی رشتوں کے جدلیاتی واسطوں سے وجود پاتے اور منسوخ ہوتے رہتے ہیں، نہ کہ افراد کی شخصی سوچ سے قائم بالذات ہوتے ہیں۔ خیال پرستی تصوریت یا عینیت کو وہ نقش برآب جانتے تھے۔ وقت ان کے ہاں رواں دواں استعارہ ہے او تبدیلئ عالم موجودات کے جملہ مظاہر کا مقدر، وہ اسباب وعمل کی دنیا میں انسان اور اس کے امکانات کو سب سے اہم اور قادر عنصر جانتے تھے، چنانچہ ان کے نزدیک انسانی شعور زندگی کا پرتو ہوتا ہے جس میں تبدیل ہونے اور تبدیل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ تاریخ کو معاشرتی انسان کی اجتماعی اُمنگوں، خواہشوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کی روئیداد سمجھتے تھے۔ انہوں نے مختلف مدرسہ ہائے فکر کے تقابلی مطالعہ کی روشنی میں یہ جانا تھا کہ پیداواری وسائل پر اجتماعی ملکیت کا فلسفہ ہی دراصل معاشرتی انصاف اور خیر کا موجب ہوتا ہے کہ اس کے تحت ہی مٹھی بھر مراعات یافتہ افراد اور طبقات کے جارحانہ استحصال کا سدباب ممکن ہوسکتا ہے جو صدیوں سے محنت کش اور تخلیقی طبقات کے خلاف جاری ہے۔ مارکسزم کے اصول اسی فلسفہ کا حاصل ہیں۔ جبکہ ان کی عملی صورت گری معروضی حالات، تاریخی روابط، معاشی و معاشرتی تقاضوں اور مختلف طبقات کی باہمی آویزش کی مرہون منت ہوتی ہے، اور اسی لیے اس فکری نظام کے ایک سے زائد ماڈلز (Models) ماضی میں بھی موجود رہے ہیں اور آئندہ بھی وجود پاتے رہیں گے۔ سبط صاحب علم، تحقیق، تلاش، جستجو، تجربے، تجزیئے، استدلال اور استدراک کے عمل سے گزرے بغیر کسی بات کو قبول کر لینے کے قائل ہی نہیں تھے، خاص طور پر کسی ایسے دعوے کو جس کی بنیاد محض خیال، گمان، واہمے، روایت اور تصور پر قائم رہی ہو، ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد ہی مارکسی دانش ان کی فکر بلکہ شخصیت کا حصہ بن سکی تھی۔

سبط حسن صاحب نے اپنی ستر بہتر سالہ زندگی میں سے کم وبیش پچاس پچپن سال انتہائی سرگرم پرجوش اور مصروف گزارے ہیں، انہوں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، اُسے گویا انتہائے کمال پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ دوسرے درجہ کا کوئی کام انہیں پسند خاطر نہ ہوا، خواہ وہ اپنا ہو یا کسی اور کا۔ خود تنقیدی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ جس نے انہیں اکملیت پسند Perfectionist بنا دیا تھا۔

یہ ساری صفات وکمالات اپنی جگہ خوب تھے لیکن سبط صاحب کا اصل اور اہم کارنامہ ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا وہ گنجینۂ معنی ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس سالوں میں رقم فرمایا

ہے۔انہوں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۸۶ء کی درمیانی مدت میں یکے بعد دیگرے آٹھ بہت اہم، وقیع اور ضخیم کتابیں ('شہر نگاراں'، 'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'انقلاب ایران'، 'نوید فکر'، 'پاکستان میں افکار کی جنگ' اور 'سخن در سخن') پیش کر کے اردو ادب کے گوشوارے خاص کر نان فکشنل نثری ادب کے میزانیہ کو انتہائی معتبر بنا دیا ہے۔ سبط صاحب کی یہ گراں قدر تصنیفات اور ان درجنوں منتشر مضامین سے جو مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے ہیں اردو ادب میں خرد افروزی، روشن خیالی، عقلیت پسندی، سائنسی و تحقیقی رویے، استدلالی تجزیے اور ترقی پسند فکری رجحات کی روایت کو ایک مضبوط فکری بنیاد فراہم کرنے کا سبب بنے ہیں۔ انہوں نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا تھا، ان پر اس سے قبل کوئی قابل ذکر مواد موجود نہ تھا۔ ۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک نے شعر و ادب اور فکر و فن کے جملہ مظاہر پر جہانِ تازہ کے دریچے بیشک وا کر دیئے تھے اور اردو نثر نگاری کو بھی بلاشبہ نئے امکانات سے روشن کر دیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر نئے علوم کے رواج اور سائنسی معلومات کی تشہیر و اشاعت کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ اور اُردو نثر کے ذخیرے میں فلسفے، سائنس، تعلیم، تحقیق، تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، تمدن، ثقافت سیاسیات، معاشیات، نفسیات، جنسیات، ارضیات، طبعیات، حیاتیات، شماریات، کیمیا اور دوسرے بے شمار جدید علوم کے ان گنت مضامین داخل ہو چکے تھے لیکن ان مثبت اور بے مثال اثرات کے باوصف یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے افسانوی نثر کے دامن کو تکنیک و مواد کے اعتبار سے یقیناً دل کش اور پہلو دار تجربات سے جگمگایا اور اُردو افسانے، ناول، ڈرامے، رپورتاژ، سفرنامے وغیرہ کو رنگارنگ اسالیب کی سوغات بخشی لیکن اس کے مقابلہ میں ان کی توجہ غیر افسانوی نثر (Non Fictional) یا علمی نثر نگاری کی طرف کم ہی رہی ہے۔ ہاں شاعری اور فکشن کی دنیا سے باہر ترقی پسند ادیبوں کا سب سے بڑا اور اہم کنٹری بیوشن (Contribution) جدید ادبی تنقید ہے، لیکن اس نثر کا دائرہ کار ادبی تخلیقات افکار اور تہذیبی رویوں کی تفہیم ہی رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہوا تو کچھ سماجیاتی، اقتصادی، تہذیبی، تاریخی اور جمالیاتی حوالے آ گئے ہیں اور وہ بھی ادبی فن پاروں یا فن کاروں کے حوالے اور تعلق سے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں سائنسی، تاریخی معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور فلسفیانہ مسائل پر ترقی پسند فکر و دانش کی روشنی میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ محض چند تحریریں منتشر انداز میں اِدھر اُدھر مل جاتی ہیں اور بس،

ہاں سیاسی نکتۂ نظر سے لکھی جانے والی تحریروں کی کوئی کمی نہیں اور نہ وقتی تقاضوں یا درسی ضرورتوں کے تحت وجود پانے والے ذخیرے سے اغماض ممکن ہے، اس صورتِ حال میں سبط حسن صاحب نے انسان کی معاشرتی تاریخ، عمرانیات، تہذیبی ارتقا، بشریات (Anthropology)، فکری تشکیلات، افکار و عقائد کی جنگ، خیالی دانشوروں کے مغالطوں کی اصلیت جیسے نئے اور اہم موضوعات پر قلم اٹھا کر اردو نثر کی کم مائیگی کا ازالہ کر دیا ہے۔ انہوں نے ہمیں معاشرتی اداروں کی شکست و ریخت، سماجی اقدار کی تجدید، ترمیم اور تنسیخ، سیاسی، اقتصادی، مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی اصولوں کے محرکات اور نتائج، زمین اور فطرت کے بخشندہ خزانوں پر انسانی تصرفات، آلات پیداوار کی عہد بہ عہد تبدیلی کے اثرات، انسانی رشتوں کی تہہ داریاں، سائنسی ترقی کے اسباب و عوامل، تجارت و صنعت و حرفت کے عروج اور اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی مسائل و حالات سے ان کے تعلق، فنونِ لطیفہ پر معاصرانہ صورتِ حال کے اثرات، فکر و دانش کے ارتقاء کی مادی وجوہ اور ان کی عہد بہ عہد تبدیلیاں، قدیم انسانی تہذیب کے آثار کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش، غاروں، گپھاؤں اور کھنڈرات میں قدیم انسانی نقوش کی معنی آفرینی، انسانی واہموں، مغالطوں اور مفروضوں کی کہانیاں ایسے دلچسپ انداز میں سنائی ہیں کہ وہی خشک موضوعات جن پر لکھنے والے قلم اُٹھاتے ہوئے جھجکتے ہیں اور پڑھنے والے عدم دلچسپی کا اظہار کیا کرتے ہیں، جب سبط صاحب کے قلم سے نکلے تو قبول عام کی انتہائی منزلوں کو چھو آئے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی ہی کہ ان کی کتابوں کے ہر سال متعدد ایڈیشن شائع ہوتے چلے جاتے ہیں اور قارئین کا حلقہ لہر بہ لہر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سبط صاحب کی کتابوں کا علمی و فکری مواد تو یقیناً ان کے عمیق و وسیع مطالعے مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے اور ان پر اہلِ فکر و دانش اظہارِ خیال فرماتے ہی رہیں گے، ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کونسا اندازِ نگارش اور پیرایۂ اظہار ہے، جس کے ذریعہ سبط صاحب نے ایسے دقیق خشک اور مشکل موضوعات کو ایک اوسط قاری کے لیے بھی پسندیدہ بنا دیا ہے۔

سبط صاحب کے اسلوب نگارش کا جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو میں رائج چند نثری اسالیب خصوصاً نان فکشنل نثری اسالیب پر سرسری نظر ڈال لیں۔ اردو میں نان فکشنل نثر نگاری کی روایت بہت زیادہ پرانی نہیں ہے، صرف دو سو سال قبل تک تو اردو نثر نگاری کی جملہ اصناف پر محض مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کی ارزانی، عبارت آرائی کا شوق اور

آرائش تحریر کے جملہ لوازم نثر نگاری کی بنیادی خوبصورتی تصور کئے جاتے تھے۔ غرض 'لفظوں کے طوطا مینا اُڑانے کی جو پھبتی محمد حسین آزاد پر چست کی گئی تھی وہ دراصل ان سے ماقبل عہد کے نثری اسالیب پر زیادہ صادق آتی ہے۔ سترہویں اٹھارویں صدی تک اردو نثر نگاری میں جو اسالیب رائج تھے ان میں ایک اسلوب تو وہی تھا جس کی نمائندگی کے لیے 'سب رس' کا نام لیا جاسکتا ہے یعنی دکنی انداز نگارش، لیکن یہ انداز تحریر شمالی ہند میں وہ پذیرائی حاصل نہ کر سکا، جو شاعری میں ولی دکنی کے دیوان کو نصیب ہوئی تھی اور مرورِ زمانہ سے متروک ٹھہرا۔ دوسرا اسلوب ہمیں انشاء اللہ خاں انشاء کی نثری تحریروں میں ملتا ہے جو ہندی، سنسکرت اور برج بھاشا کے طرز نگارش کی پیروی میں عربی و فارسی کے مستعار الفاظ سے شعوری اجتناب کی کوشش سے عبارت تھا۔ لیکن اس اسلوب کے اثرات بھی محدود ہی رہے۔ دراصل مروجہ اسلوب عام وہی تھا جس میں عربی و فارسی اور ترکی الفاظ، استعارات اور روزمرہ کی بھرمار ہوتی تھی، اور اردو جملے کی ساخت، فارسی جملے کی ساخت پر قائم کی جاتی تھی بلکہ یوں لگتا تھا گویا لکھنے والا فارسی اور عربی میں سوچ سوچ کر اپنے مستعار خیالات کا مستعار انداز میں اظہار کر رہا ہو۔ اسی پس منظر میں فورٹ ولیم کالج کی نثری کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں مروجہ اسلوب سے گریز کی سعی نظر آتی ہے اور بول چال کی زبان اور محاورے کا چلن شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ان تمام اسالیب میں عبارت آرائی اور خیال آفرینی کا غلبہ رہا ہے اور ان میں بیشتر افسانوی رنگ بھی نمایاں ہوتا تھا۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت سرسیّد اور ان کے رفقاء کو جو گلہ اردو شاعری میں تنوع کی کمی اور اظہار کی یکسانیت سے رہا تھا، اس سے کہیں زیادہ شکوہ اردو نثر کی تہہ دامنی اور مصنوعی پن کے باب میں بھی رہا۔ البتہ 'تہذیب الاخلاق' کے اجرا کے بعد صورت حال میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور نثر لکھنے والے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے لگے اور آہستہ آہستہ نفسِ مضمون کی ادائیگی کو اسلوبِ نگارش پر فوقیت دینے کا احساس پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ محمد حسین آزاد کی 'نیرنگِ خیال' پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

> "نظم میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، وہ اس قدر محدود ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور جو خیالات ان الفاظ کے ذریعہ ادا کیے جاتے ہیں، وہ چند معمولی فرسودہ اور بوسیدہ مضامین کے سوا کچھ نہیں، نثر میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے، وہ ان ہی دس بارہ برسوں میں ہوئی ہے لیکن زیادہ تر اس کا

پھیلاؤ عرض وطول میں ہوا ہے، ارتفاع میں وہ ویسی ہی پست ہے، جیسے
ہمارے مکانوں کے تلیچے۔'[1]

سرسید اوران کے ساتھیوں کو اردوادب (نظم ونثر) کے مروجہ رجحان میں جو کج روی نظر آتی تھی، وہ دراصل معروضیت، مقصدیت اور حقیقت نگاری کے فقدان اور منطق واستدلال کے نہ ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جب وہ اردوادب کے منصب کو غیر اخلاقی گردانتے تھے تو اصل میں شعروادب کے بےسمت ہونے کے شاکی تھے۔'تہذیب الاخلاق' کا اجرا جدید اردونثر کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ تھا، جس نے اردونثر کو کھلے میدان میں لاکھڑا کیا تھا۔ اب اس میں جدید مضامین کی ادائیگی پیدا ہو چلی تھی۔ چنانچہ اس باب میں 'تہذیب الاخلاق' کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے سرسیّد نے لکھا تھا:

'جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردوادب کی ترقی میں ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ کوشش کی، مضمون کی ادا میں، ایک سیدھا سادھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی، الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی، رنگین عبارت سے جو تشبیہیں اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہیں اور جس سے شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا، تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اُٹھایا، جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کی ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'[2]

ہر چند جدید نثر کے فروغ میں سرسید اور ان کے رفقاء کی کاوشیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں لیکن جیسا کہ خود مولانا شبلی نے اعتراف کیا ہے۔'اردو انشاء پردازی کا جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔' سرسید اور ان کے تمام رفقاء کے انداز نگارش کو ایک ہی اسلوب قرار دینا یقیناً درست نہ ہوگا کہ خود سرسید کی مختلف دور کی تحریریں مختلف انداز نگارش رکھتی ہیں اور حالی کا اسلوب بیان، شبلی سے، محمد حسین آزاد کا ڈپٹی نذیر احمد سے نمایاں طور پر مختلف رہا ہے لیکن ان سب کی تحریروں میں غیر ضروری سجاوٹ، بناوٹ اور آرائش سے

گریز کا مشترکہ رجحان غالب رہا ہے اور عبارت آرائی سے زیادہ نفسِ مضمون کی ادائیگی پر اصرار بھی، وہ سب کے سب اس بات کے قائل تھے کہ تحریر کو زیادہ سے زیادہ صاف اور مقصد کے تابع رکھا جانا چاہیے۔ گویا سرسید اسکول کا نثری اسلوب اَبلاغ اور افادی مقصدیت سے عبارت تھا۔ بعد کے دور میں ایک طرف مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ نے اور دوسری جانب علی گڑھ، جامعہ ملیہ، ندوہ اور دہلی کالج کے نثر نگاروں نے جدید نثر کے امکانات کو وسیع کیا معنوی اعتبار سے بھی اور وسیلۂ اظہار کے طور پر بھی۔ اس دور میں سرسید کے چھوڑے ہوئے اثرات کی توسیع تو یقیناً ہوئی لیکن ساتھ ہی انداز نگارش میں جذبے اور تخیل کی کارفرمائی کو مناسب حد تک بحال کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاں نظر آنے والے کھردرے پن اور بلند آہنگی میں بھی خوش گوار کمی آئی۔ اب اردو نثر ہر قسم کے مسائل، موضوعات اور مضامین کی ادائیگی کی اہل تھی، جدید علوم سے وابستہ سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات اردو میں جذب ہونا شروع ہو چکی تھیں اور جو ایک انداز تھا فارسی جملے کی ساخت پر اردو جملے کی عمارت اُٹھانے کا وہ بھی قطعی طور پر متروک ہو چکا تھا، ہاں اس کی جگہ کہیں کہیں مغربی افکار اور انداز تحریر جھلکنے لگا تھا اور بعض لکھنے والوں کے ہاں جن کا رجحان مغربی افکار اور ادب کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتا تھا، اردو جملہ انگریزی اسٹائل کی نقالی میں لکھا جانے لگا اور وہی بات جو فارسی کے باب میں پہلے کہی گئی ہے ان کے ہاں ملنے لگی یعنی جیسے کہ انگریزی میں سوچے ہوئے خیالات اردو میں منتقل ہو رہے ہوں۔ ان اسالیب کے علی الرغم ایک اسلوب نگارش وہ بھی ہے جسے ہم رومانی نثر کا نام دے سکتے ہیں اور جس کے تحت مہدی الافادی، سجاد حیدر، مولانا ابوالکلام آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جن کے طرزِ تحریر پر افسانوی رنگ حاوی تھا۔

۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک نے شاعری و فکشن کے باہر اردو ادب کو جو نہایت اہم اور قابلِ ذکر تحفہ بخشا ہے وہ ہے جدید ادبی و سماجی تنقید۔ اس سے قبل ادبی اور سماجیاتی تنقید ایک علیحدہ صنف کی حیثیت نہیں رکھتی تھی، جدید ناقدین نے اس کو نہ صرف ایک مضبوط صنفِ ادب بلکہ دبستان کا درجہ دے دیا۔ اس میں ترقی پسندوں کی کاوشیں دوسرے لوگوں کے مقابل یقیناً بہت ممتاز ہیں۔ لیکن ادبی تنقید کا دائرہ کار ادب پاروں اور ادبی رویوں کی تشریح و تفہیم تک محدود رہا ہے۔ ان تحریروں کا موضوع بنیادی طور پر ادب ہی ہے۔ جہاں کہیں سماجی، سیاسی، معاشی، اخلاقی، تہذیبی حوالے

آتے بھی ہیں تو وہ ادبی اور جمالیاتی اقدار کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ اکثر جدید علوم کی روشنی بھی ادبی تناظر ہی کو اُبھارنے کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے۔ نان فکشن اردو نثر میں ترقی پسند ادبی تنقید ایک بہت اہم اور وقیع ذخیرہ ہے جس میں مختلف اسالیب نثر کے رنگ نظر آتے ہیں لیکن بہ اعتبار مجموعی یہ ایک علیحدہ دھارا ہے جس کی اپنی اصطلاحات ہیں، اپنا انداز ہے اور اپنا آہنگ ہے لیکن وہ موضوعات جن پر سبط حسن صاحب نے قلم اُٹھایا، ان کی سماجی ادبی تنقید کے مخصوص اور محدود دائرہ کار میں ممکن نہ تھی اور نہ ادبی تنقید کی زبان، اسٹائل اور اسلوب سبط صاحب کے لیے بہت زیادہ کارآمد ہوسکتے تھے، چنانچہ جب انہوں نے علم بشریات Anthropology کے حوالے سے قدیم انسانی معاشروں کے ارتقاء کی کہانی سنانی شروع کی، قدیم تہذیبوں پر گزشتنی وارداتوں کا احوال رقم کرنا چاہا، اور افکار وعقائد کی اصل سرگزشت بیان کرنا شروع کیا تو انہیں اپنا اسلوب خود تراشنا پڑا، جو بیک وقت دلکش وجاذب بھی ہے، آسان ورواں بھی، سادہ وپرکار بھی، صاف وشستہ بھی اور انتہائی درجہ اثر انگیز طاقتور اور مدلل بھی۔ انہوں نے اپنے سیدھے سادھے اسلوب کے دامن میں اتنے دقیق اور مشکل موضوعات کو جس آسانی سے سمیٹا ہے یہ بجائے خود ایک علمی وفنی کارنامہ ہے جس کا جائزہ یقیناً تفصیل طلب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ سبط حسن صاحب کی تصنیف 'شہر نگاراں' پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں انہوں نے حیدرآباد دکن کے قیام کی بعض یادداشتوں کو تازہ کیا ہے ویسے اس سے قبل ایک کتاب حبشہ کے حالات کے متعلق ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور سبط حسن صاحب نے مشترکہ طور پر ترتیب دی تھی جواب نایاب ہے۔ یہ محض اپنی جوانی کے گزرے ہوئے چند دنوں کی یاد تازہ کرنے کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ دکن میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کا بھرپور رپورتاژ بھی ہے، اس میں مولوی عبدالحق، مخدوم محی الدین، قاضی عبدالغفار، فانی بدایونی، ابوالخیر مودودی، مسز سروجنی نائیڈو، مرزا ظفر الحسن اور بہت سے دوسرے اہم اور غیر اہم افراد کے قلمی خاکے بھی ہیں، ادبی محفلوں، معرکوں، مباحثوں کی ایسی دلچسپ روداد بھی ہے کہ کہانی کا گمان ہوتا ہے، آصف جاہی خاندان اور دربار کی بوالعجبیوں کا ایسا واشگاف احوال بھلا اور کہاں دیکھا جاسکتا ہے، یادیں عموماً اپنی ہی ذات کے گرد گھومتی ہیں اور حزنیہ کیفیت لیے ہوئے ہوتی ہیں لیکن 'شہر نگاراں' ایک عہد اور ایک خالص جاگیردارانہ تہذیب کی تصویر کشی کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سبط حسن صاحب کا اندازِ نگارش ہی ہے کہ

انہوں نے حیدرآباد کی گلیوں، کوچوں، چائے خانوں، 'پیام' اخبار کے دفتر، صحافتی حلقوں کی سرگرمیوں، جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی ماحول، طلباء تنظیموں کی ہاؤ ہو، ادبی محفلوں کی گرم جوشی، 'گولڈن تھریشولڈ' (سروجنی نائیڈو کا مکان) کی فضا یا ظفر الحسن کے گھر کے شب و روز زندہ و متحرک کر دیے ہیں، ذرا یہ تصویریں ملاحظہ فرمایئے:

'ایک دن مخدوم آئے اور کہنے لگے کہ چلو تمہیں ظفر سے ملائیں، عابد روڈ کے عقبی حصے میں ایک ریڈی ہاسٹل تھا، ظفر الحسن اسی سے متصل ایک مکان میں رہتے تھے، ہم لوگ وہاں پہنچے تو ظفر موجود نہ تھے، البتہ تین چار سال کا ایک لڑکا فرش پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ مخدوم نے اس سے پوچھا۔ 'ابے تیرا ماموں کدھر گیا۔' اس نے نہایت بے تکلفی سے مخدوم کو جواب میں ایک عدد موٹی سی گالی دی، میں ہنسنے لگا تو اس نے مجھے بھی ایک نہایت فحش گالی سنادی، یہ ظفر کے بھانجے سعید تھے، ہم لوگ سعید کی گالیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ظفر آ گئے، ان کی زبانی معلوم ہوا یہ سب گالیاں مخدوم ہی نے سکھا رکھی تھیں اور وہ ہر نوارد کا خیر مقدم ان ہی گالیوں سے کیا کرتا تھا۔' [۲]

۲۔ 'فانی یوں تو مشرقی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے لیکن انہیں اردو رسم الخط سے سخت چڑ تھی، اس کے برعکس وہ رومن رسم الخط کے بڑے حامی تھے، چنانچہ اپنی غزلیں انگریزی ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرتے تھے، اس موضوع پر ان میں اور مولوی صاحب (مولوی عبدالحق) میں خوب خوب بحثیں ہوتی تھی، مولوی صاحب سے فانی کی دلیلوں کا جواب نہ بن پڑتا تو غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے، اور فانی کو جی بھر کر برا بھلا کہتے مگر فانی ہنستے رہتے تھے، فانی کو مولوی صاحب کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا، چنانچہ مولوی صاحب سے ملنے جاتے تو تین چار غزلیں رومن رسم الخط میں ٹائپ کر کے ضرور ساتھ لے جاتے تھے، مولوی صاحب فانی سے بڑی محبت سے ملتے، ادھر ادھر کی باتوں کے بعد تان لامحالہ فانی کی شاعری پر

ٹوٹتی، مولوی صاحب کہتے کوئی نئی چیز لکھی ہو تو سناؤ، فانی مسکرا کر ٹائپ شدہ غزلیں جیب سے نکالتے اور مولوی صاحب کی طرف بڑھا دیتے اور مولوی صاحب ان کاغذوں کو یوں اٹھا کر پھینک دیتے گویا اچانک بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، فانی ہنستے ہوئے تمام کاغذ زمین سے اٹھا لیتے اور غزلیں سنانے لگتے، غزلیں سن کر مولوی صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا تھا۔'[۲۲]

ایسے کتنے ہی مناظر 'شہر نگاراں' کے صفحات پر متحرک نظر آتے ہیں، ان میں شخصیتوں کی قلمی پیکر سازی کا ہنر بھی ہے، حیدرآباد کی نوابی تہذیب کی جھلکیاں بھی ہیں، اور سیاسی اُفق پر ابھرتے ہوئے نقوش بھی، لیکن یہ سب اس طرح باہم پیوست ہیں کہ مل جل کر ایک رواں منظر نامہ ابھر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، کوئی لفظی مغائرت ہے نہ احساس اجنبیت، پوری کتاب میں ایک مخصوص بے تکلفی کی فضا تیرتی ہے، جس میں ہلکا سا حزن بھی ہے لیکن کیف آور نشاط کے ساتھ، ایک دلکش بیانیہ جس میں ہر لمحہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

'شہر نگاراں' کی طرح سبط صاحب کی آخری کتاب 'سخن در سخن' جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے، ہلکے پھلکے انداز نگارش کی نمائندگی کرتی ہے، اور ان دونوں تحریروں کا پیرایۂ اظہار ان کی باقی تصنیفات سے جداگانہ واقع ہوا ہے، اس لیے میں ان دونوں کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ کرنا چاہوں گا۔ 'سخن در سخن' بھی دراصل یادنگاری کے زمرے میں آتی ہے، جس میں انہوں نے فیض کی بعض نظموں کے تخلیقی پس منظر پہ روشنی ڈالی ہے اور اس طرح فیض شناسی کے باب میں ایک اہم، دلچسپ اور معنی خیز اضافہ کر گئے ہیں۔ ادبی تنقید سبط صاحب کا میدان نہ تھا اور شاید اسی لیے انہوں نے فیض پر لکھتے وقت ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے جس نے فیض کی نظموں کو اصل تناظر میں لا رکھا ہے اور جو عام قاری کی نگاہ سے پوشیدہ ہی رہتا۔ یہاں بھی بہت خوبصورت بیانیہ پیرایۂ اظہار میں ان ایام اسیری کی مہک تازہ کی گئی ہے، جس سے فیض کے علاوہ خود ان کے انفاس سرشار رہے ہیں۔ پاکستان میں قید و بند کی صعوبتیں اکثر صاحبان شعور و باضمیر اور فعال افراد کا مقدر ٹھہرتی رہی ہیں، سو فیض صاحب اور سبط صاحب بھی اپنے رفقاء کے ساتھ اس منزل سے بارہا گزرے، دور ایوبی میں لاہور جیل کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیے:

'دادا منصور دمے کے دائمی مریض تھے، بھاول نگر جیل میں ان کی صحت گر

گئی اور جب وہ بھاول نگر سے لاہور آئے تو پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ان کی دوا اور خوراک کا خاص خیال کیا جاتا تھا، مگر جیل کے ڈاکٹر نے ایک دن فیض صاحب کو چپکے سے بتادیا کہ دادا منصور اب چند دنوں کے مہمان ہیں، فیض صاحب سناٹے میں آگئے، ان کو یہ اندازہ تو تھا کہ دادا منصور بہت بیمار ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ موت دروازے پر دستک دے رہی ہے، فیض صاحب نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ حکومت پر زور دیں کہ منصور کو رہا کردیا جائے مگر ڈاکٹر کی کیا مجال تھی کہ جو مارشل لاء والوں سے کسی سیاسی قیدی کی رہائی کی سفارش کرتا، البتہ اس کی تشخیص صحیح نکلی، دادا منصور فروری ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے اور جون میں وفات پا گئے۔ فیض شیخوپورہ میں ان کے جنازے میں شریک تھے، جنازے میں سی۔ آئی۔ ڈی والے بھی موجود تھے ان کو دیکھ کر فیض صاحب بولے آج ایک فائل ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا البتہ شاید کچھ نئے فائل کھل جائیں، واپس آکر انہوں نے غزل نما مرثیہ لکھا، جس کا مطلع ہے۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سر رہ گزار چلے گئے

اور آخری شعر میں دادا منصور کی قید و بند اور سی آئی ڈی کی نگرانیوں اور خفیہ رپورٹوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے [۵]

ایک اور اقتباس دیکھیے:

"تخلیقی عمل کے کرشمے بھی عجیب ہوتے ہیں، غریب لوہارا اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر لوہے کو آگ میں تپا کر ہتھکڑیاں، بیڑیاں تیار کرتا ہے، اس کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ یہ آہنی زیور وہ ظالموں کے دست ستم کے لیے ڈھال رہا ہے یا خود اپنے جیسے مظلوموں

کو بے دست و پا کرنے کے لیے، مگر اہلِ قلم کے تخلیقی عمل کی نوعیت لوہار کے تخلیقی عمل سے مختلف ہوتی ہے۔ فیض صاحب جب قیدیوں کو ہتھکڑیوں، بیڑیوں میں بندھا دیکھتے ہیں، اربابِ وفا کے شورِ زنجیر کی آوازیں جب ان کے کانوں میں آتی ہیں، ان کی چشمِ تصور کو جب اپنے دمسازوں کا 'بازار میں پا بجولاں' چلنا نظر آتا ہے، تو ان کے احساس کے تار لرز اٹھتے ہیں اور 'کہرامِ دار و گیر' ان کی قوتِ تخلیق کو تازیانے لگاتا ہے۔'[۶]

'سخن در سخن' کی فضا شہر نگاراں کے مقابل نسبتاً زیادہ حزنیہ محسوس ہوتی ہے اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے کہ ایک تو فیض صاحب سے ان کے مراسم کی نوعیت ہی مختلف تھی، اور پھر وہ بیشتر واقعات وحوادث میں شریک سفر بھی رہے تھے، لہٰذا فیض کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے خود ان کے اپنے مشترکہ غم بھی ہرے ہوتے ہوں گے، دوسرے فیض صاحب کی جدائی کا صدمہ ابھی تازہ تھا، جبکہ حیدرآباد کی گلیوں کو چھوڑے ہوئے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ ان دونوں تصنیفات میں یادنگاری مشترکہ موضوع رہی ہے لیکن محض بُعدِ زمانی نے دونوں تحریروں کی فضا میں نمایاں فرق پیدا کر دیا ہے۔

'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'انقلابِ ایران'، 'نوید فکر' اور 'پاکستان میں افکار کی جنگ (Battle of Ideas in Pakistan)' سبط حسن صاحب کی ایسی تصنیفات ہیں جن میں علم و دانش کے سمندر بند کر دیے گئے ہیں، ان میں سے تو بیشتر موضوعات پر اردو میں اس سے قبل بہت کم لکھا گیا تھا اور اگر کچھ لکھا بھی گیا تھا تو محض سرسری اور دری انداز میں اور یا پھر وقتی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر، مثلاً 'ماضی کے مزار'، انتھروپولوجی کے موضوع پر غالباً اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں قدیم انسان کی معاشرتی زندگی سے لے کر وادیٔ دجلہ، وادیٔ سندھ، شام و ایران، وسطی ایشیا، مصر، جزیرہ نمائے عرب وغیرہ کے عہد بہ عہد تمدنی ارتقاء کی کہانی سنائی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ عقائد، اخلاقی قدریں، معاشرتی رواج، تہذیبی مظاہر، حکومت، ادارے کس کس طرح بنتے، بدلتے اور بگڑتے رہے ہیں، مادری نظامِ معاشرت کی اقدار کن معنوں میں پدری معاشرے سے مختلف ہوگئیں، 'ماضی کے مزار' کے پہلے باب سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

'قومیں فنا ہو جاتی ہیں، مگر نئی نسلوں کے طرزِ معاشرت پر، صنعت و حرفت پر، سوچ کے انداز پر اور ادب و فن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے، زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں لیکن ان کے الفاظ، محاورے، علامات اور استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر ان کا جز بن جاتے ہیں، پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے، لیکن نئے مذہب کی ہر آستین میں اور عمامے و دستار کے ہر پیچ میں پرانے بت پوشیدہ رہ جاتے ہیں، تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے نقوش و نگار سے نئی تہذیب کے ایوان جگمگاتے رہتے ہیں۔

پانچ ہزار برس گزرے ایسی ہی ایک تہذیب دجلہ و فرات کی وادی میں ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے مشرق قریب[؎] میں پھیل گئی۔ اس تہذیب کا سکہ ڈھائی ہزار برس تک بحرِ روم سے بحرِ عرب تک چلتا رہا۔ تب فارس کے آتش کدوں میں موبدین زرتشت کے زمزمے بلند ہوئے، اور ہخامنشی فرماں رواؤں نے بابل و نینوا کے ملبوں پر ایرانی تہذیب کی عمارتیں کھڑی کیں۔ دجلہ و فرات کا تہذیبی دھارا ایرانی تہذیب میں مل گیا اور دوآبے کا مذہب باقی رہا نہ زبان لیکن وہاں کے باشندوں نے بنی نوع انسان کو پہلی بار علوم و فنون سے روشناس کر کے دنیا پر جو احسان کیا ہے ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ دنیا کے سب سے پرانے گاؤں اسی دوآبے میں ملے ہیں، کاشتکاری نے سب سے پہلے وہیں رواج پایا۔ کمہار کا چاک سب سے پہلے وہیں بنایا گیا، سب سے قدیم شہروں کے آثار وہیں برآمد ہوئے ہیں، شہری ریاستیں پہلے پہل اسی وادی میں قائم ہوئی تھیں اور قانون کا سب سے پہلا ضابطہ اسی سرزمین پر مرتب ہوا تھا مگر دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کا سب سے عظیم کارنامہ فنِ تحریر کی ایجاد ہے سب سے پہلے مدرسے بھی دجلہ و فرات کے ساحلوں ہی پر کھولے گئے۔ سب سے پرانے کتب خانے بھی وہیں دستیاب ہوئے

ہیں اور سب سے پرانی داستانیں بھی اسی خطے کی تصنیف ہیں۔' ؎

مندرجہ بالا اقتباس 'ماضی کے مزار' کے ابتدائی صفحات سے لیا گیا ہے، اس ایک اقتباس ہی سے کتاب کی وسعت و پھیلاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتنی ہی معلومات یک جا کر دی گئی ہیں او یہ معلومات بھی وہ ہیں جو خاص عہد اور علاقے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں، کمہا کے چاک، قدیم شہروں کے آثار، پہلی شہری ریاستوں کے قیام، اوّلین ضابطۂ قانون کی ترتیب فن تحریر کی ایجاد، کتب خانوں اور مدرسوں کا چلن وغیرہ ایسے حوالے ہیں جو قاری کو ساتھ ساتھ لیے چلتے ہیں، اور پھر پیرایۂ بیان ایسا سبک ورواں دواں کہ نفس مضمون جملہ در جملہ اور سطر در سطر کھلتا ہی چلا جاتا ہے نہ کہیں کوئی مشکل لفظ ہے اور نہ غیر مانوس اصطلاح، اور پھر آج کی زندگی کے مظاہرے کے تذکرے سے عبارت کو جاذب توجہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ ماضی کے بعید از قیاس واقعات واحوال کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ آج کی زندگی کے متعلقات کے سراغ لگائے گئے ہیں کہ عہد در عہد ارتقا کی داستان مکمل ہو کر سامنے آ سکے، یہی انداز ابتدا سے آخر تک موجود ہے۔ تخلیق وارتقا کے مختلف نظریات کے تقابلی تجزیے و تشریحات کے ذریعہ قاری کے سامنے استدلال کی راہیں کھولتے چلے جاتے ہیں، عہد در عہد ہونے والی معاشی و معاشرتی تبدیلیوں کے عقائد، افکار اور اقدار پر جو اثرات ہوتے ہیں ان کی داستان بھی موجود ہے۔ عہد رفتہ کے آثار کے درمیان گم شدہ کڑیوں کا جس طرح کھوج لگایا گیا ہے، اور پھر مختلف ادوار، مختلف خطوں اور مختلف نسلوں کے ادب وفنون کے واسطے سے بھی اس عہد کے اجتماعی مزاج اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ان کے اسلوب میں مزید وسعت و گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ قدیم داستانوں کے آئینے میں کسی خاص عہد کی معاشرتی صورت حال کو سمجھنے کی خواہش یا اجتماعی اُمنگوں کا سراغ لگانے کا طریقہ کار سبط حسن صاحب کی تحریر کا خصوصی وصف بن گیا ہے، جس سے انداز میں تازگی پیدا ہو گئی ہے ورنہ ہزاروں برس پر محیط موضوع اپنے اندر جو یبوست رکھتا ہے، اس کے لیے پیرایۂ اظہار میں بے رنگی پیدا کر دینے کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ غرض ایک نئے موضوع پر انتہائی اہم، دلچسپ اور معتبر کتاب 'ماضی کا مزار' کی صورت میں اردو ادب کو حاصل ہوئی ہے اور وہ جو جوش صاحب نے اس تصنیف کے بارے میں کہا تھا ٹھیک ہی تھا کہ ارباب نظر جب 'ماضی کے مزار' پر نظر ڈالیں تو ہر مزار سے حیات کے صد ہا شہر نکلتے نظر آئیں گے۔'

اسی طرح 'موسیٰ سے مارکس تک' ایک اور اہم علمی موضوع پر لکھی گئی نہایت گراں قدر تصنیف ہے، اور اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اسے اشتراکی فکر کے عہد بہ عہد ارتقا کی ایک ایسی دلآویز دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے، جس نے برصغیر کی زبانوں میں سوشلسٹ لٹریچر کی نایابی کو بہت حد تک دور کردیا ہے۔ پانچ سو سے زائد صفحات اور چونتیس ابواب پر مشتمل یہ تصنیف یوں بھی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں انسانی معاشرے کے ابتدائی دنوں میں اشتراکیت کے اصولوں اور مشترکہ طرز معیشت کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور وہ جو ایک خیال عام تھا کہ کمیونزم کا فلسفہ کارل مارکس یا اینگلز یا زیادہ سے زیادہ سولھویں سترھویں صدی کے مغربی مفکرین کی تحریروں اور افکار کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے، باطل ٹھہرتا ہے۔ سبط صاحب نے اس خیال کو نہ صرف بے بنیاد قرار دیا ہے بلکہ مبسوط تاریخی شواہد کے ساتھ ثابت کردکھایا ہے کہ انسان کے ابتدائی معاشروں میں بھی اجتماعی پیداواری اصول اور مشترکہ ملکیت کے طریقے رائج تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

> 'انسان نے جو دریافتیں یا ایجادیں کیں وہ بھی اجتماعی تھیں، ان کی موجب بھی اجتماعی ضرورتیں تھیں اور معاشرے کے سب افراد نے ان سے یکساں فائدہ اُٹھایا یہی سبب ہے کہ آج کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ زبان جو آدمی کی سب سے عظیم الشان اشتراکی تخلیق ہے، کس نے ایجاد کی۔ آگ کا استعمال کس نے دریافت کیا۔ تیر کمان اور پتھر کے آلات و اوزار کس نے بنائے۔ کھیتی باڑی، برتن سازی، پارچہ بافی، شاعری، مصوری، اور رقص و موسیقی کا موجد کون ہے ان مین کوئی ایک فن یا ہنر بھی کسی کی انفرادی تخلیق نہیں ہے، بلکہ پورے معاشرے کے اجتماعی شعور، احساس اور تجربوں کی پیداوار ہے، قدیم معاشرے میں خواہ وہ شکاریوں، مچھیروں اور گلہ بانوں کا ہو جس میں خوراک کا سامان قدرت سے براہ راست حاصل کیا جاتا ہے یا کھیتی باڑی کرنے والوں کا جس میں خوراک پیدا کی جاتی ہے لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں مل جل کر پیدا کرتے تھے اور پھر آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے، معاشرے کے اس دور کو عمرانیات کی اصطلاح میں ''ابتدائی کیمونزم'' کا دور کہتے ہیں۔'[۵]

۲۔ 'روسی انقلاب سے پہلے سائبیریا میں شکاریوں کا ایک قبیلہ تھا جس کو 'یوکاگھیر Yokaghir کہتے تھے، ان کی گزر بسر بارہ سنگھوں اور مچھلیوں کے شکار پر ہوتی تھی، شکار کی تقسیم سب سے بوڑھے فرد کی بیوی کے ذمے ہوتی تھی، جو ہر خیمے کی ضرورت کا خیال کرتی تھی، ان کے خیمے، جال اور کشتیاں پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت تھیں، جبکہ ان کی ذاتی ملکیت پوشاک اور شکاری آلات تک محدود تھی۔' [۹]

موسوی شریعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اس واقعہ کا (من وسلویٰ کے اترنے کا واقعہ) غور طلب پہلو قبائلی مساوات کا وہ اصول ہے جس کے مطابق موسیٰ نے خداوندی نعمت کو تقسیم کیا۔ یہ روٹیاں بنی اسرائیل کی محنت کا پھل نہ تھیں بلکہ انہیں مفت ملی تھیں پھر بھی لوگوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ جتنی روٹیاں جی چاہے اٹھالے جائیں، وہ فقط اپنے ڈیرے والوں کے لیے جمع کر سکتے تھے، اور وہ بھی فی کس ایک مقررہ مقدار میں۔' [۱۰]

افلاطون کے اشرافی کمیونزم کے باب میں ایتھنز کے معاشرہ کے بارے میں اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

'ایتھنز کا معاشرہ چار طبقوں میں بٹا ہوا تھا، سب سے اُونچا اور صاحب اختیار طبقہ شہریوں کا تھا، ریاست کا نظم ونسق اسی طبقے کی اجارہ داری تھی، کیونکہ ووٹ دینے اور اپنے حاکم منتخب کرنے کا حق فقط شہریوں کو تھا۔ فوج میں بھی ان کے علاوہ کوئی بھرتی نہیں ہوسکتا تھا۔ ریاست کی زمینیں بھی انہیں کی ملکیت تھیں، دوسرا طبقہ جو میٹکس (Metics) کہلاتا تھا ان غیر ملکیوں کا تھا، جو مدت سے ایتھنز میں آباد تھے، لیکن ان کو شہری حقوق حاصل نہ تھے، ان کا پیشہ تجارت تھا، وہ یونانی النسل گھرانوں میں شادی بیاہ کرتے تھے، اور اس طرح امور مملکت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھاتے تھے۔ تیسرا طبقہ آزاد غلاموں کا تھا جو ملازمت یا کاروبار کرتے تھے، چوتھا

اور سب سے اہم طبقہ غلاموں کا تھا، ملک کی ساری معیشت کا انحصار انہی کی محنت پر تھا، کانیں کھودنا، کارخانوں میں کام کرنا بوجھ اُٹھانا، عمارتیں بنانا، جہاز چلانا اور گھروں میں خدمت کرنا غرض کہ وہ سارے کام جن میں جسمانی محنت درکار تھی، غلام ہی سرانجام دیتے تھے، ان کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی تھی، بلکہ غلاموں کے مالک انہیں کرائے پر بھی چلاتے تھے۔'[11]

ان اقتباسات میں سبط حسن صاحب کا اسلوب نگارش اپنی پوری جامعیت اور خصوصیات کے ساتھ ابھر آیا ہے وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس کی تصویر کشی سی کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری کا ذہن اس تصویر میں اپنے عہد کی جھلک تلاش کرنے لگتا ہے۔

یہی اسلوب ان کی دوسری تصانیف میں رواں دواں ملتا ہے، 'انقلاب ایران' ہو یا 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' یا 'نوید فکر' کے مضامین، ان سب تحریروں میں نفسِ مضمون انتہائی سبک، صاف، ستھرے آسان اور ہموار لہجے میں بیان کیا گیا ہے، اس سلسلے میں 'انقلابِ ایران' سے یہ اقتباس دیکھئے:

'بونا پارٹ ازم کی خصوصیات پہلوی ریاست سے اتنی ملتی جلتی ہیں کہ ان خصوصیات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ بونا پارٹ ازم کی دوسری خصوصیت فوج کا غلبہ ہے، جس کی اکثریت افلاس زدہ دہقانوں پر مشتمل ہوتی ہے، وہ فوج میں بھرتی ہو کر سورما بن جاتے ہیں، اپنی نئی املاک کو بچانے کی خاطر وہ بیرونی دنیا کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور اپنی نوزائیدہ وطنیت کو خوب خوب بانس پر چڑھاتے ہیں، ان کی وردی ان کا درباری لباس بن جاتی ہے، جنگ ان کی شاعری ہوتی ہے اور حب الوطنی اُن کی ذاتی ملکیت کے احساس کا ذہنی پرتو۔'[12]

'اپریل میں ریاست کی نوعیت کے تعین کا سوال اُٹھا تو خمینی صاحب نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ رائے دہندگان سے فقط یہ دریافت کیا جائے کہ آیا وہ اسلامی ری پبلک کے حق میں ہیں یا نہیں، استصواب رائے کے اس انوکھے پن پر بائیں بازو کے علاوہ آیت اللہ شریعت مداری نے بھی سخت

اعتراض کیا، ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو ملوکیت، جمہوریت اور اسلامی ری پبلک میں سے کسی ایک کو چننے کا حق ملنا چاہیے۔ اکیلے اسلامی ری پبلک کی تجویز پر 'ہاں' یا 'نہیں' کہلوانا رائے دہندگان کی حق تلفی ہوگی، مگر خمینی اپنی ضد پر اڑے رہے تو فدائین خلق نے احتجاجاً استصواب رائے میں شرکت سے انکار کر دیا۔' [۱۱]

ان دونوں اقتباسات میں تحریر کی دوسری خوبیوں سے قطع نظر کیا پڑھنے والے کی توجہ اس مماثلت کی طرف متوجہ نہیں ہو جاتی جو ایران اور پاکستان کے حالات و واقعات میں پائی جاتی رہی ہے، گو پہلا اقتباس کارل مارکس کے خیالات پیش کرتا ہے، لیکن سبط صاحب نے اس کا آزاد ترجمہ بالکل اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے جس سے اس کی اثر پذیری مقامی پڑھنے والوں میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

'نوید فکر' کے سب ہی مضامین مواد اور اظہار کے اعتبار سے منتخب ہیں، لیکن ان مضامین میں سبط صاحب کا اسلوب زیادہ نکھر آیا ہے۔ اور ان کا ہر ہر جملہ معنویت کے ساتھ ساتھ لطفِ بیان سے بھی مزین نظر آتا ہے، ان مضامین کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ خود اپنی تحریر سے حظ حاصل کرنے لگے ہوں اور یہ کیفیت لکھنے والے پر اسی وقت طاری ہوتی ہے جب وہ انتہائے کمال پر پہنچ چکا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ انہیں جملہ سازی کا چسکہ پڑ گیا ہو۔ اصل بات تو یہ ہے کہ سبط حسن صاحب کے اسلوب میں جس واحد بات کی کمی کا احساس ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں کبھی عبارت آرائی اور جملہ سازی کا شوق لاحق ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ 'نوید فکر' کے مضامین میں بھی ان کے مزاج کا یہ عنصر غالب رہا ہے۔ وہ موضوع کے اظہار میں نہ تو ذاتی عصبیت کی سطح پر اترتے ہیں اور نہ تجزیے و استدلال کے رویے کو ترک کرتے ہیں، حالانکہ ان مضامین میں بہت سے موضوعات ایسے بھی تھے جن پر سبط صاحب ایک واضح اور متعین نکتہ نگاہ رکھتے تھے لیکن ان موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی انہوں نے ذاتی حوالوں کو بہت کم اہمیت دی ہے، بلکہ تاریخی تناظر میں، منطق اور دلائل کی روشنی میں زیر بحث مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ رویہ ان کے علمی رویے کی شہادت دیتا ہے، جو ہمارے عہد کے سیاسی وقائع نگاروں اور تجزیہ نگاروں میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے، ہم طوالت کے خوف سے ان مضامین سے اقتباسات

پیش کرنے سے گریز کرنے پر مجبور ہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ 'نوید فکر' کے تمام ہی مضامین اپنے اندر ایک ایسی قوت استدلال رکھتے ہیں جن سے نفس مضمون روشن سے روشن تر ہوتا چلا جاتا ہے خواہ وہ سیکولرازم کی بحث ہو یا تھیوکریسی کا مباحثہ، اسلامی ریاست کی تعریف کا مسئلہ ہو یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کا ذکر خیر! ہر موضوع، ہر مسئلہ اور ہر مباحثہ ان کے ہاں پوری جزئیات کے ساتھ تاریخی تناظر میں انتہائی واشگاف انداز میں اس طرح برہنہ ہوکر سامنے آجاتا ہے کہ قاری اس کے موافق ومخالف دونوں پہلوؤں سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور کہیں کوئی تشکیک، شبہ اور الجھن باقی نہیں رہ پاتی، نہ معنوی اعتبار سے اور نہ اظہار وابلاغ کے واسطے سے، نفس مضمون سے قطع نظر محض انداز نگارش کے اعتبار سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

'خلافت راشدہ کے عہد میں فتوحات میں روز افزوں توسیع کے ساتھ امت کے جسد واحدہ میں پھوٹ اور نزاع کا زہریلا مادہ بھی بڑھتا گیا۔ یمنی مسلمانوں کا زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر بڑے پیمانے پر قتل، ارتداد کا فتنہ، چار میں سے تین خلفاء کی مسلمانوں کے ہاتھوں شہادت، خلیفہ سوئم و چہارم کے عہد میں عراق اور مصر کے مسلمانوں کی بغاوتیں، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کا نزاع اور پھر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان باقاعدہ جنگ اور خوارج کا ظہور وہ المناک واقعات ہیں جن سے امت اور ریاست کا تضاد واضح ہو جاتا ہے۔ مدنی ریاست دراصل عبوری ریاست تھی جو قبائلی جمہوریت اور ملوکیت کی درمیانی کڑی تھی، ایک طرف قبائلی روایتیں تھیں، دوسری نوزائیدہ ریاست تھی جس نے قبائلی حدوں کو توڑ دیا تھا کیونکہ یہ بندشیں ریاست کے نظم ونسق میں حارج تھیں، البتہ چاروں خلفاء کا چار مختلف طریقوں سے انتخاب قبائلی جمہوریت اور ریاست کے تقاضوں کے مابین مفاہمت کی مخلصانہ کوشش تھی، جو کامیاب نہ ہوسکی اور جب ریاست کا توسیعی دور شروع ہوا اور شہری ریاست ایک وسیع وعریض سلطنت میں تبدیل ہوگئی تو قبائلی جمہوریت کے بچے کھچے اثرات بھی زائل ہوگئے۔ فتح ایران کے بعد جب حضرت عمر کے سامنے

مال غنیمت کا انبار لگا، تو آپ زار وقطار رونے لگے، لوگوں نے پوچھا یا امیرالمومنین خوشی کے اس موقع پر آپ روکیوں رہے ہیں تو حضرت عمر نے جواب دیا کہ اس انبار میں میں اسلام کی تباہی دیکھ رہا ہوں، حضرت عمر ریاست کی توسیعی سرگرمیوں کے انجام سے بخوبی آگاہ تھے، لیکن معاشرتی ارتقا کے عمل کو وہ روک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہی ہوا، جس کا ان کو اندیشہ تھا، خلاف راشدہ بنی اُمیہ کی مطلق العنان ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔' [۱۴]

سیکولرازم سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیے

'سیکولرازم کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر وفکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے، لہٰذا ہر فرد بشر کو اس کی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ ان کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب واخلاق سے، فلسفہ و حکمت سے ہو یا ادب وفن سے، اپنے خیالات کی بلاخوف وخطر ترویج کرے، طاقت کے زور سے کسی کا منہ بند کرنے یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا، حقوق انسانی کے منافی ہے اور اس بات کا اقرار بھی کہ بحث ومباحثے میں ہم اپنے حریف کی دلیلوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔' [۱۵]

وادیٔ سندھ اور خصوصاً شاہ عنایت پر جو مضمون 'نوید فکر' میں شامل ہے، اس میں ایک عجیب طرح کی سرشاری کا احساس ہوتا ہے لیکن ان کا مضمون 'پہلا باغی' جو دراصل یونانی دیومالائی کردار 'پرومی تھیوس' کے حوالے سے توہم پرستی، روشن خیالی، تاریک بینی وغیرہ پر ایک بہت حسین اور دلچسپ تحریر کی حیثیت رکھتا ہے سبط صاحب کے مخصوص انداز نگارش کے نمائندہ کے طور پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کا یہ اقتباس دیکھیے:

۴۔ 'آگ کا استعمال اگرچہ گرم علاقوں کی دریافت ہے مگر آگ سے پیار قدرتی بات ہے کہ سرد ملکوں کے رہنے والوں ہی نے کیا، افریقہ اور مصر یا

عرب وشام اور عراق کے جلتے تپتے صحرا کے باشندوں کے فکر واحساس پر آگ کے تخریبی خصائل ہی نے اپنا اثر جمایا۔ ان کے نزدیک آگ کی نمایاں خصوصیت بس یہی تھی کہ وہ جلاتی اور اذیت پہنچاتی ہے، جہاں سال میں آٹھ مہینے قیامت کی گرمی پڑتی ہو اور آگ کے قریب جانا عذاب سے کم نہ ہو، وہاں آگ کے فیض بخش پہلوؤں پر کون غور کرسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گرم ملکوں میں نمودار ہونے والے مذاہب نے بھی آگ کا بڑا بھیانک نقشہ پیش کیا ہے۔ آخر جہنم میں آگ ہی کے شعلے تو بھڑکیں گے۔ البتہ ریگستانی علاقوں میں آگ کے بجائے پانی اور درختوں کی بڑی اہمیت ہے اور وہاں کے لوگ ان چیزوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ لہٰذا جنت میں آگ کا گزر نہیں، بلکہ وہاں میوؤں سے لدے ہوئے درخت ہوں گے۔ ان کے نیچے بہتی ہوئی نہریں ہوں گی، اور کوثر و تسنیم کا شفاف پانی ہوگا۔"[16]

اُوپر دیئے گئے پہلے اقتباس کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ ایک طویل جملہ ہے۔ جس میں ایک خبر کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں، لیکن نہ حروف جار کا بے جا استعمال ہے اور نہ حروف عطف کا۔ بیان کی یہ ضرورتیں انہوں نے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے پوری کرلی ہیں۔ نیز اس سے یہ عمومی مغالطہ بھی دور ہوجاتا ہے کہ چھوٹے جملے لکھنے سے عبارت میں خود بخود سادگی اور صفائی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ ایک طویل جملہ ہے لیکن اس میں ابلاغ یا تفہیم کی کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا یہی اندازِ تحریر تیسرے اور چوتھے اقتباس میں نظر آتا ہے۔

طوالت سے گریز کرتے ہوئے اگر ہم سبطِ حسن صاحب کے اسلوب نگارش کی خصوصیات کو ترتیب وار بیان کرنا چاہیں تو نتائج کچھ اس طرح ہوں گے۔

(الف) ان کی تحریروں میں سلاست و تفہیم و ترسیل کی سبک روی پائی جاتی ہے یہ سلاست نہ تو عربی و فارسی سے گریز کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور نہ ہندی آمیز زبان کے استعمال سے آئی ہے، کیوں کہ ان کے اسلوب میں زبان کا مسئلہ کہیں پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ وہ عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں جن میں عربی فارسی الفاظ بھی شامل ہیں اور ہندی، سندھی اور پنجابی بلکہ انگریزی تک کے مروجہ الفاظ بھی۔ عام فہم اور سہل زبان کے باوجود وہ اپنے لہجے میں ایک خاص

ادبی معیار اور رکھ رکھاؤ بھی قائم رکھتے ہیں، جو ان کی شخصیت کا حصہ تھا، وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ گنجلک اور پیچیدہ تحریر دراصل ژولیدہ خیالی کا عکس ہوتی ہے لہٰذا ان کے اسلوب میں جو سلاست اور سبک روی پائی جاتی ہے وہ دراصل خیال کی استواری اور فکر کی صفائی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہوتا، جہاں وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں الجھتے ہوئے محسوس ہوئے ہوں۔ ان کے خیالات کی تائید یا تردید تو کی جا سکتی ہے اور ان کی فکر سے اتفاق و اختلاف کی گنجائش بھی ہمیشہ نکالی جا سکتی ہے، کہ علم عقیدہ کا نہیں بلکہ مسلسل ردوقبول سے گزرتے رہنے کا نام ہے، لیکن اس بات کا اعتراف تو ان کے ناقدین بلکہ معترضین تک کو بھی کرنا ہی پڑا ہے کہ سبط صاحب کی تحریر میں تفہیم و ترسیل کا کوئی مسئلہ موجود نہیں، نہ ان کے خیال میں کوئی الجھن ہے اور نہ اظہار میں کسی قسم کی پیچیدگی۔ ان کی تحریر خیال کے ساتھ خطِ مستقیم میں چلتی ہے، نہ کبھی خیال اظہار کے اثر سے باہر ہوتا ہے اور نہ اظہار خیال کے جوہر سے عاری۔ ابلاغ کی یہ خوبی اس وقت اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے موضوعات نسبتاً علمی، دقیق، نامانوس اور عامتہ الناس کے لیے کمتر دلچسپی کے حامل ہیں۔ یہ ان کا کمال فن ہے کہ انہوں نے ایسے مضامین اور موضوعات کو بھی اتنے عام فہم انداز میں بیان کیا کہ ان کی ہر تحریر یکساں طور پر عالموں، دانشوروں، طالب علموں، محنت کشوں اور نسبتاً کم پڑھے لکھے لوگوں میں بھی دن بدن مقبول ہوتی چلی جاتی ہے۔

(ب) دوسری بنیادی خصوصیت سبط حسن صاحب کے اسلوب نگارش میں ان کا علمی انداز و فکری پہلو ہے۔ وہ ایک واضح ذہن اور فکری رویہ رکھتے تھے، لیکن اپنے موضوع کا جملہ مبادیات اور ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں اور نتائج کو منطقی انداز میں پرکھنے کے قائل تھے۔ یک طرفہ مطالعہ کو خاص طور پر علمی مباحث میں بہت کم اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شروع سے لے کر آخر تک علمی فضا جگمگاتی ہے۔ وہ تاریخی حقائق کو اپنے خیالات کی ٹوپی اُوڑھانے کے قائل نہ تھے لیکن کسی خاص موضوع پر ممکنہ اندازہائے فکر و نظر پیش کر کے ان کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لہجہ میں منطقی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ تفکر، تعقل، استدلال اور منطق کے حوالے سے ان کے اسلوب میں جو توانائی پیدا ہوئی ہے، اور ان کے لہجہ میں جو سچائی کی آنچ محسوس ہوتی ہے وہی دراصل ان کی تحریر کی اساس ہے۔

(ج) سبط حسن صاحب کی کسی تصنیف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ اکثر و بیشتر ایسے حوالے ضرور پائیں گے جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر موجودہ حالات، آس پاس کے مناظر، مقامیت، اور ہمارے اپنے سیاسی، تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوں، صدیوں پرانی معاشرت کا جائزہ لیتے ہوئے بھی وہ ایسے تلازمے پیش کر دیتے ہیں جو قاری کے ذہن کو اس کے اپنے ماحول اور حالات کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ ایران میں ہونے والے ریفرنڈم کا تذکرہ ہمیں اپنے ہاں ہونے والے ریفرنڈم کی یاد دلاتا ہے۔ ہزاروں سال قدیم ایتھنز کی شہری ریاستوں کے طبقات اور ان کی تقسیم کار کے مطالعہ سے ہمارے اپنے طبقات اور ان کی تقسیم کار کی نوعیت سمجھنے میں آنے لگتی ہے۔ تاریخ کو اپنے عہد کے لیے آئینہ کے طور پر استعمال کرنا یقیناً سبط صاحب کے اسلوب کا ایک اچھوتا، دلچسپ اور تاثر انگیز پہلو ہے، ان کے ہاں یہ خوبی دراصل قاری کی اہمیت کو مناسب درجہ دینے سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ صاحب قلم لوگوں کے اس گروہ کا خیال رکھتے ہیں کہ آخر وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں کس کے لیے لکھ رہے ہیں: وہ ان لوگوں میں تو شامل نہ تھے جو محض اپنی ذات سے آگے دیکھنے کے قائل ہی نہیں ہوتے اور نہ ان لوگوں سے کوئی واسطہ رکھتے تھے جنہیں نہ اپنا پتہ ہوتا ہے اور نہ مخاطب کا، روح معنی سے بے نیاز تحریریں دراصل صرف ان ہی حضرات کی تخلیق ہو سکتی ہیں جو اپنے مخاطب کے وجود سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مکمل اغماض برتتے ہیں۔ اپنے عہد اور اپنے قاری کو نظر انداز کر کے جو لوگ اپنی تحریر میں علمی شان پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ شرار بستہ سے آگے بڑھنے کے اہل ہی نہیں ہوتے اور ایسی تحریریں قبول عام تو کجا کسی مخصوص حلقے میں بھی اپنا تاثر بہت دیر قائم نہیں رکھ سکتیں۔

(د) جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا سبط صاحب اپنے موضوع کو ایک سے زیادہ مآخذ اور ایک سے زائد زاویوں سے پرکھنے کے عادی تھے۔ ان مآخذ میں تاریخی حوالے بھی شامل ہوتے ہیں۔ مذہبی حوالے بھی اور ادب، فن اور آثار قدیمہ کے مآخذ بھی۔ اس طرح ان کے اسلوب نگارش میں جہاں ایک طرف افقی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے وہیں عمودی گہرائی بھی۔ مثلاً سیکولرازم کے موضوع پر لکھتے ہوئے وہ نہ صرف مذہبی مندرجات قرآن، فقہ، حدیث، تاریخ وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں بلکہ ایک سے زائد مفکرین، مصنفین اور اتھارٹیز سے استفادہ کرتے ہیں، پھر تاریخی تسلسل کے ساتھ اس فکری رویے میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہیں، اس کا بھی جائزہ لیتے جاتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ

عیسائیت اور دوسرے مذہبی حلقوں اور بنیاد پرست گروہوں کا عہد بہ عہد جو رویہ سیکولرازم کے تعلق سے رہا ہے، اسے بھی سمجھاتے جاتے ہیں، پھر ان رویوں کی جو اصل بنیادیں تھیں یا ان سے جو مفادات وابستہ تھے یا ہو سکتے تھے ان پر بھی روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح ایک مبسوط، مربوط اور بھرپور علمی و تحقیقی مقالہ وجود میں آتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا سامنے کا موضوع سمجھا جاتا تھا جس پر عموماً یک رُخی جذباتی یا زیادہ سے زیادہ سیاسی باتیں ہی کہی جاتی رہی تھیں۔ لیکن سبط صاحب نے یہ اور اسی قسم کے سیاسی موضوعات کو بھی علمی انداز سے دیکھنے کی طرح ڈالی ہے۔

(س) دعویٰ کے ساتھ دلیل اور دلیل کے ساتھ مخرج یا حوالہ جات ہر علمی تحریر کا وزن ہوا کرتے ہیں۔ تلاش، جستجو، تعلق، تقابل، منطق، استدلال، استدراک، تجزیہ، تجربہ اور مشاہدے کے مقامات ہی سے گزر کر کوئی دعویٰ، قابل قبول ہو سکتا ہے، محض گمان، واہمہ، مغالطہ، مفروضہ، افواہ اور سنی سنائی باتوں پر قائم ہونے والا جذباتی ابال جس انداز تحریر کو جنم دے گا اس کی تاثیریت اور علمی معیار کے بارے میں کچھ عرض کرنا عبث ہی ہوگا۔ سبط صاحب کی تحریریں اس قسم کی لغویات سے پاک رہی ہیں، اس کے برعکس ان کے ہاں استدلال ہی استدلال ہے۔

(ش) ہمارے ہاں علمی و تحقیقی تحریریں عموماً خشک اور بے رنگ ہوا کرتی ہیں اور ہمارے دانشوران کرام خود ساختہ ثقاہت کی ایک خاص منزل سے نیچے اترنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، حالانکہ خشکی اور بے رنگی نہ صرف ان کے دائرہ اثر کو محدود کر دیتی ہے بلکہ خود ان کی فکر اور اسلوب کی نمو پر منفی اثرات کا سبب بنتی ہے، سبط صاحب کے موضوعات عام معیار کے اعتبار سے عمومی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن یہ محض ان کا اسلوب خاص تھا جس نے ایسے خشک موضوعات کو بھی قبول عام کے درجہ پر پہنچا دیا۔ ان کی شخصیت کی طرح تحریروں میں بھی ایک صاف شفاف فضا کا احساس ہوتا ہے۔ زبان ہر چند آسان و عام فہم ہے لیکن ادبی معیار پر سولہ آنے کھری جملوں کی ساخت سیدھی سادی، کہیں ادب کا حوالہ ہے، کہیں سیاسی صورت حال کی جھلک ان سب سے مل کر ایک دلچسپ سطح قائم ہوتی ہے، جس میں ان کا موضوع ترسیل و تفہیم کی کسی مشکل میں الجھے بغیر پڑھنے والے تک منتقل ہوتا چلا جاتا ہے، کسی غلط بات کو سچ کر دکھانا ممکن ہو کسی تحریر کا خاص وصف گردانا جائے لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے، اس کا بنیادی وصف صرف اور صرف یہ ہونا چاہیے کہ اس میں غلط محض غلط اور صحیح محض صحیح نظر آئے۔ اور یہی سبط حسن صاحب کے اسلوب کی سب سے بڑی پہچان اور خوبی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین حالی 'کلیات نثر حالی'، جلد دوم، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۷

۲۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، 'سرسیّد احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ'، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹

۳۔ سیّد سبط حسن، 'شہر نگاراں'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۲۰۱۶ء، ص ۵۳

۴۔ ایضاً، ص ص ۷۱۔۷۰

۵۔ سیّد سبط حسن، 'سخن در سخن'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۲۰۱۶ء، ص ص ۴۷۔۴۶

۶۔ ایضاً، ص ص ۵۰۔۴۹

۷۔ سیّد سبط حسن 'ماضی کے مزار'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۲۰۱۶ء، ص ص ۶۔۵

۸۔ سبط حسن، 'موسیٰ سے مارکس تک'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹

۹۔ ایضاً، ص ص ۲۳۔۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۲۔ سیّد سبط حسن، 'انقلاب ایران'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۹

۱۳۔ ایضاً، ص ص ۲۲۶۔۲۲۵

۱۴۔ سیّد سبط حسن، 'نوید فکر'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۲۰۱۶ء، ص ص ۵۶۔۵۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۰

سید سبطِ حسن۔ ایک عظیم مارکسی مفکر

مسلم شمیم

سید سبطِ حسن ایک عظیم المرتبت دانش ور، نظریہ داں اور مفکر ہیں اور مارکسی مکتبۂ فکر اُن کا حوالۂ خاص ہے۔ اُن کا نام ترقی پسند فلسفے اور ترقی پسند تحریک کے معماروں میں شامل ہے۔ وہ اُن معدودے چند اکابرِ فکر و شعور میں سے ہیں جن کے کارناموں سے خود حلقۂ فکر و شعور کو اعتبار حاصل ہوا ہے۔ وہ ایک صاحبِ اسلوب ادیب اور زبان و بیان کو رفعت بخشنے والے قلم کار تھے۔ وہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے جن کی شخصیت کی ہمہ گیریت، جامعیت اور اُن کے تبحرِ علمی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ اُن کا کمٹمنٹ مثالی تھا اور جس آدرش سے روزِ اول قائم ہوا تھا، وہ تاحیات قائم رہا اور وہ آدرش اشتراکیت اور اشتراکی انقلاب ہے۔

ترقی پسند تحریک نے برِ صغیر کی تمام زبانوں میں انقلابی فکر و نظر اور جذبہ و احساس کو ادبی تخلیقات اور نگارشات میں قوتِ محرکہ کے طور پر اجاگر کرنے اور فروغ دینے میں رہ نمایانہ اور کلیدی کردار ادا کیا اور اُس کے زیرِ اثر خصوصیت کے ساتھ اردو ادب کی دنیا میں ایک انقلاب آفریں عہد اور نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک کے عشرے کو تاریخِ ادبِ اردو میں عشرۂ انقلاب کا درجہ حاصل ہے۔ اِس عشرے کی تخلیقات اور نگارشات میں قومی آزادی اور انقلاب کی گونج اور نغمہ سرائی کو اِس عہد کا حاوی عنصر تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس تحریک نے اپنے ارتقائی مراحل میں شاعری فکشن اور تنقید کو نئی منزلوں اور نئے امکانات سے روشناس کرایا اور بیسویں صدی کے ادب کی قلم رَو کی سرحدوں کو آفاقیت بخشی، ادب اور زندگی کے رشتوں کو وسیع تر کیا۔ اِس تحریک سے ادب اور سماج میں گہرے اور کثیر الجہت رابطے استوار ہوئے، ادب کو سماجی زندگی کی ترجمانی اور

تنقید کا منصب حاصل ہوا؛ تخلیقِ ادب سماجی عمل قرار پایا؛ جاگیری فرسودگی، راسخ العقیدگی، توہم پرستی اور ماضی پرستی کی صدیوں پرانی روایات کی جگہ خرد افروزی، تعقل پسندی اور سائنسی فکر تخلیق کاروں کے طرزِ احساس اور حسیت کی اساس بنی؛ قنوطیت کو مسترد کر کے رجائیت تخلیقات میں جمالیاتی اظہار کے ذریعے زندگی سے ہم کنار ہوئی، گویا زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کو اعتبار اور قبولیت حاصل ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے سب سے زیادہ اثرات اردو ادب کی اہم ترین اصناف پر مرتب ہوئے اور مختلف اصنافِ ادب کے حوالے سے ناموں کی ایک فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اردو شاعری کے شعبے میں خاص طور پر شعرا کی گویا ایک کہکشاں سج گئی تھی جس کے سیارگان میں جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ، علی سردارؔ جعفری، مجروحؔ سلطان پوری، وامقؔ جون پوری، کیفیؔ اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، مجازؔ لکھنوی اور غلام ربانی تاباںؔ کے علاوہ متعدد دیگر نام شامل ہیں۔ فکشن کے شعبے میں بھی وہی صورتِ حال ہے۔ سچ پوچھیے تو اِس باب میں بلاشرکتِ غیرے ترقی پسند افسانہ ہی تاریخِ ادبِ اردو کی آبرو کہا جا سکتا ہے۔ اِس ضمن میں ایک بہت مختصر فہرست میں یہ اسمائے گرامی شامل ہیں: منشی پریم چند، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، کرشن حیدر، راجندر سنگھ بیدی، سہیلؔ عظیم آبادی، غلام عباس، اپندر ناتھ اشکؔ، سعادت حسن منٹو، احمد ندیمؔ قاسمی، خواجہ محمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو اور عبداللہ حُسین۔ تمام تر اردو فکشن ترقی پسند تحریک کا مرہونِ منت ہے۔

تنقید کے شعبے میں بھی ترقی پسند تحریک کی کارکردگی قابلِ رشک رہی ہے اور اردو تنقید کے ارتقا میں بیش تر اہم ترین نام اِسی قبیلے سے متعلق ہیں جن میں سے چند اسمائے گرامی یہ ہیں: پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری، ڈاکٹر اختر حُسین رائے پوری، پروفیسر احتشام حُسین، علامہ نیازؔ فتح پوری پروفیسر ممتاز حُسین، آلِ احمد سرورؔ، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر قمر رئیس۔ یہ شعبۂ نقد و نظر کی وہ شخصیات ہیں جو آسمانِ ادب پر مہر و ماہ بن کر نمودار ہوئیں اور دنیائے ادب کو منور کیا۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بہت سی جامع کتابیں لکھی گئیں جن میں سجاد ظہیر کی 'روشنائی' سرِفہرست ہے۔ سردار جعفری کی کتاب 'ترقی پسند ادب' اور خلیق ابراہیم خلیق کی کتاب 'منزلیں گرد

کے مانند' بھی اِس ضمن میں اہم ترین کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی سیادت میں جناب عاشور کاظمی نے ایک اہم دستاویز کتابی صورت میں پیش کی تھی جو ترقی پسند تحریک کے ارتقائی سفر کے ایک بسیط جائزے کی حیثیت رکھتی ہے، مگر اِس باب میں تحقیق کا کام میرے نزدیک، خصوصیت کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے نظریے کی مبادیات اور اساس کے حوالے سے، بہت کم ہوا ہے جس سے بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اِس شعبے میں سب سے اہم نام ڈاکٹر محمد اشرف کا ہے، مگر اُنہوں نے بقولِ سجاد ظہیر 'اُن کی علیت کا خیال کرتے ہوئے اور اِس امر کو جانتے ہوئے کہ وہ لگا تار محنت کرنے والے انسان تھے، اُنھوں نے بہت کم تحریریں چھوڑی ہیں۔ ہم جو اُن کے قریبی دوست تھے، اُن کو چھیڑا کرتے تھے کہ حرفِ آخر کی تلاش میں اُن کے لیے اپنے علم اور تحقیق کے نتائج کو صفحۂ قرطاس پر درج کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ وہ مسکرا کر رہ جاتے تھے'۔ اِسی تناظر میں سید سبطِ حسن نے اپنی اہم کتاب 'موسیٰ سے مارکس تک' کی تمہید کے ابتدائی پیراگراف میں لکھا تھا:

> 'سوشلزم کے ابتدائی اصول میں نے مشہور انقلابی مورخ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم سے سیکھے تھے۔ یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب ملک پر انگریزوں کی عمل داری تھی اور اشتراکی لٹریچر کا داخلہ ممنوع تھا۔ کبھی کبھی کارل مارکس، اینگلز یا لینن کی کوئی کتاب چوری چھپے آتی تو اُس کی سائیکلو اسٹائل نقلیں خفیہ طور پر گشت کرتیں، مگر ہم لوگوں کی رسائی اِن دستاویزات تک نہ تھی۔ بس لے دے کر برٹرینڈ رسل، برنارڈ شا، ڈی۔ ایچ۔ کول یا سڈنی ویب کی تصنیفات پڑھنے کو ملتیں، حالانکہ اِن میں سے کوئی بھی حقیقی معنی میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہ تھا۔ سوشلسٹ لٹریچر کی اِسی نایابی کے مدِنظر ڈاکٹر محمد اشرف نے سوشلزم کی ایک مبسوط تاریخ کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ سیاسی سرگرمیوں میں ایسے پھنسے کہ منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا'۔[1]

اِس زمرے میں البتہ ایک اہم نام پروفیسر علی عباس جلال پوری کا ہے جنھوں نے متعدد بہت اہم کتابیں اِس باب میں لکھیں اور خرد افروزی، روشن خیالی اور تعقل پسندی کے دریچے اپنے قارئین پر وا کیے جس کا ذکر اکثر سید سبطِ حسن کرتے تھے اور اُن کی کتابوں کی اُن کے نزدیک بڑی

قدر و قیمت تھی۔ بہر حال اپنے قلیل منبعِ علم اور دائرۂ مطالعہ کی روشنی میں میری رائے ہے کہ جناب سید سبطِ حسن نے اِس شعبے میں مارکسی نظریے اور ترقی پسند فکر کی ترویج و فروغ میں بہت نمایاں کارکردگی دکھائی ہے اور بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے سید سبطِ حسن کے تمام تر کارناموں کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور جو کتابیں اُنھوں نے ترتیب دی ہیں اور اُن میں حاشیوں سے اُن کی تحقیقی اہمیت اور افادیت اجاگر کی ہے، وہ غیر معمولی کام کا درجہ رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر اُن کی بیش تر کتابوں کے مطالعے سے یہ اجمالی تصور اور اُن کا حاصلِ مطالعہ ٹھہرتا ہے کہ سید سبطِ حسن کا شمار پاکستان کے اُن معدودے چند دانش وروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے ملک کی اُس عمومی ذہنی فضا کو جو فکری جمود و ضعیف الاعتقادی، رجعت پسندی اور غیر سائنسی رویوں سے عبارت رہی ہے، بدلتے اور اُس کی جگہ عقلیت اور روشن خیالی کو عام کرنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔ سبطِ حسن تقلید کے بجائے تنقید اور جمود کے بجائے ارتقا اور اجتہاد کے علم بردار تھے۔ اِن رویوں کو معاشرے میں فروغ دینے کے لیے اُنھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو اپنے فکر انگیز مضامین و مباحث کے علاوہ اپنے سادہ مگر پُراثر اندازِ تحریر کی بنا پر غیر معمولی مقبولیت کی حامل قرار پائیں۔ سبطِ حسن نے عقل و خرد کی جو برق افروزی کی ہے اُس کی لَو آج بھی زندہ ہے اور اُن کی صدائے بازگشت اور ندائے ہوش ذہن و دل کی محرابوں میں آج بھی گونج رہی ہے۔

سبطِ حسن نے جامعیت کی حامل مبسوط کتابوں کی تصنیف و تالیف کی طرف آنے سے پہلے ایک طویل عرصہ صحافت کے خارزار میں بھی آبلہ پائی کی۔ وہ صحافیوں کے اُس بے لوث گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک صحافت ایک کاز اور سماجی مشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ سبطِ حسن کے نزدیک صحافت کا مقصد اپنے معاشرے کے عیوب اور کوتاہیوں کی پردہ داری نہیں بلکہ اُن کی اصلاح اُن کا ہدف تھا۔ اُن کی صحافت ذاتی منفعتوں کے حصول کا وسیلہ نہیں بلکہ سماجی نشو و نما کا ذریعہ تھی۔ وہ اپنے ملک کے باشندوں کے سماجی شعور کو مہمیز کرنے کے لیے کمربستہ رہے اُنھوں نے اپنے قلم کو عوام کی امانت سمجھا اور اُس سے اخبار بیچنے اور بکوانے کا کام نہیں لیا بلکہ ایک مشن اور کاز کے فروغ میں اُس کی عملی شمولیت کے خواہاں تھے۔ اُن کی صحافت سلانے کی دوا نہیں، جگانے کی نوا تھی۔

سبطِ حسن قیامِ پاکستان سے پہلے اور اُس کے بعد متعدد اخبارات و جرائد سے وابستہ رہے یا کُل وقتی قلم کار کے طور پر جریدوں اور اخبارات میں لکھتے رہے۔ اُنھوں نے تقسیمِ ہند سے پہلے 'پیام'، 'نیشنل ہیرالڈ'، 'قومی جنگ' اور 'پیپلز وار' میں کام کیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد روزنامہ 'امروز' لاہور، 'ڈیلی پائنیر' لکھنؤ، 'سول اینڈ ملٹری گزٹ'، روزنامہ 'حریت' کراچی روزنامہ 'ڈان' کراچی، روزنامہ 'مسلم' لاہور، ہفت روزہ 'ویو پوائنٹ' لاہور وغیرہ میں اُن کے گراں قدر مضامین نمایاں طور پر شائع ہوتے رہے۔ مگر سید سبطِ حسن کی صحافیانہ زندگی کا نقطۂ عروج اُن کا ہفت روزہ 'لیل و نہار' کی ادارت کا زمانہ ہے۔ وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء اور پھر ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۱ء تک اِس ہفت روزہ کے مدیر رہے۔ دورِ ثانی میں یعنی ہفت روزہ 'لیل و نہار' کراچی میں سبطِ حسن کے ساتھ جناب فیضؔ احمد فیضؔ اور جناب حسن عابدی اُن کے شریکِ کار رہے۔ پاکستان کے تہذیبی اور سیاسی مسائل، 'لیل و نہار' اور ۱۹۷۴ء میں کراچی سے نکلنے والے ادبی پرچے ماہ نامہ 'پاکستانی ادب' میں شامل اُن کے اداریوں کے موضوعات ہیں۔ معروضیت پسندی، عوام دوستی، انسانی اخوت، جمہوریت اور معاشی انصاف کی پُرزور وکالت اور انسانی حقوق کی پاس داری، انسان کے ہاتھوں انسانی استحصال اور جبر و جور کے خلاف صدائے احتجاج، سب رویے اِن اداریوں میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ اداریے ترقی پسندانہ فکر و شعور کے مظہر تو ہیں ہی اِن کی ایک بڑی تاریخی اہمیت بھی ہے اور وہ یہ کہ اِن اداریوں میں عہد بعہد پاکستانی سیاست و معاشرت کی واضح تصویر کشی کی گئی ہے۔ جن ادوار میں یہ اداریے تحریر کیے گئے اِس حوالے سے پاکستانی سیاست و تاریخ اور صحافت کے طالبِ علموں کے لیے یہ اداریے معلومات کا ایک گنجِ گراں مایہ ثابت ہوں گے۔ ادبی صحافت کو اعتبار دلانے میں جہاں علامہ نیازؔ فتح پوری، مولانا حسرتؔ موہانی، چراغ حسن حسرتؔ، مرزا ادیب، فیضؔ احمد فیضؔ کے نام آتے ہیں، اُس فہرست میں جناب علی سردارؔ جعفری اور سبطِ حسن کا نام بھی شامل ہے۔ اِن دو اکابرِ ادب نے ترقی پسند تحریک کے ترجمان 'نیا ادب' کے ذریعے ترقی پسند تخلیقی ادب اور نظریے کی ترویج و فروغ میں عہد ساز کام کیا۔ واضح رہے کہ سبطِ حسن کا ادبی کیریئر اُن کی پہلی کتاب 'جنگِ حبشہ اور اطالیہ' سے شروع ہوا جو اُنھوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ مشترکہ طور پر لکھی تھی۔ سبطِ حسن نے ایک اہم کام ۱۹۴۱ء میں انجام دیا تھا، یعنی آزادی کی نظموں کی ترتیب و تالیف کی تھی جس میں اُس دور کے اہم ترین شعرا کی

نظمیں شامل تھیں اور جس نے اُس وقت کی آزادی کی تحریک کے لیے صورِ اسرافیل اور جرسِ کارواں کا کام کیا تھا۔

سید سبطِ حسن کے بحیثیت مارکسی نظریہ داں اور اُن کی فکر و دانش پر گفتگو سے قبل کچھ اُن کے ذاتی کوائف کا بیان معنویت سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ ایک جاگیردار گھرانے میں ۱۹۱۶ء میں اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہاں یہ بات لکھنا بے محل نہیں ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کے بیش تر عمائدین کا تعلق جاگیردار طبقے سے تھا جن میں سید سجاد ظہیر، سید علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، صاحب زادہ محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، پرویز شاہدی، ڈاکٹر محمد اشرف، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی غلام ربانی تاباں، آلِ احمد سرور، سید احتشام حُسین، ظ۔ انصاری اور متعدد نامور شخصیات شامل ہیں۔ اِن اکابرِ شعر و ادب نے ادبی دنیا کو نئی رفعتوں سے سرفراز کیا اور اپنے طبقاتی مفادات سے خود کو جدا کر کے استحصال زدہ انسانوں اور ظلم و استحصال پر مبنی سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کیا اور عملی جد و جہد میں پیش پیش رہے۔ اِن میں بیش تر نے قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ اِس جاگیردار طبقے کا ایک رئیس زادہ حسن ناصر جو یقیناً ادیبوں کے قبیلے کے رکن نہ تھا مگر اس نے اِس آدرش کے لیے اپنی جان کی قربانی دی جو مذکورہ قلم کاروں کی تخلیقات کا سرچشمۂ فکر و احساس تھا۔ دراصل اِن عظیم شخصیات نے خود کو de-class کیا اور خود کو گوتم بدھ کی طرح اپنے طبقاتی مفادات اور مراعات کو پسِ پشت ڈال کر مظلوم انسانیت کو ظلم و ناانصافی اور استحصال سے نجات دلانے کے لیے اپنی اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور جنھوں نے ایک ایسے مستقبل کی تعمیر کے خواب دیکھے اور وہ خواب بانٹے جو اِس دُکھوں بھری دنیا کی جگہ جنتِ ارضی کی تعمیر کا خواب ہے اور اِس انقلاب یعنی انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے آدرش کو اپنے فکر و شعور کا سرچشمہ بنایا، جس انقلاب کی منزلِ مقصود وہ جنتِ ارضی تھی جو تاریخ کی گردِ سفر میں وقتی طور پر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی معنویت سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۹۹۱ء کا تاریخی سانحہ یعنی سوویت یونین کا انہدام، اِس انقلاب کے آدرش یعنی سوشلزم اور مارکسی فلسفے کا مسترد ہونا نہیں ہے۔ آج کی دنیا، خصوصیت سے مغربی سرمایہ دار دنیا، جس بحران میں مبتلا ہے، وہ پہلا اور نیا نہیں بلکہ ۱۹۳۰ء کی عظیم سرد بازاری (Great Depression) کے نام سے تاریخ میں محفوظ ہوا ہے۔ آج کی وہ دنیا اپنے مسائل کا حل یعنی بحران پر قابو پانے کے لیے

مارکسی فلسفے اور اُن کے تجویز کردہ سائنسی سوشلزم میں ڈھونڈنے چلی ہے اور مارکس کی تصانیف کا از سرِنو مطالعہ اور جائزہ لینے میں مصروف نظر آ رہی ہے۔

سید سبطِ حسن کا تعلق بھی اِسی قبیلۂ کشتگاں سے ہے۔ وہ بھی مذکورہ آدرش اور کاز کے لیے اپنی ابتدائی شعوری زندگی سے مصروفِ پیکار ہو گئے۔ اُنہوں نے علی گڑھ سے گریجویشن کیا اور اُس وقت کے بڑے مارکسی عالم ڈاکٹر محمد اشرف سے مارکسزم کا سبق پڑھا۔ اُنہوں نے اِس کا تذکرہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'موسیٰ سے مارکس تک' میں اِن الفاظ میں کیا ہے: 'سوشلزم کے ابتدائی اصول میں نے مشہور مورخ ڈاکٹر محمد اشرف مرحوم سے سیکھے تھے۔'[۲] سبطِ حسن کو دورانِ تعلیم علی گڑھ میں بہت سے اہم دانش وروں سے ربط وضبط کے مواقع ملے اور علی گڑھ کی علمی اور فکری فضا نے اُن کی کشتِ شعور کی آبیاری میں اہم کارفرمائی دکھائی۔ سید سجاد ظہیر انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے بانی ارکان میں سے تھے اور وہ انجمن کے پہلے سکریٹری جنرل بھی تھے۔ سید سبطِ حسن بھی انجمن کے ابتدائی وابستگان میں شامل تھے، چنانچہ آغازِ سفر ہی سے اُن کو سجاد ظہیر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ دونوں رہنماؤں کا ہندوستان اور پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ بھی قریبی بلکہ قائدانہ تعلق تھا۔ اِس عرصۂ حیات میں ۱۹۴۶ء میں اُنھوں نے ایک امریکی یونیورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات (International Relations) میں پوسٹ گریجویٹ کی سند حاصل کی اور ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستگی کے نتیجے میں اُنھیں امریکا بدر ہونا پڑا۔

سید سبطِ حسن کی ستر سالہ (۱۹۱۶ء۔۱۹۸۶ء) زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ عرصۂ حیات ایک غیر معمولی انسان کی رزم و بزم کی قابلِ رشک کہانی ہے۔ وہ اپنے طالبِ علمی کے زمانے سے ایک سوچنے والے ذہن کے مالک تھے۔ اُن کی داستانِ حیات میں فکر وشعور اور جہد وعمل کے دو دریا ساتھ ساتھ بہتے اور ٹھاٹھیں مارتے دکھائی دیں گے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ سجاد ظہیر کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور انجمنِ ترقی پسند مصنّفین میں سرگرمِ عمل رہے اور تنظیمی سرگرمیوں کے ساتھ فکری اور نظریاتی محاذ پر بھی اپنی فعالیت کا ثبوت فراہم کرتے رہے ہے۔ مختلف جریدوں اور روزناموں میں، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، چھپنے والی نگارشات سے علم و دانش کی روشنی سے منقولات کی تیرگی اور توہمات کی ظلمتیں معدوم ہوتی دکھائی دیتیں اور معقولات، تعقل پسندی خرد افروزی و روشن خیالی کی مشعلیں راہِ حیات کو روشن تر کرتی نظر آتی ہیں۔ واضح رہے کہ اُن کے

علم ودانش اور فکر وشعور کا سرچشمہ مارکسزم اور مارکسی فلسفہ تھا۔

اُن کی صحافیانہ زندگی تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اِس عرصۂ حیات کی اُن کی نظریاتی خدمات کچھ کم اہم اور کم وقیع نہیں ہیں۔ اُن کے قلم سے ہمیشہ روشن خیالی، خردافروزی اور تعقل پسندی کو فروغ ملتا رہا اور مارکسی فکر وشعور قلم قبیلے کا اثاثہ بنتا گیا، مگر اُن کا آخری عرصۂ حیات مثالی اور غیر معمولی کارناموں اور حاصلات کا حامل ہے۔ یہ وہ عشرہ تھا جس کے دوران میں نصف درجن سے زیادہ ایسی تصنیفات سماج کو حاصل ہوئیں جن کے ذریعے سماجی شعور اور کشتِ خیال کی ایسی آبیاری ہوئی جو فقید المثال اور غیر معمولی بلکہ تاریخی اور رجحان ساز کہلائے گی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے سید سبطِ حسن کی مجموعی دانش ورانہ کارکردگی کے حوالے سے لکھا ہے:

> 'سبطِ حسن ایک بہت اہم فلسفی تھے۔ سبطِ حسن نے ہمارے خطے کی روشن خیالی کی تحریک کو بین الاقوامی تحریک سے جوڑنے کے لیے بنیادی نوعیت کا کام کیا...... عالمی روشن خیالی کی تحریک صحیح معنوں میں اپنی فکر کی قوت اور صداقت کا نام ہے۔ یہ سائنس، ٹیکنالوجی اور علاقائی بصیرتوں کے خلاف ہے۔ یہ تعصبات سے اَٹی ہوئی دنیا میں تعصّبات سے گلوخلاصی کا نام ہے۔ یہ صرف ایک تعصب کے سوا ہر تعصب کے خلاف سینہ سپر ہونے کا نام ہے۔ صرف ایک تعصب ہی ضروری ہے اور وہ ہے عدل وانصاف کا تعصب، امن وآشتی کا تعصب، انسانی میراث پر یکساں حق کا تعصب اور ہر قسم کی پس ماندگی کے خلاف تعصب...... یہ درحقیقت جدلیاتی فکر کی بالادستی کی فطری خواہش کا نام ہے۔ سبطِ حسن نے روشن خیالی کے قافلے کی جس جرأت مندانہ انداز میں رہنمائی کی، وہ ہماری فکری تاریخ ایک بہت روشن باب ہے۔' [۲]

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے سبطِ حسن کی جدلیاتی فکر کا حوالہ دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کلیدی اہمیت کی حامل بات ہے، کیونکہ جدلیاتی فکر ہی سبطِ حسن کی فکر کا محور ہے اور وہ اِس جدلیاتی فکر کی روشنی کو پھیلانے کی ساری عمر کوشش کرتے رہے۔ اُن کی شاہکار تصنیف 'موسیٰ سے مارکس تک' جسے اُنھوں نے سوشلزم کی تاریخ کہا ہے، وہ سوشلزم کی تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ مارکسزم اور

مارکسی فلسفے کی ایک وقیع کتاب ہے۔ اُنھوں نے اِس کتاب کی تمہید میں اشتراکیت کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

'مارکس اور اینگلز نے اپنے اشتراکی نظریوں کے لیے سائنسی سوشلزم کی اصطلاح اور پرانے سوشلزم کے لیے خیالی سوشلزم کی اصطلاح وضع کی۔ خیالی سوشلزم سے اُن کی مراد سماجی اختلاف کے وہ منصوبے تھے جو یورپ کے مفکرین وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے تھے۔ یہ منصوبے معاشرے کے معروضی حالات سے اخذ کیے گئے تھے بلکہ اُن مفکرین کی ذاتی خواہشوں کا عکس تھے۔ اِس کے برعکس سائنسی سوشلزم سرمایہ داری نظام کے معروضی حالات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ اِس کے اصول سماجی ارتقا بالخصوص سرمایہ داری نظام کے گہرے مطالعے سے اخذ کیے گئے تھے سائنسی سوشلزم سے مراد وہ سماجی نظام ہے جس میں پیداوار کے تمام ذرائع زمین معدنیات، کارخانے، بینک، تجارت وغیرہ معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور اِن کی پیداوار جسمانی اور ذہنی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے۔ 'کمیونزم' سائنسی سوشلزم کا اگلا قدم ہے۔ اِس سے مراد وہ اشتراکی نظام ہے جس میں پیداواری قوتیں اور پیداوار دونوں اِتنی بڑھ جاتی ہیں کہ اشیائے صرف کے استعمال کا پیمانہ افراد کی محنت نہیں بلکہ اُن کی ضرورت ہوتا ہے۔' [۳]

مذکورہ کتاب کے آخری چودہ ابواب کارل مارکس کی زندگی، شخصیت، نظریاتی اور انقلابی کارناموں کے نہایت جامع اور مفصل بیان پر مشتمل ہیں، خصوصیت کے ساتھ 'مارکس کا فلسفۂ بے گانگی'، 'تاریخی مادّیت کی تشکیل' اور 'قدرِ فاضل اور سرمایہ' بڑی اہمیت اور افادیت کے حامل ابواب ہیں جن کے ذریعے مارکسزم کی واضح تفہیم ہوتی ہے۔

جدلیاتی فکر کے ارتقائی سفر کو بیان کرتے ہوئے اُنھوں بتایا کہ جب سے انسانی سماج میں حاکم ومحکوم طبقے پیدا ہوئے ہیں اور طبقاتی جنگ کا آغاز ہوا ہے، ہمارا فلسفۂ زندگی اور ہمارے خیالات بھی دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اِس میں کسی ملک، قوم اور مذہبی گروہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر ملک،

ہر قوم اور ہر مذہبی گروہ میں جہاں طبقات موجود ہیں، خیالات بھی دو طبقوں کے خیالات ہو گئے ہیں۔ ایک طرف حاکم طبقے کا فلسفہ رہا ہے جسے خیال پرستی کے فلسفے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف محکوم طبقے کا فلسفہ ہے جسے مادّیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ افلاطون کے وقت سے آج تک خیال پرستوں نے ہر جگہ اپنے زمانے کے سماجی نظام کی حمایت کی ہے اور اُس کو قائم رکھنے کے لیے فلسفے کے نئے نئے اصول بنائے ہیں۔ اِس کے برعکس مادّہ پرستوں نے ہر دور میں سماج کے ابھرتے ہوئے طبقے، ابھرتی ہوئی طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اور سماجی نظام بدلنے میں اُن کی حمایت کی ہے۔ طبقاتی جنگ نے فکر کی دنیا میں مادّہ پرستی اور خیال پرستی کی جنگ کی شکل اختیار کی ہے۔ جدلیاتی مادّیت فطرت اور سماج کو بالکل دوسری طرف سے سمجھنے کا طریقہ ہے۔ جدلیت سے مراد ہے کہ فطرت کے حوادثات برابر متحرک ہوتے ہیں، وہ برابر بدلتے رہتے ہیں اور فطرت کی متضاد طاقتوں کے باہمی جدل سے فطرت کا ارتقا ہوتا ہے جدلیت کا یہ قانون محض فطری حادثات کے ارتقا میں کارفرما نہیں بلکہ انسانی معیشت اور انسانی تاریخ کے ارتقا میں بھی موجود ہے۔ اِس کی رو سے سماجی نظام کا ارتقا یا تاریخ میں سماجی تبدیلی کسی اٹل یا ابدی تصور یا کسی بیرونی آفاقی تصور کے ماتحت نہیں ہوتی۔ ہر سماجی تبدیلی کے اسباب اُس کے گرد و پیش کے حالات میں پنہاں ہوتے ہیں۔ ہر سماجی تبدیلی کو سمجھنے کے لیے اُن تمام دوسرے حالات کو سمجھنا ضروری ہے جن سے اُس تبدیلی کا تعلق ہے۔ سماج میں اُس کی بنیادی تبدیلی کا سبب آلات و ذرائعِ پیداوار میں تبدیلی کا ہو جانا ہے۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کے دوران میں خاص طور پر پانچ قسم کے پیداواری تعلقات یا معاشی نظاموں کا وجود عمل میں آیا ہے: (۱) قدیم اشتراکی نظام، (۲) غلامی کا نظام، (۳) جاگیری نظام، (۴) سرمایہ دارانہ نظام (۵) اشتراکی نظام۔ گویا ابتدائی زمانے کی اشتراکیت کا نظام یا اُس کے بعد کا غلامی کا نظام کسی ابدی تصور یا کسی تاریخ سانحے کا نتیجہ نہ تھے بلکہ اُن کی ٹھوس معاشی بنیادیں تھیں۔ اُن معاشی بنیادوں میں تبدیلی کے سبب سماج کا نظام، سماج میں انسانوں کے باہمی تعلقات اور سیاسی نظام میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ غرض یہ کہ جدلیت کے مطابق فطرت ساکن، غیر متحرک اور جامد نہیں ہے بلکہ اُس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہ مستقل ارتقا کی حالت میں ہے۔ جدلیت کے اِس اصول کی رو سے اگر ہم سماج کو دیکھیں تو اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی سماجی نظام انمٹ اور اٹل نہیں ہے۔ ذاتی ملکیت کا حق کوئی

ابدی یا آفاقی کلیہ نہیں ہے۔ جاگیردار اور کسان کا رشتہ کسی ابدی انصاف کے اصول پر مبنی نہیں ہے۔ سرمایہ داری کا نظام، سرمایہ دار اور مزدور کا موجودہ رشتہ عدل کے کسی لافانی تصور کی پیداوار نہیں ہے۔ جس طرح غلامی کا نظام ختم ہو کر جاگیرداری کا نظام قائم ہوا، جس طرح جاگیرداری نظام پر سرمایہ داری حاوی ہو گئی، اسی طرح حالات کے تقاضے کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام کو مٹا کر سوشلزم یا اشتراکیت کے نظام کا قائم ہونا جدلیت یعنی اصولِ ارتقا کے عین مطابق ہوگا لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ پرانے سماجی نظام، پرانے پیداواری تعلقات کی جگہ نئے سماجی نظام نئے پیداواری رشتوں کو انقلابی عمل کے ذریعے ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔

سید سبطِ حسن کے کمالات اور نظریاتی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اُنھیں 'ایک بہت اہم سماجی فلسفی'[۵] کہا ہے۔ میرے نزدیک وہ ایک بڑے مارکسی مفکر تھے، مگر اُن کو فلسفی کے منصب پر فائز کرنا غلو اور مبالغہ آرائی پر مبنی بات ہے، کیونکہ اُنہوں نے ہمیں کوئی نیا فلسفہ نہیں دیا ہے۔ فلسفی وہی ہوتا ہے جس سے کوئی نیا فلسفہ موسوم ہو، اُنھیں ہم فلسفہ دان بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک مارکسی فلسفہ داں یا مارکسی نظریہ داں تھے۔ اُن کی مارکسی نظریہ دانی کی بصیرت اُن کی تمام تحریروں اور تصانیف میں نمایاں وصف کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ ایک بڑے محقق اور مورخ کے منصب پر بھی فائز تھے۔ اُن کی دو اہم ترین تصانیف 'ماضی کے مزار' اور 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' اُن کا عظیم کارنامہ ہیں۔ اِن دونوں تصانیف میں اُنھوں نے کرۂ ارض کی تین عظیم تہذیبوں کا عالمانہ مطالعہ اور اُن کے ارتقائی سفر کا جائزہ پیش کیا ہے یعنی میسوپوٹامیہ کی تہذیب، مصری تہذیب اور وادیٔ سندھ کی تہذیب کا مفصل اور محققانہ بیان 'انقلابِ ایران' میں بھی اُن کا مارکسی زاویۂ نظر ہر جگہ نمایاں ہے۔ اِن تصانیف کے علاوہ اُن کی ایک اہم کتاب 'نویدِ فکر' ہے جس کا انگریزی ترجمہ (خود مصنف کا کیا ہوا) Battle of Ideas in Pakistan ہے۔ سبطِ حسن صاحب کی انگریزی کتاب کو 'نویدِ فکر' کا ترجمہ کہنا درست نہیں ہوگا۔ دونوں کتابوں کے بیشتر مباحث یقیناً ملتے جلتے ہیں مگر دونوں میں ایک دوسرے سے مختلف چیزیں بھی شامل ہیں، انگریزی کتاب میں 'اردو ادب میں افکار کی کشمکش' کے موضوع پر جو مضمون ہے وہ 'نویدِ فکر' میں نہیں ہے (مرتب)۔ یہ کتاب اُن کے کئی نظریاتی مقالوں پر مشتمل ہے جن میں تھیوکریسی، اسلامی ریاست اور سیکولرزم، یہ اہم ترین ابواب ہیں۔ اِن کے علاوہ حیدرآباد دکن کے حوالے سے اُن کی

ایک یادگار کتاب 'شہرِ نگاراں' ہے جو فیض احمد فیض کی نظموں کے منظر اور پس منظر پر مشتمل ہے، یہ کتاب فیض شناسی کے حوالے سے ایک اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔ 'افکارِ تازہ' اور 'ادب اور روشن خیالی' اُن کے مضامین کے دو مجموعے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ 'بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی' اور 'سخنِ آتش نفس سجاد ظہیر' یہ دو کتابیں اُن کے کارناموں میں تا حال شاملِ فہرست ہیں۔

یہ بیان ہو چکا ہے کہ سید سبطِ حسن ایک بڑے مارکسی نظریہ داں تھے اور اُنھوں نے اپنی مارکسی نظریہ دانی کی روشنی میں سائنسی فکر اور خرد افروزی کے فروغ کے باب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایک بڑے سوشل سائنٹسٹ ہیں اور اُنھوں نے اپنے مارکسی شعور کی روشنی سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اُن کی مذکورہ رجحان ساز اور تاریخ ساز کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک ایسے مارکسی نظریہ داں ہیں جنھوں نے جدلی مادّیت اور تاریخی مادّیت، جو مارکسزم کے بنیادی ستون ہیں، کا Creative Interpretation کے ساتھ ساتھ Creative Application کیا ہے۔ وہ عالمِ باعمل تھے۔ اُنھوں نے اپنے فکر و شعور کی روشنی اپنی تحریروں کے ذریعے نہیں پھیلائی بلکہ مارکس اور اینگلز کی طرح میدانِ عمل میں سرگرمِ کار رہے۔ اُنھوں نے کیمونسٹ پارٹی اور انجمنِ ترقی پسند مصنّفین، دونوں محاذوں سے اپنے مارکسی نظریے کے پھیلاؤ کے لیے کام کیا۔ اُن کے آخری عشرۂ حیات میں مجھے اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور مجھے اُن کی توجہِ خاص اور اعتماد حاصل رہا۔ ۱۹۸۳ میں اُنھوں نے کارل مارکس کی صد سالہ برسی کراچی پریس کلب میں بڑے پیمانے پر منائی۔ جشن کے لیے اُنھوں نے کئی مہینے کی تیاری کی تھی۔ انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے جشنِ زریں کے سلسلے میں کراچی میں چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے وہ روحِ رواں رہے اور اُن کی زیرِ سرپرستی اِس کانفرنس کا مجھے سکریٹری جنرل ہونے کا تفخر حاصل رہا۔ اُن کی نظریاتی زندگی کے آخری ماہ و سال انجمن کے حوالے سے تاریخ کا حصہ بنے۔

اُنھوں نے ۱۹۸۵ء میں انجمن کی جشنِ زریں کی لندن کانفرنس میں شرکت کی اور کانفرنس کے مرکزی کردار بنے۔ مارچ ۱۹۸۶ء میں کراچی میں مذکورہ جشنِ زریں کی چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے روحِ رواں اور گائڈ رہے اور اپریل ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ انجمن کی جشنِ زریں کانفرنس میں اُن کا کلیدی کردار رہا۔ اِس کانفرنس سے واپسی پر دہلی میں اُن پر دل کا دورہ پڑا

جو جان لیوا ثابت ہوا۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید سبطِ حسن نے ساری زندگی مارکسی نظریے سے وابستگی اور اِسی کے فروغ میں گزاری اور اِس حوالے سے اُن کا سفرِ حیات قابلِ رشک کہا جانا چاہیے۔ وہ اپنے آخری ماہ وسال کی کارکردگی اور سرگرمی سے بے حد خوش اور مطمئن تھے اور دہلی میں اُن کی وفات میرے نزدیک شادیٔ مرگ کا درجہ رکھتی ہے۔ اُن کے حوالے سے یہ کہنا رسمی بات نہیں کہ وہ اپنی ذات میں ایک اکیڈمی، ایک انجمن اور ایک تحریک تھے اور وہ مذکورہ تصنیفات اور عملی نظریاتی زندگی، جو تاریخ کا حصہ ہیں، کے حوالے سے سماج میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اُن کا نام تاریخِ ادب وشعور میں زریں حروف سے لکھا جائے گا اور تابندہ و رخشندہ رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد سبطِ حسن 'موسیٰ سے مارکس تک'، کراچی مکتبۂ دانیال، ۱۹۹۷ء، ص ۷

۲۔ ایضاً

۳۔ محمد علی صدیقی 'روشن خیالی کی روایت اور ادب'، ماہنامہ 'طلوعِ افکار' کراچی، ص ص ۶۸۔۶۷

۴۔ سیّد سبطِ حسن 'موسیٰ سے مارکس تک'، حوالۂ سابقہ، ص ۸

۵۔ محمد علی صدیقی، حوالۂ سابقہ

سیّد سبطِ حسن

جنھوں نے اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی

کوثر رضوی

سیّد سبطِ حسن پاکستان کے ممتاز دانشور اور جانے پہچانے ادیب تھے ان کا نام اردو ادب میں ان کی معتبر اور مستند تحریروں سے عبارت ہے۔ وہ افقِ ادب پر بڑے آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوئے ان کی حیثیت اس روشن اور چمکدار ستارے کی سی ہے جو اندھیری رات میں راہ کا تعین کرنے میں مدد دے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اپنی شناخت کروائی۔ ان کی سائنٹفک تحریریں ان کے اظہارِ بیان کا وسیلہ بن سکیں۔ انہیں کسی جاہ ومنصب کے حصول کی کبھی کوئی پرواہ نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی انا کو مجروح نہ کیا نہ ہی اصولوں پر کسی سمجھوتے کے لیے سودے بازی کی۔ وہ اپنی خودداری، رکھ رکھاؤ اور محبت وخلوص کے لیے مشہور تھے۔ ان کے دوستوں نے ان کو ٹوٹ کر چاہا اور پیار بھی دیا۔ مخالفت بھی کی اتفاق بھی کیا مورد الزام بھی رہے۔ اپنے نظریات کے علمبردار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ احترام تھے جنھوں نے ان کے نظریات سے شدید اختلاف کیا مگر اپنی روش سلیقہ شعار کو نہ بدل سکے۔ یہی ان کی شان تھی اور یہی ان کی۔ آن لوگوں نے ان کو عزت بخشی۔ وہ یاروں کے یار تھے ان کے دوست احباب انہیں پیار سے سبطے بھائی کہتے۔ حلقۂ احباب میں وہ اسی نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ اختلاف رکھنے والوں نے بھی ان کی فنی عظمت کا احترام کیا۔ ان کی فنکارانہ تحریروں کی قدر کی۔ ان کی تصانیف کی پذیرائی ہوئی وہ ترقی پسند ادب

یہ مضمون روزنامہ 'جنگ' میں شائع ہوا۔ ہم نے اس کو اخبار کے لندن کے ایڈیشن بابت ۲۴ر اپریل ۱۹۸۸ء سے حاصل کیا ہے (مرتب)۔

کے دلدادہ تھے انہوں نے مارکسزم کی ترویج و ترقی، ترقی پسند نظریات اس کی تبلیغ و اشاعت اور بڑھاوے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ تاریخ اور ثقافت پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سے اپنی ذات کی وفاداری کے حوالے سے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وہ ساری عمر وابستہ رہے اور نظریاتی قدروں کو سینے سے لگائے رکھا۔

سیّد سبطِ حسن ۱۹۱۶ء میں اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے اور ۲۰ راپریل ۱۹۸۶ء کو انتقال کیا۔ وہ اس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں قدروں کا احترام ہوتا تھا۔ انہوں نے مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ روزنامہ 'پیام' سے ان کے صحافتی سفر کا آغاز ہوا۔ لکھنؤ سے ادبی رسالہ 'نیا ادب' جاری کیا۔ انگریزی روزنامہ 'پائنیر' اور 'نیشنل ہیرالڈ' سے وابستہ ہوئے اقوامِ متحدہ میں ہفت روزہ 'نیوایج' کے نمائندے کی حیثیت سے کام کیا۔ 'بمبئی کرانیکل' سے بھی منسلک رہے۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور سردار علی جعفری کے ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ترقی پسند نظریات کی حمایت کی پاداش میں وہ امریکا سے نکالے گئے، لاہور آ کر قیام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں کمیونسٹ نظریات کا حامی ہونے پر گرفتار ہوئے۔ چار سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے، ۱۹۵۷ء میں لاہور سے ہفت روزہ 'لیل و نہار' جاری کیا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران پھر گرفتار کر لیے گئے، جیل بھیجا گیا، 'لیل و نہار' کی اشاعت پر پابندی لگی، ۱۹۶۴ء میں رہائی ملی، کراچی آئے انشورنس کمپنی میں ملازمت اختیار، کی فیض احمد فیض کے ساتھ 'رائٹر گلڈ' کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۸۵ء میں کراچی پریس کلب نے ان کی علمی و ادبی خدمات ان کی فنی عظمتوں اور ان کی شخصیت کے حوالے سے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا جو جشنِ سبطِ حسن کی صورت میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی جس میں ان کے چاہنے والے ان کے قدردان ان کے پرستار اہلِ ذوق شاعر اور ادیب حضرات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، عقیدت کا نذرانہ پیش کیا اور محبت کا خراج بھی۔

سیّد سبطِ حسن ترقی پسند ادبی تحریک کے مشہور اور ممتاز رکن ہی نہیں بلکہ برصغیر کے ہردلعزیز مخلص اور بے باک صحافی، نامور ادیب اور عظیم دانشور تھے۔ وہ ایک روشن خیال ادیب تھے اور آزادیِ صحافت کے علمبردار بھی۔ ان کی تحریروں میں سچائی اور خلوص ہے، ان کے ادبی رویّے، نظریات اور علمی سرمایہ نے خصوصاً نوجوان نسل کو متاثر کیا اس طرح نئی نسل کی ذہنی تربیت کی،

انمٹ اور گہرے نقوش اس پر ثبت کیے، انہوں نے ہر تنقید کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، بحث و مباحثوں میں شدید اختلافات ہونے کے باوجود اپنے مخالفین کا ہمیشہ احترام کرتے۔ وہ ساری عمر تحقیق، جستجو اور علمی و ادبی کام میں مصروف رہے۔ عزت پائی اور ڈھیر ساری شہرت ملی انہوں نے اپنی ذات کے حصار سے نکل کر معاشرے میں مظلوموں اور غریبوں کی دردناک چیخیں سنیں۔ مارکسزم کا پرچار کیا، اجلاس میں بحث و مباحثے ہوتے، متفق ہوتے، اختلاف بھی کرتے۔ وہ خوش گفتار بھی تھے خوش لباس بھی، سادہ وضع دار اور کھرے انسان بھی۔ اپنی کج کلاہی، خودداری اور انا پر کبھی حرف نہ آنے دیا___ وہ تخلیقی اضطراب اور آزادیٔ فکر کے قائل تھے، انہوں نے تنگ نظری، رجعت پسندی اور انسان دشمنی سے نفرت کی، محبت ان کا شیوہ رہا۔ اور نظریہ سے وابستگی ان کا ایمان۔ انہوں نے انقلابی افکار و خیالات سے ذہنوں کو جلا بخشی، دل کے دریچوں کو روشن کیا، وہ گو پرانی قدروں کے دلدادہ بزرگوں کی سی مشفقانہ روش کے حامل تھے۔ کسی عہدے کو قبول کیا نہ کسی سرکاری اخبار، رسالے یا ادارے سے وابستہ ہوئے۔ سکہ بند ترقی پسندوں نے ان کی مخالفت کی، بدمزگی ہوئی شدید اختلاف بھی مگر انہوں نے کسی کی خوشامد کی نہ کسی کے آگے جھکے اور نہ دستِ سوال دراز کیا۔ ان کی اپنی ذات سے وفاداری ان کی عظمت کی دلیل اور سہارا بن سکی، وہ جیل میں رہے ظلم بھی سہے قید و بند کی مشکلات سے دوچار بھی ہوئے مگر دل کی بات زبان پر نہ لا سکے، کسی سے گلہ کیا نہ شکوہ۔ اپنے آدرش، نظریات، رویّے اور اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ وضعداری کا بھرم رکھا قدروں کو سینے سے لگایا، کسی سیاسی تحریک یا سیاسی جماعت سے وابستہ ہوئے نہ انہوں نے اپنے اوپر اس کا کوئی لیبل چسپاں کیا وہ پڑھتے رہے لکھتے رہے اور سوچتے رہے ان کا قلم ہمیشہ رواں دواں ہی رہا اس طرح کتابوں میں انہوں نے خود کو زندہ و یادگار رکھنے کا وسیلہ بنایا۔

۱۹۳۶ء میں روشناس ہونے والی اردو ادب کی ترقی پسند تحریک نے ان کے ذہن کو جلا بخشی، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اساسی رکن تھے، اسی حوالے سے نئے ذہن کے نوجوانوں نے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور تحریک کو مضبوط بنیادوں پر فعال بنانے کے لیے حلقہ بنایا، آگے چل کر اسی تحریک نے ان کی شخصیت کو اور بھی پُرکشش اور مقبول بنا دیا۔ ان کے نظریات ان کی فنی عظمت اور ان کی ثابت قدمی سے ان کے مخالفین بھی معترف ہو گئے۔ وقت اور حالات نے ان کے شریکِ سفر ساتھیوں کو اس ادبی تحریک سے جدا بھی کر دیا وہ یا تو مصائب و آلام اور سخت بندشوں

سے گھبرا کر علیحدہ ہوئے یا شدید اختلافات کی بناء پر لاتعلق ہو کر کنارہ کشی اختیار کی۔ زندگی کے اہم موڑ پر ایسے راستوں کا انتخاب کیا جہاں قدم قدم پر مشکلات اور قید و بند کی سختیاں تھیں ان تمام باتوں کے باوجود وہ انتہائی سرگرمِ عمل رہے۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں گزارنے کے وہ عادی ہوئے تکلیفوں کا مردانہ وار خاموشی سے مقابلہ کیا۔

جرمنی میں بے پناہ مظالم نئی ادبی تحریک کے قیام کا وسیلہ بن سکے کیونکہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کی فاشزم نے پورے یورپ کو سیاسی بحران کی لپیٹ میں لے لیا، ان حالات کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبا کے ذہنوں میں نئے شعور کی رونے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا براہِ راست اثر قبول کرنے والوں میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ دراصل جرمنی میں جاگیرداروں کے غنڈے اور کرائے کے قاتلوں نے ہزاروں آزادی کے متوالے حریت پسند کمیونسٹوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ناقابلِ برداشت تکالیف پہنچائیں۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ ظلم و بربریت کے یہ وہ افسوسناک اور دلخراش واقعات تھے جن کے تحت سوشلزم کو تقویت حاصل ہوئی سماج کے روندے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس کا سہارا لیا۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی نظریات اور ان سے متعلق تصنیف سے دل و دماغ روشن ہوئے، شدتِ احساس میں اضافہ ہوا، طرزِ استدلال بدلا۔ ذہنی آسودگی حاصل ہوئی سوچ کے دھارے بدلے ادبی حلقہ تشکیل دیا گیا جس میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد تاثیر، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا شامل تھے۔ سجاد ظہیر جب واپس آئے تو فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، سریندر شرما، شیون دان سنگھ، احتشام حسین اور سیّد وقار حسین نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا جہاں حیات اللہ انصاری، جاں نثار اختر، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، معین احسن جذبی اور سبطِ حسن نے ان رجحانات اور نظریات کا خیر مقدم کیا، تقویت دی اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جدوجہد کے حوالے سے کسی تحریک کو بڑھاوا دینے کے لیے ذہن نسبتاً کم تجزیاتی ہوتا ہے کیونکہ شعوری احساس کے پروان چڑھنے میں جذبۂ اظہار ہی سچائی کا ترجمان ہوتا ہے اور اسی کی بدولت دل کے دروازے پر انقلاب کی دستک صاف سنائی دیتی ہے۔

اور ادیب ہو یا شاعر اپنی فکرِ جولاں سے قلم ہی کا سہارا لیتا ہے بے کسی کا شدید احساس رکھنے والے دکھی انسان معاشرے کی چیرہ دستیوں کو مختلف جہتوں اور زاویہ نظر سے پرکھتے ہیں لیکن پیچیدہ صورتِ حال کے پیشِ نظر شدید جذبات اور خیالات میں ربط و تسلسل باقی نہیں رہتا۔ جذبے میں سچائی اور صداقت کا برملا اظہار نہ ہو تو اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی قریب کے ساتھ ساتھ حالات کے گرد تہہ بنتی رہتی ہے۔ دکھوں میں اضافہ ہوتا ہے یاس اور افسردگی سے شدتِ احساس پروان چڑھتا ہے اس طرح حالات کو پرکھنے اور نشیب و فراز سے گزرنے والا انسان ہی معاشرے اور سماج کی قدروں پر یقین رکھتا ہے لیکن جہاں نظریات، خیالات اور قدروں کا ٹکراؤ ہوتا ہے نئے رجحانات سامنے آتے ہیں، بھوک، بڑھتی ہوئی سرمایہ داری، جنگ کا خوف، عدم تحفظ کا احساس، مسائل کی یلغار، دکھوں کے انبار اور خوف و ہراس ہی بنیادی عوامل ہیں۔ اس کے ساتھ انسان کے اندر دبی ہوئی خواہشات بڑی اہمیت رکھتی ہیں مگر عملی زندگی کی مصروفیتیں سماج کی سخت بندشیں اور غیر ضروری پابندیاں اس کو خواب وخیال سے آگے جانے نہیں دیتیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ عہدِ جدید میں انسانی رشتوں میں قدر مشترک ختم ہو رہی ہے۔ زندگی کے نئے میلانات اور عصری آگہی نے مشکلات میں اضافہ کر دیا ہے، درد کے فاصلے بڑھ گئے ہیں، ہمدردیاں سمٹ گئی ہیں، غربت ہی سے بھوک شدید نفرت اور بغاوت کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ دکھ بھری زندگی، معاشی استحصال، چھوٹے چھوٹے مسائل اور دکھوں کی یلغار ہی غریب طبقے میں بغاوت کو جنم دیتی ہے۔

ان کے ادبی سفر کی ایک طویل کہانی ہے جس میں وقت اور حالات کے نشیب و فراز میں ملک میں آنے والی معاشی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ ترقی پسند تحریک سے ذہنوں میں جلا پیدا ہوئی، نئی نسل نے ان کے اثرات قبول کیے، ان حالات کے تحت احتشام حسین، سبطِ حسن، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری اور سجاد ظہیر نے متعدد کہانیاں لکھیں۔ ان کے یہاں فنی کمال ہے، مشاہدے کی قوی گرفت ہے، گرد و پیش کے ماحول کا بھرپور جائزہ ہے، اس طرح معاشرے میں تغیر و تبدل کے جاری عمل نے ان کو بہت متاثر کیا، انہوں نے معاشرے میں جنم لینے والے زندگی کے حقائق اور دکھ درد کا اظہار بیان کیا۔ ذہنی فکری اساس، تخلیقی شعور اور ادبی رویے نے ان کی فنی عظمت میں اضافہ کیا۔ ان کے دل دردمند نے سماج کے ماتھے پر لکیروں کو بغور

دیکھا، وہ طبقاتی کشمکش جبر و استحصال سماجی نابرابری کے خلاف معاشرے پر بھرپور وار کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے معاشی انحطاط، بے یقینی کی کیفیت، بحران، تلخ ترین حقائق، دردناک واقعات، تباہی و بربادی کا عمل دیکھا۔ وہ اپنی سادگی فنکارانہ عظمت اور شدتِ احساس کی بناء پر تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر و ترجمان ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا واضح اور توانا ہے۔ ان کی تحریروں میں صداقت کی دھوپ بکھری ہوئی ہے۔ ان کے یہاں فکری شعور و احساس کے بہاؤ نے ان کو سہارا دیا۔ سائنٹفک تحریروں نے ان کے اسٹائل کو زندگی دی، ان کی تحریریں نئے اندازِ فکر، نئے رجحانات اور نئے نظریات کی حامل ہیں جن میں بلا کا سوز اور کشش ہے۔ منفرد موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شایع ہوئیں جن میں 'ماضی کے مزار'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، 'انقلابِ ایران'، 'نویدِ فکر'، 'شہرِ نگاراں' وغیرہ شامل ہیں، انہوں نے سماجی اور سیاسی انقلاب کے لیے ہر بار دلوں کے دروازے پر دستک دی اور نئے سورج کے طلوع ہونے کا شدت اور بے چینی سے انتظار کیا۔ ان کا فن زندہ ہے ان کی علمی اور ادبی خدمات قابلِ قدر ہیں انہوں نے اردو کے فکری ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ وہ بے غرضی، محبت، صداقت، شرافت اور قدروں کے دلدادہ تھے۔ ان کے دوستوں میں علی سردار جعفری، جذبی، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور جوش ملیح آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

انہوں نے اپنی تحریروں سے دل کی ویران گلیوں کو آباد کیا۔ آندھیوں میں دیپ جلانے کی کوشش کی۔ اندھیری راتوں میں جگنو کی سی روشنی کا کام کیا۔ ان کی فکر انگیز تصانیف ان کی غیر معمولی عزت اور عالمگیر شہرت کا سبب بن سکیں جس میں محبت کی خوشبوئیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے فکر و فن کے آنگن میں ٹھنڈی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی تحریروں میں سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک ہے انہوں نے زندگی کے بام و در سجانے کا سلیقہ سکھایا ہے، حریت پسندی اور عظمت کے حوالے سے انسان کو جینے کا حوصلہ عطا کیا ہے، معاشرے کے روندے اور کچلے ہوئے بے کس و مجبور انسانوں کو گلے لگایا ہے، ان کی تحریریں کوئے یار سے نکل کر کوچۂ دلدار میں آئیں اور صلیب و دار کی منزلوں تک جا پہنچی ہیں انہیں رنگ و نسل، مذہب و عقیدے سے سروکار نہیں، غلامی سے شدید نفرت کا اظہار ہے۔ امن و آزادی سے ہمیشہ پیار کیا ان کے ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم بھی ہے اور آزادی کی جنگ کے لیے، حوصلہ بھی انہوں نے ہمیشہ آزادی کے چمکتے ہوئے سورج کے

طلوع ہونے کی تمنا کی نئے سویرے کا نظارہ کیا انہوں نے معاشرے کے استحصالی نظام، جبر و استبداد اور آزادی و امن کے لیے جدوجہد جاری رکھی سہمے ہوئے لوگوں کو حوصلہ دیا۔ وہ ترقی پسند اور مارکسی نظریات کے ترجمان تھے اور علمبردار بھی۔ انہوں نے اپنے مخالف نظریات رکھنے والوں میں بھی اپنا مقام پیدا کیا، شناخت کروائی اور تشخص قائم کیا۔ نامساعد حالات کے باوجود اپنی روش پر سختی سے قائم رہے ان کی قابلِ قدر تصانیف تحقیقی اور تاریخی سرمایہ سے مالا مال ہیں۔ حالات و واقعات کا تجزیہ بھی۔ ان کی سوچ، فکری اساس، طرزِ زندگی، رکھ رکھاؤ اور اسلوبِ بیاں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ علم و ادب کے لیے ساری زندگی وقف کر دی وہ اسی کے لیے جئے اسی کے لیے جدوجہد کی اور اسی کے لیے اپنی جان دے دی۔ وہ بیک وقت ممتاز مفکر و محقق ہیں دانشور، ادیب اور صحافی بھی۔ ادبی حلقوں میں ان کا نام جانا پہچانا اور انتہائی معتبر طریقے سے ان سے اختلافِ رائے رکھنے والے حضرات نے بھی ان کی ذہنی عظمت کو خلوصِ دل کے ساتھ تسلیم کیا تقریباً نصف صدی تک ترقی پسند تحریک کی راہ پر وہ گامزن رہے مگر اپنی وضع داری میں فرق نہ آنے دیا۔ ان کے قدر شناسوں نے ان کی قدر و منزلت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سبطِ حسن ہم میں موجود نہیں مگر وہ اپنی فکر انگیز تحریروں اور روشن کتابوں میں زندہ موجود ہیں۔ انہوں نے فکر و فن کے چراغ روشن کیے وہ تاریخی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور یہ بات بھی ان کے لیے باعثِ اعزاز ہے کہ وہ ساری عمر ترقی پسند نظریات سے وابستہ رہے گویا یہ وابستگی ان کی فنی عظمت اور نظریے سے وفاداری کا وسیلہ بن سکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک عظیم دانشور، بلند پایہ ادیب اور ممتاز صحافی ہونے کے ناطے ان پر کام ہونا باقی ہے اور ڈاکٹریٹ کرنے والے طلبا کو اس طرف توجہ بھی دینی چاہیے۔

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ریاض صدیقی

ایسے لوگوں کو کیسے یاد کیا جائے کس ادا سے کس اسلوب سے جو کبھی بھولے ہی نہ جا سکیں، فیض اور سبط حسن اپنے علمی وفکری مراتب کے اعتبار سے اسی قسم کے انسانوں میں سے ہیں جن کو بلاشبہ بڑا انسان اور بڑی علمی وادبی اور فکری شخصیت کا اعزاز حاصل رہے گا۔ یہی حقیقی اعزاز ہے۔ ان کے علمی وفکری اور ادبی کارناموں کو خراج تحسین پہنچانا ہی درحقیقت ان کو خراج تحسین پہنچانے کے مترادف ہے۔

سید سبط حسن کی کتنی ہی ایسی دستاویزی کتابیں ہیں جو فلسفہ وفکر، تاریخ وثقافت اور نظریات و رجحانات کے سفر کی مستند کہانی پیش کرتی ہیں اور ایک بدقسمت پسماندہ جائز حقوق ورعایات سے محروم منتشر و پریشان معاشرے کو ایک جہت، ایک نظام خیال اور شعور عصر کی سوغات پیش کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست میں ادب وشاعری کے موضوع پر کتابوں کی تعداد بہت کم ہے باوجود اس کے کہ ان کا ذوق شعر وادب اور شعور نقد بہت جامع اور اعلیٰ تھا اور اس قلمرو میں وہ زندگی بھر فعال رہے اس کمیابی پر حیرت ہو سکتی ہے تاہم ایک بار میں اور میرے دوست حسن ناصر نے اس بارے میں ان کو چھیڑا تو انہوں نے ازراہِ وضاحت ایک حقیقت کی طرف نشاندہی کی جو واقعی ترقی پسند ادبی تحریک کی تاریخیت، ہمہ گیریت اور آفاقیت کے لیے ایک سوال تھی اور اب بھی ہے۔ ان کا یہ احساس کہ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے شعر وادب تنقید اور ادبی تحریک پر

یہ مضمون 'طلوعِ افکار' کے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شامل ہے جہاں سے اس کو یہاں نقل کیا گیا ہے (مرتب)۔

بہت مربوط بڑا وسیع و جامع اور افادی کام کیا لیکن انہوں نے جملہ علوم کی دوسری شاخوں اور تعلیمی نصاب کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آنے والی نسلوں پر وہ گہرے اثرات مرتب نہ کر سکے جو روایت پسندوں اور قدامت کے ہمنواؤں نے ان اہم موضوعات پر قلم اٹھا کر کیے۔ سبط بھائی نے تن تنہا اس میدان کو اپنے لیے منتخب کیا اور زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کو اس حقیقت سے اتفاق کرنا چاہیے کہ ان کی ان کتابوں نے اس سرزمین پر موجود بعض علاقوں کی دو نسلوں کے ذہنوں میں جنبش بھی پیدا کی اور تبدیلی بھی۔ اس عہد کے جوانوں نے ان کی کتابوں سے سوچنے کا انداز اور سمجھنے کا گُر سیکھا ہے اور اس طرح وہ اردو زبان جس کے خلاف مختلف علاقائی سطحوں پر چلنے والی تحریکات کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے مختلف علاقوں کی جواں سال نسلوں کے لیے معتبر ثابت ہوئی۔ یہ ان کی اپنی زبان ہے جس نے ان کے محسوسات و عزائم اور مسائل و معلومات کو موضوع بنایا ہے۔

سبط بھائی کی ان فکری کتابوں سے قطع نظر ہم آپ کی توجہ اس اہم ادبی کتاب کی طرف لانا چاہیں گے جو وہ اپنی عمر کے آخری دور میں لکھ رہے تھے اور جس کی اشاعت ہوئی جب وہ خود موجود نہیں رہے تھے یعنی بعد مرنے کے ان کے گھر سے یہ سامان نکلا۔ 'سخن در سخن' ترتیب کے اعتبار سے آخری کتاب ہے اور اس کے آخری صفحات پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لکھنے کو باقی تھا کہ فرشتۂ اجل نے دستک دی۔ اس خوبصورت ادبی تصنیف کے مخاطب ان کے ہم سفر ساتھی اور ہم نوالہ و ہم پیالہ حضرت فیض ہیں جن کی خلوتوں کے آشنا سوائے ان کے اور کون ہوگا۔ ایک دوست کے لیے دوسرے دوست کی اس سے بہترین عطا اور ہو بھی کیا سکتی ہے اور ایک ایسے عہد میں جو دوست داری اور دوست نوازی کے آداب سے انکار ہی کو روحِ عصر تصور کرتا ہے۔ یہ بات اس معاشرے کے تناظر میں کہی جا رہی ہے جو ہمیں ملا ہے اور جہاں پانچوں انگلیاں برابر نہ ہونے کے اصول کو بہت زیادہ طبقاتی فرق کے جواز کی صورت میں بڑی آسانی سے تسلیم کر لیا جاتا ہے، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج ہر حال میں طبقاتی ہوتا ہے یعنی آقا و غلام کا سماج جہاں روپے اور نتائج میں کوئی فرق نہیں، صرف طریقہ کار اور اسلوب میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے کم و بیش تمام مذہبی علما اہل نظر اور تعلیم یافتہ حضرات اس حقیقت کو سننے سے گریزاں نظر آتے ہیں اور صدیوں سے اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اخلاقی تعلیمات اور اصلاحات کے ذریعہ، انسانیت اور مساوات کے

شعور کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ وہ فرد کے اندر تبدیلی اور انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں اور اس انتظار میں کئی صدیاں اسی طرح بیت گئیں۔ ابھی تک دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی ایسا مثالی سرمایہ دار معاشرہ نہیں بنا ہے جہاں طبقاتی فرق اور کاروباری مفادات کی وجہ سے ابھرنے والی خودغرضیاں اور ناانصافیاں موجود نہ ہوں۔ یہ معاشرہ اپنے طریقہ کار اور اپنی منطق کے اعتبار سے انسانی و اخلاقی اقدار کا دشمن ہی ہوسکتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی سطح پر انسانوں سے انسانیت اور تہذیب کے سارے رنگ و آہنگ چھین لیے ہیں چنانچہ اس ماحول میں سچی رفاقتوں اور یاری دوستی کا نبھاؤ ممکن نہیں رہتا ہے اور اگر اس ماحول میں بھولے بھٹکے دوستی یاری کا کوئی سچا انسانی رشتہ قائم ہو تو اس کو عطیہ قدرت سمجھ کر خوش ہونا چاہیے۔ فیض اور سبط بھائی کے درمیان اسی قسم کا رشتہ تھا جو ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک دائم و قائم رہا۔ ظاہر ہے کہ اس تعلق کی استواری اور پائیداری کی بنیاد فکری و نظریاتی اور ذہنی مناسبتوں کا اتحاد و اشتراک بھی تھی اور ایک مشترکہ مقصد کی تکمیل کا عنصر بھی۔ فیض نہیں رہے تو تنہائی اور یادیں رہ گئیں اور انہوں نے اس کرب ذات کو تخلیقی جہت کی طرف موڑ دیا۔ نوشابہ زبیری نے اس تناظر میں صحیح لکھا ہے کہ:

> 'دونوں نے زندگی کے کئی دور ایک ساتھ گذارے تھے ساتھ ہی دار و رسن کی صعوبتیں سہی تھیں اور زندگی کی جھنکار پر پابہ جولاں چلے تھے۔ انسانیت کے لیے سنہرے خواب بھی انہوں نے ساتھ ہی تو دیکھے تھے۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ دونوں نے زندگی کا سفر بھی تقریباً ساتھ ہی ختم کیا۔'[۱۲]

'سخن در سخن' شاعر کے کلام اور اس کے عہد پر کوئی سرسری تبصرہ نہیں ہے نہ تاثراتی جائزہ ہے بلکہ ایک شرح اور حوالہ جاتی تعبیر ہے جو سوائے سبط صاحب کے کوئی اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کتاب کا مقام کچھ حالی کی 'یادگارِ غالب' ہی جیسا ہے۔ کتنی ہی ایسی غزلیں اور نظمیں ہیں جن کی تخلیقی فضا اور واقعات و تجرباتی وقوع میں مصنف بہ ذات خود ایک گواہ کی حیثیت سے موجود تھا، کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جو صرف ان ہی کو معلوم تھیں۔ شاعری کی سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ اس کے تخلیقی سبب سے شاعر کے علاوہ کوئی اور واقف ہی نہیں ہوتا ہے۔ یہ سبب کون سی شے تھی کون سا تجربہ تھا یا کیا واقعہ تھا اشعار اس کی وضاحت نہیں کرتے ہیں۔ شاعری میں وضاحت کا عنصر اس کو بیان

(Statement) بنا دیتا ہے۔ شاعر کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی اشعار کی شرح لکھے اور استعارات و امیجز کی معنویت و اشاریت کی تشریحات پیش کرے۔ بڑی شاعری اور بڑے شاعر کے لیے تو یہ مسئلہ اور بھی نزاکت اختیار کر جاتا ہے کیوں کہ

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس

بڑی شاعری سے ایک نظام فکر وابستہ ہوتا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں اس کے اپنے رویئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسا شاعر اختلافات و اعترافات کے ہجوم میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا سابقہ ان معترضین و مخالفین سے بھی ہوتا ہے جو بات سے بات پیدا کر کے معنی و مقاصد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ اقبال کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں اور مختلف مذہبی فرقوں نے جو سلوک کیا اس کے نتائج اب ہمارے سامنے ہیں۔ وہ حقیقی اقبال جو ہمیں ۱۹۵۰ء تک کی کتابوں اور تحریروں میں نظر آتا ہے اب اس کے آثار تک باقی نہیں رہے ہیں۔ جس طبقے کو اقبال نے بری طرح مسترد کیا تھا آج وہی ان کا سب سے بڑا اور معتبر شارح اور مفسر بنا ہے۔

'سخن در سخن' میں مصنف نے ان کی نظموں اور غزلوں کو موضوع بنایا ہے ان کے عہد کی مختلف جہتوں کی نشاندہی کی ہے اور ذہنی ارتقاء کے سفر کا منظر پیش کیا ہے اور ان واقعات و محرکات کی تدریجی فہرست قلمبند کی ہے جو اشعار کی تخلیق کا سبب بنے۔ یہ جائزہ 'نقش فریادی' سے 'میرے دل میرے مسافر' تک محیط ہے گویا کتاب شاعر کے سوانحی باب کی بھی تکمیل کرتی ہے۔ ایسے بہت سے گوشے کھلتے ہیں جن کے بارے میں سوانح نگار اور نقاد بے خبر تھے۔ تحقیق و تنقید اور ادبی مطالعے کے تقاضوں کو اگر نظر میں رکھا جائے تو اس کام کی وسعت و اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ فیض صرف آج کے نہیں آنے والے زمانوں کا بھی حوالہ ہوں گے ان کا رشتہ صرف برصغیر ہی سے نہیں بلکہ افریقہ و ایشیا، جنوبی امریکہ، وسط ایشیا، مغرب اور تیسری دنیا سے بھی ہے۔ ان کے اثرات ان علاقوں میں بسنے والی نسلوں نے قبول کیے ہیں۔ شعر قاری کو اپنے آہنگ و تاثر معنی مقصد اور جمالیاتی تناظر کے ذریعے اپنی دنیا میں لے آتا ہے اور ان تجربوں اور محسوسات کا انکشاف کرتا ہے جو قارئین کے تجربات و محسوسات کی بھی ترجمانی ہوتے ہیں اس مرحلے پر قارئین شعر اور شاعر دنوں کو اپنی ذات میں سمو لیتے ہیں اور اگر اس لمحۂ اتحاد میں یہ علم ہو جائے کہ شعر کس موقع یا واقعے سے نسبت رکھتا ہے تو مسرت و آسودگی کا نقطۂ منتہا قارئین کی پوری شخصیت کو ایک نئی کروٹ دیتا

ہے۔ 'سخن در سخن' کے ذریعے قارئین کی ملاقات اس فیض سے ہوگی جو بنگلہ دیش بڑے شوق سے گیا تھا کہ سب یار آشناؤں سے ملاقات ہوگی مگر وہاں تو سارا وقت ہوٹل کے ایک کمرے میں بند رہنا پڑا اور دوستوں سے ملاقات کی تمنا بھی پوری نہیں ہوئی۔

دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی　　کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

ان کے دیس نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تھا مگر ان کے اپنے ذہن نے اس کو قبول نہیں کیا کیوں کہ دیس کے جسم کا ایک بازو کٹ کر علیحدہ ہوا تھا۔ یہ ان کے لیے ایک المیہ اور سانحہ تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ محض ایک ایڈونچر تھی جس کو ہمارے اکثر معروف شاعروں اور افسانہ نگاروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اس ایڈونچر نے ان کی حب الوطنی کو کچھ اس طرح جگایا کہ فیض صاحب تنقید سے نہ بچ سکے اور ایک ایسے محبِ وطن کو جس کی حب الوطنی مستند تھی ان الزامات کو کڑوے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارنا پڑا۔ مگر ۱۹۷۱ء میں جب سرزمین کا بازو کٹ کر علیحدہ ہوا تو شعر وادب کی قلمرو سے کوئی آواز نہیں اٹھی مگر جب فیض صاحب خیر سگالی کے ایک وفد کے ساتھ پہلی بار بنگلہ دیش گئے تو شرحِ فراق یار کیے بغیر نہ رہ سکے اور واپسی پر مرثیہ سقوط ڈھاکہ لکھا۔ 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی۔' اس عنوان پر ان کی بہترین نظم ہے۔

ان اشعار کو سن کر پاکستان کے سابق چیف جسٹس اور الیکشن کمشنر نے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اسلام آباد چھوڑ کر چلے گئے تھے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا کہ 'فیض صاحب خون کے دھبے برساتوں سے نہیں دھلا کرتے۔'؟

سبط حسن صاحب ۱۹۷۰ء کے بعد شعر وادب پر لکھنے سے گریز کرنے لگے تھے اس لیے نہیں کہ وہ شعر وادب کو دوسرے علمی موضوعات سے کم تر سمجھتے تھے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے فلسفہ وفکر، تاریخ وثقافت، علمی وادبی نظریات اور فکری مسائل پر لکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کی تکمیل کو ضروری تصور کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا شعری وادبی اور تنقیدی مذاق تعطل کا شکار نہیں ہوا اور 'سخن در سخن' میں جب انہوں نے شعری مسائل اور ادبی نظریات کو اپنا موضوع بنایا تو ان کی سرشت میں چھپا ہوا نقاد وتخلیق کار ایک بار پھر نقاب الٹ کر باہر آ گیا اور انہوں نے ادبی اسلوب میں اپنے ادبی وفکری اور تخلیقی وتنقیدی جوہر کا برملا اظہار کیا۔

'ادب ایک انکشاف ہے۔ بڑا ادیب معاشرے اور فرد کے باطنی تموجات

اور محرکات کا سراغ لگاتا ہے، جو پنہاں ہے اس کو عیاں کرتا ہے اور حقائق
ہستی کے ان گوشوں کو روشن کرتا ہے جو عموماً ہماری نظروں سے اوجھل
ہوتے ہیں۔ ہر صاحب فکر شاعر کی اپنی مخصوص رمزیات ولفظیات بھی
ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے، لہٰذا اس
کے مطالب ومفہوم کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس کی لغت سے اس کی
علامتوں اور استعاروں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔'[۲۳]

'فیض اور کلام فیض کے ایک روشن خیال مداح کو بھی یہی شکایت ہے کہ ''فیض کمٹ منٹ کے شاعر ہیں لیکن یہ کمٹ منٹ ان کے اشعار کی سطح پر تیرتا نظر آتا ہے اگر کسی کو ان کے خیالات و نظریات کا پہلے سے پتہ نہ ہو تو محض ان کے کلام سے سراغ لگانا مشکل ہے'' مگر فن کی خوبی تو یہ ہے کہ فنکار کی وابستگی سطح آب پر نہ تیرے ورنہ وہ آرٹ نہیں بلکہ خالص پروپیگنڈہ بن جائے گا اس کے برعکس فن کا کمال یہ ہے کہ فنکار کی وابستگی کی لہریں تہہ آب گہرائیوں میں آہستہ آہستہ بہیں۔'[۲۴]

حقیقت بھی یہی ہے۔ ترقی پسند نقادوں اور شاعروں نے شعروادب کو خالص پروپیگنڈہ کا ان معنوں میں ذریعہ کبھی نہیں بنایا جن معنوں میں اس کا ذکر اس مکتبہ فکر سے اختلاف رکھنے والوں نے بڑے زور شور سے کیا ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔ گذشتہ سالوں میں خود کو ترقی پسند قرار دینے والے ایک پیشہ ور صحافی نے بھی مخالفین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ترقی پسندوں کی ان خامیوں کی فہرست گنوائی ہے۔ جس کا ذکر ۱۹۴۰ء کے بعد سے جاری ہے اور سراسر مہمل ہے لیکن وہ پھر بھی معتبر ترقی پسند ہی قرار پائے۔

'سخن در سخن' نے صنفِ تشریح کو تنقید وتاریخ کے تانے بانے میں پرو کر وہ اسلوب بخشا ہے جس کی عمومی مثالیں ہمیں مغربی ادب میں ملتی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی ادبی وشعری تاریخ میں یہ شعبہ ہمیشہ بہت کمزور رہا ہے۔ فیض نے کہا ہے۔

یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا　　گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا

اس کی شان نزول کا ذکر کرتے ہوئے سبط صاحب لکھتے ہیں:

'فیض صاحب کربلائے بیروت سے جب لٹ لٹا کر وطن واپس آئے تو
ان کے شہر نگاراں میں ہو کا عالم تھا۔ مانا کہ لاہور میں دودھ شہد کی نہریں

نہیں بہتی تھیں نہ ہن برستا تھا لیکن اتنا سناٹا تو نہ تھا اتنی نفسا نفسی تو نہ تھی،[۵]

یہ ۱۹۸۰ء کے بعد کا لاہور شہر ہے۔

ایک اور مقبول شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

'دادا منصور فروری ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے اور جون میں وفات پا گئے۔ فیض صاحب شیخوپورہ میں ان کے جنازے میں تھے۔ سی آئی ڈی والے بھی موجود تھے ان کو دیکھ کر بولے آج ایک فائل ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا البتہ کچھ نئے فائل کھل جائیں گے واپس آ کر انہوں نے وہ غزل نما مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے۔

تیرے غم کو جاں کی تلاش تھی تیرے جاں نثار چلے گئے　　　تیری راہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ راہ گزار چلے گئے[۶]

بنگلہ دیش کا واقعہ اور عرب اسرائیل جنگ فیض صاحب کے دورِ آخر کی وہ اہم کڑیاں ہیں جن کے بارے میں کم و بیش ساری ہی مستند اور اہم معلومات اس کتاب کی عطا ہیں۔ اس سلسلے کی ایک زیادہ اہم کڑی وہ باب ہے جو بھٹو صاحب کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب وہ با قاعدہ سرکاری انجمن میں بطور رکن شامل ہوئے تھے۔ اسلام آباد کی یہ زندگی بقول مصنف ان کے لیے ایک عذاب سے کم نہ تھی۔ اس حوالے سے جن واقعات و تجربات کا ذکر ہوا ہے ان کی صحت میں کسی شک کا سوال ہی نہیں اُبھرا۔ تاہم اس مسئلے پر تھوڑا سا تنقیدی (Critical) مطالعہ ضروری تھا جو اس کتاب میں نہیں ہوا ہے۔ بھٹو دور کو بعض معتبر اور معروف ترقی پسندوں نے جس حکمت عملی کے تحت سراہا تھا وہ اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہے مگر اس کے نتائج نہ صرف مایوس کن بلکہ غیر متوقع حد تک مضر ثابت ہوئے۔ ترقی پسند اور انقلابی شعور کو جتنا نقصان اس دورِ حکومت نے پہنچایا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس دور کی عوامی سرکار نے عوام کا نام لے کر تاریخ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو زنجیر کر دیا اور وقت کے پہیے کو پیچھے کو طرف گھما دیا۔ فیض صاحب کے لیے اس صورت حال سے جان چھڑا لینا کوئی مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ بعد میں ان کو اپنی اس کوتاہی کا احساس ہو گیا تھا لیکن اس سلسلے میں مصنف نے ان کی ایک نظم کا جو لندن میں کہی گئی تھی ذکر نہیں کیا۔ یہ نظم دراصل ان سوالات کا جواب تھی جو اس حوالے سے لندن میں کیے گئے تھے۔ یہ ان کی بلندی اور وسعت نظر تھی کہ انہوں نے ترقی پسندوں کی بعض غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ یہ نظم نئی نسل کے لیے ایک پیغام چھوڑتی ہے اور اس سچائی اور خلوص کا مظہر ہے جس سے وہ مرتے دم تک دستبردار نہیں ہوئے۔ 'میرے دل

میرے مسافر' کے بعد کا شعری دور بعض وجوہات کی بنا پر ان کی زندگی کا سب سے اہم دور تھا لیکن سبط صاحب اس دور تک پہنچنے سے پہلے ہی چلے گئے ورنہ ان حاشیہ آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کا منہ نہ کھلتا جو ان کی وفات کے بعد کھل گیا۔ فیض صاحب کی آخری غزل بھی اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے جو انہوں نے ۱۹؍نومبر ۱۹۸۴ء سے چند روز پہلے کہی تھی جب ان کی وجدان نے یہ خبر دی۔

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

حوالہ جات

۱۔ سبط حسن، 'سخن در سخن' کراچی مکتبہ دانیال، ۲۰۱۶ء ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۷۷

۳۔ ایضاً، ص ص ۲۵۔۲۴

۴۔ ایضاً، ص ص ۲۶۔۲۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۶۔ ایضاً، ص ۴۷

سبطِ حسن کی یاد میں

ڈاکٹر صلاح الدین حیدر

سیّد سبطِ حسن عمر بھر شیشہ ے کی طرح کھنکھناتے ہوئے سرخ رنگ اسلوب کے ساتھ زندہ رہے اور ہاتھ سے گر کر ٹوٹنے والے پیانے کی طرح اچانک دنیا سے رخصت ہوئے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور یقین اس لیے بھی نہیں آتا کہ مرنا تو غلاموں کا مقدر ہے آزادی کے لیے جینے اور لڑتے والے کبھی نہیں مرتے۔ سیّد سبطِ حسن عمر بھر پرومیتھیس کی طرح غلامی کے نمائندوں سے مکالمہ کرنے سے منکر رہے لیکن جنوبی ایشیاء کے پرومیتھیس کی ٹریجڈی یہ ہے کہ غلام خود اپنے تکبر سے سرشار پرومیتھیس سے مکالمہ نہ کرنے کو اپنی فتح کے جشن کی طرح مناتے رہے ہیں پھر بھی پرومیتھیس مر نہیں سکتا 'موسیٰ سے مارکس' تک کتاب کے ٹائٹل کے پس منظر میں وہ برملا کہتا ہوا امر ہو جاتا ہے

'The fire of arrogance must be fought with fire.'

کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تقریبات کے سلسلے میں کراچی میں ہم نے انہیں سب سے متحرک باعمل اور فکر انگیز باتیں کرتے پایا۔ وہ منتظم تھے اور مہمانوں سے بھی رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس تحریک کے مفکر تھے، اور قوتِ استدلال سے مربوط انگریزی اور اردو زبانوں میں فی البدیہہ تقاریر سے نوازرہے تھے۔ سبطِ حسن کی ساری زندگی ہی ایسی مصروفیات سے عبارت رہی۔ انہوں نے جنوبی ایشیاء کے اس خطے میں الہیات پرستی کی مقامی لچھے دار، تاجرانہ اور خانقاہی منطق کے اسلوب کی سیاست کا پردہ چاک کیا اور عقلیت پرستی کے اس راستہ کو اختیار کیا جس

پر چلنے کی وجہ سے برونو کو زندہ جلایا گیا تھا سر سیّد اور اقبال پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا تھا۔

سبط حسن نے اس ذہن کی آبیاری کی جو ذاتی اور نجی ترقی کے لیے علم حاصل نہیں کرتا بلکہ علم کو تمام انسانوں کی آزادی کی تحریک کے لیے وقف کرتا ہے اس حوالے سے سبط حسن نے اپنی ذات کو ترقی پسند تحریک کے ادبی منشور کے لیے موقف کیے رکھا۔ وہ اعظم گڑھ میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کے تہذیبی اور علمی ماحول میں عنفوان شباب اور جوانی کے بھرپور روز و شب گذارے۔ اپنے عہد کے علمی مشاہیر سے رابطہ کیا۔ یہ دور تھا جب پہلی جنگ عظیم کے تصادم میں سامراجیت کی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں اور روس کا اکتوبر انقلاب ایک نیا شعور اور ولولہ لے کر آیا تھا سبط حسن نے جب ہوش سنبھالا تو اس انقلاب کے اثرات برصغیر کے فکر و نظر کے حلقوں تک پہنچ چکے تھے اور اقبال لینن سے خدا کے حضور میں کہلوا چکے تھے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

سبط حسن عالمی انقلابی لہروں کے تلاطم سے متاثر تھے اور قومی زندگی پر مسلسل برطانوی ظلم و ستم نے ان کے اس عزم کو پختہ کر دیا تھا کہ وہ آگ کے قانون کو ضرور جان کر آتش عصیاں کی طرح بھڑکائیں گے اس عزم و ارادے کی پختگی کے باوصف وہ قیام پاکستان سے قبل ایک بار امریکہ بھی جا پہنچے تھے اور وہاں سے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر نکالے گئے تھے۔

آفریں باد کہ اس جبر مشیت پہ بھی ہے
دست انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

(جوش)

سبط حسن کی جوانی کے ایام میں ذہن کی جذباتی سطح محض غلامی کا ابال نہیں تھا جس طرح ہم عصر ادبی رویوں میں نظر آتا ہے بلکہ آزادی کی جدوجہد کی آگ میں جلتے ہوئے ایک مستقبل کی امید تھی۔ ان کا دور بھی ایسا تھا وہ ایک انقلابی مجاہد تھے اور ترقی پسند تحریک کے قیام سے اپنی وفات تک انہوں نے اپنے مشن کو پیش نظر رکھا۔ ان کی شخصیت میں ایک باکمال استقامت تھی۔ ایسی مجاہدانہ بات جس سے استعماریت کے کنگرے گر جائیں وہ اس اعتماد اور شائستگی سے کہتے تھے کہ ان کے مخالف بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اپنی تمام تر عملی تحقیقی مصروفیات کے باوصف وہ

منکسرالمزاج، حلیم، شائستہ، حددرجہ ملنسار، خوش اخلاق اور وضع دار انسان تھے۔ حالانکہ ان خوبیوں کی نمود و نمائش کرنے والے عام طور پر اس کے برعکس یا پھر بے وقوفی کا صحت مند ایڈیشن یعنی محض اور محض شریف النفس نکلتے ہیں۔ سبط حسن ہمارے عہد کے پیشہ ور شاعروں، ادیبوں کی ذاتی تشہیر کے لیے دھڑے بندیوں سے قطعاً بے نیاز تھے۔ بلکہ ان کے بارے میں ایسا سوچنا ہی عجیب لگتا ہے۔ وہ اپنے تجزیوں سے اور فکر انگیز خیالات کی نمائندگی سے انسانی نجات اور امن کی تحریک کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ ادب کے ناطے کہے گئے اپنے ہر جملے میں وہ بطور ادیب اپنی تاریخی ذمہ داری نبھاتے تھے۔ وہ برملا اختلاف کی جرأت سے بنیاد پرست قسم کی روایتی شائستگی یا سنجیدگی کو ناراض کر لیتے تھے لیکن ان کے اختلافات مطالعے اور تاریخی شعور کو منعکس کرتے تھے۔ وہ کسی سے ذاتی رنجش نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہر حال میں اپنے استدلال سے نہیں ہٹتے تھے۔ برصغیر کی سماجی جدوجہد کی تاریخ میں طویل عرصہ تک فعال رکن رہنے اور پاکستان کی ادبی، سیاسی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کرنے کے باوجود وہ تاریخ کے 'پاکستانی ارتقاء' کے قوانین کو کسی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے۔ محترمہ سعیدہ گزدر صاحبہ کے لفظوں میں 'سبط صاحب کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص بھی ناگزیر نہیں ہے'۔ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ 'افکار' کے صہبا لکھنوی صاحب نے انہیں آمادہ کر لیا تھا کہ وہ 'افکار' کے لیے اپنے سوانحی حالات قلم بند کریں۔ جس کے جواب میں ایک قسط نظر سے گذری تو میں نے خط لکھ کر اس کاوش پر تحسین کا اظہار کیا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا۔ 'مجھ کو اپنے کارنامے تو لکھنے نہیں کہ قلم اٹھاؤں اور لکھنا شروع کردوں۔ بلکہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی ملکی سیاست اور تہذیبی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔' (۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء)۔

سبط حسن کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ مشکل کاموں کو اپنے لیے آسان سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ محنت کش لوگ ہی معاشرے اور کلچر کے حقیقی معمار ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں تاریخ کے مطالعے کے دوران سماج کے ارتقاء کے مختلف ادوار کا جائزہ سماجی سائنس کے اصولوں کی روشنی میں لیتے تھے۔ وہ تاریخ کے جس دور پر بھی قلم اٹھاتے پہلے اس کی روح میں اتر جاتے تھے چنانچہ 'ماضی کے مزار' میں انہوں نے قدیم عراقی تہذیب اور اس حوالے سے انسان کے گذشتہ ادوار کے سماجی عمل اور اس کو منعکس کرنے والی تہذیبی ثقافتی اور ادبی روایات کا سراغ لگایا۔ پھر پاکستان میں تہذیب کا ارتقا لکھ کر انہوں نے ہماری تہذیب، ثقافت اور تاریخ کے قدیم ماخذوں کی انتہائی

درست حوالوں کے ساتھ نشاندہی کی اور آج کے سماج کی تشکیل کے سوالات کا اس عہد کے ماخذوں سے ربط تلاش کیا۔ انہوں نے 'نوید فکر' لکھ کر 'سیکولرازم' جیسے موضوع پر غلط فہمیوں کو دور کیا اور اس اصطلاح کے گرد غبار کو دھویا اور ریاست، معیشت اور تاریخ کے عمل کو آگے بڑھانے والی قدروں کی نشاندہی کی انہوں نے اپنے کتاب 'موسیٰ سے مارکس تک' میں انسانی فکر کے ارتقا کی داستان بیان کی۔

اور اس عنوان کے تحت انہوں نے مغرب کے اثباتی اور سرکاری دانشوروں کے طلسم کو توڑا کہ تہذیب کا ارتقاء یونان سے شروع ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے عروج کے ساتھ ساتھ انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے ایرانی انقلاب کی ہلچل کے دور میں ایران کی تاریخ کو تنقیدی نظر سے پرکھا۔ اور 'انقلاب ایران' کے عنوان سے ایک مربوط دستاویز مرتب کی۔ سبط حسن تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی باتیں کرتے ہوئے محض ایک روکھے فلسفی نہ تھے بلکہ وہ انسان کی امنگوں سے محبت کرتے ہوئے اس کی ترجمانی کرتے اور ایک شاعرانہ مزاج بھی رکھتے تھے۔ اپنی کتاب 'شہر نگاراں' کا ذکر کیا ہے۔ سبط حسن کام کرنے والے لوگوں کو تاریخ کی اصل قوت ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے لیے عمل اور کام بھی کرتے تھے۔ اس انقلابی عمل میں انہیں اذیتوں تکلیفوں کا بھی سامان کرنا پڑا۔ وہ قیام پاکستان کے بعد اپنی دھرتی کے زندہ، متحرک مسائل سے بڑی تندہی سے وابستہ ہوئے۔ وہ ادارہ 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' سے وابستہ رہے۔ ہفت روزہ 'لیل ونہار' کے مدیر رہے۔ وہ صحافت کے شعبے میں تخلیقی رویوں کے ترجمان رہے۔ لیکن سرکاری مشینری کا عتاب ان پر بھی آیا۔ وہ راولپنڈی سازش کیس کے الزام میں طویل عرصہ تک اسیر رہے اور اپنے ساتھیوں سجاد ظہیر، میجر اسحاق، فیض احمد فیض وغیرہ کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پاکستان میں جب بھی جمہوریت کی لہر آئی انہوں نے جمہور کے تاریخی شعور کی ترجمانی کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کراچی سے 'پاکستانی ادب' کا اجراء کیا۔ جس کی معاون محترمہ سعیدہ گزدر تھیں۔ جب تک یہ پرچہ نکلتا رہا اس نے پاکستان کے ترقی پسند ادبی حلقوں میں ایک گہما گہمی پیدا کیے رکھی۔ سبط حسن کے فکر انگیز اداریے اس ادبی جریدے کا اہم حوالہ تھے۔ اسی دور میں ملتان کے احباب نے انہیں ادب اور سماجی عمل، مذاکرے میں شرکت کی دعوت دی تھی اور وہ ملتان کے دوستوں کی پذیرائی اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے تھے اور جن لوگوں کے ساتھ بھی ان کا محبت اور خلوص کی

زبان میں مکالمہ رہا اس کو انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا۔

پھر سبط حسن کے ساتھ گونا گوں مشکلات کے باعث طویل مدت تک رابطے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن یہ اطمینان ہمیشہ رہا کہ ایک عام آدمی کے طور پر ایک نئے دور کے لیے جو میرے خواب ہیں سبط حسن انہیں فکر کی زبان دے دیتے ہیں۔ سبط حسن سے مل کر یہی محسوس ہوا کہ تمام انسانیت ایک برادری ہے اور اس کے تمام مسائل کو اسی طرح حل کرنا ہے جیسے ایک کنبے کے افراد کو اپنے مسائل حل کرنا ہوتے ہیں۔ اگر تمام انسانیت نے عالمگیر سطح پر ایک برادری کے تصور کو اپنانے کے لیے انقلابی ذہن بنالیا تو یقیناً اسٹار وار اور ایٹمی اسلحہ کے انبار پرسکون فضا میں نیست و نابود کیے جاسکتے ہیں اور یہ سرمایہ انسانی تہذیب و ثقافت کی تعمیر کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے لیکن ابھی تک عظمت انسان کا خواب بھی شاعرانہ صداقتوں سے قطع نظر حقیقی زندگی میں شیخ چلی مرحوم کے تشنہ منصوبوں کا ہی ایک جزو ہے۔

سبط حسن اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی انتہائی بھرپور اسمارٹ خوش مزاج اور زندگی کے پر امید رویوں سے سرشار تھے۔ ترقی پسند تحریک کی کراچی کی تقریبات میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ گریبان کھلا ہوا بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ انتظامی مصروفیات میں الجھے مندوبین سے فکری مسائل پر بھی تبادلہ خیالات کررہے ہیں۔ پھر وہ شفاف پیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس خوش مزاجی سے مندوبین کے ساتھ چائے پیتے اور گپ شپ کرتے ہوئے بھی نظر آئے۔ وہ اپنے مزاج کی انہی خوبیوں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کے لیے لکھنؤ پہنچے تھے۔ میر فاطمی صاحب بھی ان دنوں ملتان سے بھارت پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ اور یوں وہ ترقی پسند تحریک کی مصروفیات ہی کے سلسلے میں پہنچے تھے۔ لیکن دلی سے آگے وہ لامکاں کے سفر پر جانکلے۔

ایسا لگتا ہے کہ سبط حسن زندگی کی عوام ایکسپریس کے تھرڈ کے ڈبے میں ہمارے ساتھ سوار تھے وہ مسافر کی طرح دنیا میں آئے تھے ان کا اسٹیشن آیا تو کوٹ کاندھے پر لٹکایا اور ہاتھ اٹھا کر الوداع کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گئے لیکن عوام ایکسپریس کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے تک سفر جاری رکھنا ہے۔

سبطِ حسن کا فکری کارنامہ

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

'حیات اور موت کا رشتہ ابدی ہے اور ہم سب جو زندہ ہیں، ہر لمحہ موت ہی کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ البتہ اس سفر کی نوعیت کا فیصلہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے اور یہ بھی کہ ہم اپنا سفر حیات بخش قوتوں کے ساتھ طے کریں یا موت کی قوتوں کے سائے میں۔ جینے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ کہ آدمی جب تک زندہ رہے، زمین کا بوجھ بنا رہے اور لوگ اس سے پناہ مانگتے رہیں۔ حتیٰ کہ اس کا جنازہ بھی وبال دوش ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان جب تک زندہ رہے دوسروں کی زندگی کا سہارا بنا رہے اور مرتے وقت نہ اپنی ذات سے نادم ہو اور نہ دنیا والوں سے شرمندہ۔'[1]

یہ جملے سیّد سبطِ حسن صاحب نے ۱۹۷۳ء میں سجاد ظہیر کی وفات پر تعزیتی مضمون میں تحریر کیے تھے۔ سجاد ظہیر جو ایک انقلابی رہنما اور مارکسی مفکر ہونے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں بھی شامل تھے، ساری عمر ابنائے وطن کے سماجی شعور کی بیداری اور ترقی پسند فکر کے فروغ میں مصروف رہے۔ سبط صاحب نے ان کی وفات پر چند فقروں میں وہ پورا فلسفۂ زیست سمو دیا تھا جس کا سجاد ظہیر کی زندگی ایک عملی پرتو تھی۔ اسی فلسفۂ زیست کی ایک باعمل اور متحرک تفسیر

پہلے پہل یہ مقالہ کراچی سے نکلنے والے جریدے 'ریسرچ فورم' کے 'سبطِ حسن نمبر' بابت اگست ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں 'طلوعِ افکار' نے اس کو اپنے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شامل کیا۔ یہ شمارہ سبطِ حسن سے منسوب تھا (مرتب)۔

خود سبط صاحب کی اپنی زندگی بھی تھی جو تمام و کمال حیات بخش قوتوں کی ہم رکابی اور مرگ آفریں قوتوں سے ستیزہ کاری میں بسر ہوئی۔ حیات کی کشمکش میں زمانہ سازی اور ترقی پسندی کی قوتوں کے ساتھ مل کر چلنے ہی کو انہوں نے اپنا مقصد حیات بنایا تھا۔ یہی مقصد حیات ان کی سب سے قیمتی متاع تھا جس کی وہ آخر وقت تک حفاظت کرتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب کہ وہ ضعیف العمری اور عدیم الصحتی کی بناء پر بہت زیادہ جسمانی مشقت کے اہل نہیں تھے انہوں نے ڈاکٹروں کے مشوروں کے علی الرغم انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وسط ۱۹۸۵ء میں وہ لندن کی تقریبات میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد کراچی میں ہونے والی تقریبات میں تو ان کی حیثیت روح رواں ہی کی تھی۔ بعدازاں وہ اسی سلسلے کی تقریبات میں شرکت کے لیے ہندوستان تشریف لے گئے۔ وہاں بھی دن رات مصروف رہے اور انہی مصروفیات کے اژدھام میں ان کی زندگی کی شام ہوئی۔ یوں ان کی حیاتِ طبعی کے آخری لمحات بھی زندگی کو زیادہ حسین اور بامعنی بنانے کی اس لازوال انسانی جدوجہد کی نذر ہوئے جو ان کا آدرش تھی اور جس کے ساتھ انہوں نے عہد شباب میں پیمانِ وفا باندھا تھا۔ یقیناً وہ دمِ آخر نہ اپنی ذات سے نادم رہے ہوں گے اور نہ دنیا والوں سے شرمندہ۔

سر کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم　　　دل و جاں فدائے راہ ہے کبھی آ کے دیکھ ہم دم

سبط صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ سیاست، صحافت، تصنیف و تالیف، سیاحت غرض ان کی دلچسپیوں اور مصروفیات کا میدان بڑا وسیع تھا۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ ہوئے وہاں انہوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ اکثر مولوی عبدالحق کا قول دہرایا کرتے تھے کہ نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اس قدر محنت اور انہماک کے ساتھ کام کریں کہ ان کے بعد ان کے خلا کو کوئی بھی پر نہ کر سکے۔ سبط صاحب نے جواں سالی میں سنا ہوا یہ قول آخر عمر تک یاد رکھا اور آج جب کہ وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کئی خلا ہیں جو صرف ان کی ایک ہستی کے اٹھ جانے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

سبط صاحب کی خدمات کثیر الجہات ہیں۔ ان میں سے ہر جہت اپنی جگہ ایک طویل موضوع ہے جو اہم بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ سب سے پہلے وہ ایک سیاسی کارکن اور رہنما تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل اور اس کے فوری بعد ملک میں سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کے لیے کوشاں

نقلابی عناصر کے دوش بدوش بے لوث کام کیا۔ اس جدوجہد میں انہیں بار بار غیر معمولی صعوبتوں کو سہنا پڑا۔ ان پر مقدمات قائم کیے گئے، وہ قید و بند کی آزمائشوں سے بھی گزرے مگر ان سب دشواریوں کے باوجود نہ تو ان کے قدم ڈگمگائے اور نہ ہی ان کے جذبۂ عمل میں کمی آئی۔ البتہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے نتیجے میں ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگادی گئی، سیاسی جماعتیں کالعدم ٹھہریں، سیاسی رہنما گرفتار کیے جانے لگے تو وہ رہی سہی سیاسی آزادی بھی مفقود ہوگئی جو مارشل لاء سے پہلے میسر تھی۔ یوں تو مارشل لاء کے تازیانے کم وبیش سب ہی سیاسی قوتوں پر پڑے مگر بائیں بازو کے انقلابی عناصر خصوصی طور پر اس کی زد میں آئے۔ سبطِ حسن کو بھی مارشل لا کا تحفہ پروانۂ گرفتاری کی صورت میں ملا، اور جب رہائی ملی تو سیاست کے امکانات بظاہر بالکل ختم ہوچکے تھے۔ سبط صاحب نے اس کے بعد عملی سیاست میں تو پھر کبھی سرگرمی سے حصہ نہیں لیا البتہ سیاسی مسائل ان کے تجزیوں کا موضوع ضرور بنتے رہے۔

سبط صاحب کی شخصیت کا دوسرا پہلو ایک صحافی اور ایڈیٹر کا تھا۔ وہ سیاست کی وادی میں بھی صحافت ہی کے راستے سے آئے تھے۔ صحافت کا آغاز انہوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں کردیا تھا۔ علی گڑھ میں انہوں نے اختر حسین رائے پوری کے ساتھ ہفت روزہ 'پیام' نکالا تھا جو جلد ہی بند ہوگیا تھا، اس کے بعد وہ 'بمبئی کرانیکل' میں چلے گئے۔ صحیح معنوں میں یہی ان کی اولین صحافتی تربیت گاہ تھی۔ قیام پاکستان سے قبل انہوں نے مختلف اوقات میں 'نیشنل ہیرالڈ'، 'قومی جنگ' اور 'پیپلز وار' میں مضامین لکھے۔ پاکستان بننے کے بعد 'امروز'، 'پاکستان ٹائمز'، 'لیل ونہار'، 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں ان کے رشحاتِ قلم جگہ پاتے رہے۔ 'لیل ونہار' کے تو وہ ایڈیٹر ہی تھے۔ یہ پرچہ دوبارہ نکلا اور بند ہوا۔ انہوں نے اس پرچے کو، کم از کم اس کے دورِاوّل (۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء) میں وہ صوری و معنوی حسن بخشا جس کی نظیر پاکستان کی ہفت روزہ اردو صحافت میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا تو 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' کی طرح 'لیل ونہار' بھی آمریت کی تحویل میں چلا گیا۔ سبط صاحب کو پرچے کی ادارت سے الگ کردیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں 'لیل ونہار' کا ازسرنو اجرا کراچی سے ہوا۔ اس بار یہ پرچہ صرف دو سال زندہ رہنے کے بعد نامساعد حالات کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد وہ 'ڈان' اور ہفت روزہ 'ویو پوائنٹ' میں وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے اپنی ان صحافیانہ

تحریروں میں ان تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے جن سے ہمارے عہد کو سابقہ پڑا ہے۔ یہ تحریریں اپنی جگہ مستقل حیثیت اور اہمیت کی حامل ہیں۔

سبط صاحب کی شخصیت کا تیسرا اور سب سے اہم اور وقیع پہلو ایک صاحبِ نظر ادیب اور مارکسی دانشور کا ہے، گو ان کی زندگی کے سب ہی پہلو بہت اہم ہیں مگر ایک ادیب کی حیثیت سے انہوں نے جو فکری کارنامے سرانجام دیئے وہ ان کی بنیادی وجۂ شہرت قرار پاتے ہیں۔ زندگی کے آخری عشرے انہوں نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں گزارے اور ایک قابلِ ذکر سرمائے میں انگنت مضامین کے علاوہ چھ مستقل کتابیں یعنی 'شہر نگاراں'، 'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'انقلاب ایران' اور 'نوید فکر' ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کے اب تک کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ انتقال کے وقت وہ اپنی انگریزی کتاب، پاکستان میں افکار کی جنگ، (The Battle of Ideas in Pakistan) پر کام مکمل کر کے اسے پریس کے حوالے کر چکے تھے۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد منصۂ شہود پر آئی۔ ایک اور تصنیف جس پر انہوں نے اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا، فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے پر مشتمل تھی۔ اس کتاب کا آخری باب ابھی لکھنا باقی تھا جو وہ فیض کے ثقافت کے موضوع پر خیالات کے حوالے سے لکھنا چاہتے تھے مگر زندگی نے انہیں اس کی مہلت نہیں دی۔ یہ کتاب ابھی حال ہی میں 'سخن در سخن' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ بے وقت موت نے سبط صاحب کے بعض دوسرے علمی منصوبوں کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی مہلت نہیں دی۔ ان منصوبوں میں خاص طور سے 'مارکس اور مشرق'، قابل ذکر ہے۔ اس میں مشرقی دنیا کے حوالے سے کارل مارکس کے افکار کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اقوام مشرق پر مارکسزم کے اثرات کا جائزہ بھی مقصود تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے نہایت عرق ریزی بھی کی تھی اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان، مشرق وسطیٰ، انگلستان اور امریکہ سے بہت سا مواد بھی اکٹھا کیا تھا۔ ان کے کاغذات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات پر مشتمل نوٹس اور بعض ابواب کے ابتدائی مسودوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر ایک مبسوط اور مستند کتاب کے نقطۂ نظر سے خاصا کام مکمل کر لیا تھا اور اگر وہ زندہ رہتے تو شاید دو سال میں ان کی یہ اہم تصنیف بھی مکمل ہو جاتی۔ اسی طرح ہندوستان اور پاکستان میں گزشتہ نصف صدی کے ادبی و تہذیبی رجحانات کا تنقیدی جائزہ بھی ان کے پیش نظر تھا جو وہ

سوانحی انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔ دراصل 'شہر نگاراں' کے چھپنے کے بعد جو ان کے قیام حیدر آباد دکن کے تاثرات پر مشتمل تھی، ان سے وقتاً فوقتاً اصرار کیا جاتا رہا کہ وہ اسی انداز سے ان سب شہروں کے تہذیبی حالات کو ضابطہ تحریر میں لائیں جہاں قیام کا انہیں موقع ملا۔ انہوں نے حیدر آباد دکن کے علاوہ لکھنؤ، علیگڑھ، دہلی، نیویارک، لندن، لاہور اور کراچی میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ وہ جس شہر میں بھی رہے وہاں کے تہذیبی رجحانات سے انہوں نے علمی و عملی دونوں سطحوں پر تعلق قائم رکھا۔ اس طرح وہ اپنے عہد کی تاریخ کے محض ایک ناظر ہی نہیں تھے بلکہ اس کا ایک متحرک اور باعمل کردار بھی تھے۔ البتہ ان کو اپنی ذات کے حوالے سے گفتگو کرنے سے گویا چڑ تھی لہٰذا وہ خودنوشت لکھنے سے ہمیشہ دامن بچا لیتے تھے۔ لیکن جب کبھی ان کے سامنے ان کے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان کے عہد کی تاریخ لکھے جانے کی اہمیت پر زور دیا جاتا تو وہ اس سے اتفاق کرتے۔ ایک آدھ بار اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی مثلاً ماہنامہ 'افکار' نے ان سے خودنوشت کی ایک قسط لکھوا بھی لی[2] مگر یہ کام ادھورا ہی رہ گیا اور ان کے دوسرے علمی کاموں میں اس کے لیے وقت نہ نکل سکا۔ اسی طرح ان کی ایک ذاتی ڈائری میں لکھنؤ کے بارے میں بہت سے نوٹس کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد کے بعد اگلا شہر جس کو انہوں نے منتخب کیا تھا، لکھنؤ تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کام بھی بالکل ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھ سکا۔

سبط صاحب کی علمی و ادبی مصروفیات صرف تصانیف اور مضامین تک محدود نہیں رہیں، وہ مختلف مؤقر ادبی جرائد کے ایڈیٹر بھی رہے۔ مثلاً ۱۹۳۹ء میں انہوں نے لکھنؤ سے مشہور ادبی پرچہ 'نیا ادب' کے نام سے جاری کیا جس کے شعبۂ ادارت میں ان کے علاوہ اسرارالحق مجاز اور علی سردار جعفری شامل تھے۔ گو یہ پرچہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا مگر اس نے مختصر سے عرصے ہی میں ادب کے نئے اور تازہ تر رجحانات کی جس انداز میں ترجمانی کی اس نے اس کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک معتبر مقام دلوا دیا۔ قیام پاکستان کے بعد گو سبط صاحب کی مدیرانہ صلاحیتیں زیادہ تر صحافتی جرائد ہی میں وقف ہوئیں مگر یہ صحافتی جرائد بھی ادبی شان سے محروم نہیں تھے۔ 'لیل و نہار' کے پرانے فائل اس امر کے گواہ ہیں کہ یہ رسالہ کس درجہ ادبی مزاج کا حامل تھا۔ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصے میں انہوں نے کراچی سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے 'پاکستانی ادب' کی ادارت کی۔ اس رسالے نے بہت ہی کم عرصے میں اپنے لیے ایک مقام پیدا

کرلیا تھا۔ جس چیز نے 'پاکستانی ادب' کو قارئین کے حلقے میں قبول عام سے نوازا تھا وہ اس کی واضح نظریاتی سمت تھی جو ترقی پسند فکر کی آئینہ دار تھی۔ پھر 'پاکستانی ادب' نے علاقائی ادب کے تراجم کو بڑے تسلسل کے ساتھ اردو کے قارئین تک پہنچایا۔ اس اہم رسالے کے امیر خسرو نمبر، نئی نسل نمبر، اور امریکی ادب نمبر، غیر معمولی طور پر مقبول ہوئے، افسوس کہ یہ رسالہ بھی نامساعد حالات کی تاب نہ لاتے ہوئے بند ہو گیا۔

سبط صاحب بڑے وسیع المطالعہ انسان تھے۔ انہوں نے اردو، فارسی اور انگریزی کے کلاسیکی و جدید ادب ہی کا مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اقتصادیات، عمرانیات اور سیاسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ سیاسیات کے مضمون کی تو انہوں نے باضابطہ تعلیم بھی حاصل کی تھی اور امریکہ میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی سے اس مضمون میں (کولمبیا میں اسے انٹرنیشنل ریلیشنز یا بین الاقوامی تعلقات کہا جاتا تھا) ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ایک اور شعبۂ علم جس کے مطالعے نے ان کی تحریروں میں فکر و نظر کے نت نئے گوشے اجاگر کیے علم بشریات (anthropology) ہے۔ پاکستان میں کلچرل انتھروپولوجی کا مضمون بڑی حد تک غیر معروف اور غیر ترقی یافتہ ہے۔ حالانکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں یہ سماجی علوم کے مقبول ترین مضامین میں شامل ہو چکا ہے۔ سبط صاحب کو انتھروپولوجی سے خصوصی شغف تھا۔ ان کی کتاب 'ماضی کا مزار' کا تو موضوع براہ راست طور پر علم بشریات ہی ہے۔ اپنی دوسری تصانیف میں بھی انہوں نے جہاں کہیں سماجی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہاں انسان کے عہد بہ عہد ارتقا اور انسانی تاریخ کی ارتقائی جہت کو ذہن سے محو نہیں ہونے دیا ہے۔ علم بشریات ہی کے بارے میں اپنی معلومات کو وسیع کرنے کے لیے انہوں نے مختلف ممالک کی سیاحت بھی کی۔ انہیں جس ملک میں بھی جانے کا موقع ملا وہاں کے عجائب گھر، تاریخی مقامات اور نوادرات ان کی توجہ کا مرکز ضرور بنے، جن کی مدد سے انہوں نے قدیم معاشروں کے طرز بود و ماند اور قدیم باشندوں کے عقائد و افکار اور رسوم و روایات کا مطالعہ کیا۔ ان کے پاس تاریخی نوشتوں اور آثار قدیمہ کی بیسیوں تصاویر محفوظ تھیں جو انہوں نے ان مطالعاتی دوروں میں جمع کی تھیں۔ سبط صاحب نے سماجی علوم کے ان متنوع مضامین اور موضوعات کا مطالعہ مارکسی نقطۂ نظر سے کیا تھا اور جو نتائج اخذ کیے انہیں مارکسزم ہی کے حوالے سے مربوط کر کے اپنا تصور تاریخ اور تصور حیات مکمل کیا تھا۔ مارکسزم نہ یہ کہ دنیا کی سائنسی تفہیم کے اصول و

قوانین فراہم کرتا ہے بلکہ دنیا کو بدلنے کے ذرائع کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ جدلی مادیت (Dialectical Materialism) اور تاریخی مادیت (Historical Materialism) کے نظریات اور ان کی تشریحات، مارکسزم کی اساس ہیں، سبط صاحب کے یہاں ان دونوں نظریات کا تاریخ گذشتہ اور حقائقِ امروز پر انطباق کر کے نتائج اخذ کرنے کی ایک جستجو نظر آتی ہے۔ اس انطباق میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس پر تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔ اس امر پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے کہ ہمعصر تہذیبی مسائل کے حوالے سے خود مارکسزم کے تخلیقی اطلاق کے ضمن میں جو دانشورانہ کام اب تک ہندوستان اور پاکستان میں ہوا ہے (اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ہندوستان میں اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے) اس میں سبط صاحب کے علمی کام کو کس مقام پر رکھا جا سکتا ہے۔ مگر جس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ مارکسزم کے حوالے سے تاریخ و تہذیب کے مطالعے کی ان کی دیانت دارانہ کاوش ہے۔ یہ کاوش اس وقت اور مستحق داد بن جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کو اردو زبان میں نہایت آسان اور دلکش پیرائے میں پیش کیا تا کہ عام قارئین، طلبہ و طالبات، سیاسی کارکن اور محنت کش افراد بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

مارکسزم سبط صاحب کے فکری نظام میں کلید کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ ماضی کے مزار میں قدیم عراقی تہذیب جو وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب بھی کہلاتی ہے، کا مطالعہ مارکسزم کے اصولوں ہی کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع بنیادی طور پر تخلیق کائنات کے وہ عقائد ہیں جو قدیم عراق میں بالخصوص اور قدیم مصریوں، چینیوں، آریاؤں اور کنعانیوں، وغیرہ میں بالعموم مروج تھے۔ عقائد و افکار کے مطالعے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ انہیں قائم بالذات تصور کیا جائے اور معاشرے کے مادی حالات و کوائف کو ان کا نتیجہ و مظہر قرار دیا جائے۔ تصوریت پسند یا عینیت پسند (Idealists) اسی نظریے کے حامل ہیں۔ مگر مارکسزم اس خیال پرستی کے برعکس ایک یکسر جدا نظریہ پیش کرتا ہے۔ تاریخ فکر میں مارکس اور اینگلز کا یہ نظریہ اپنی جگہ ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کہ فرد کا شعور اس کے سماجی وجود کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب۔ دوسرے لفظوں میں زندگی شعور سے متعین نہیں ہوتی بلکہ شعور زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس کلیے کی روشنی میں انسانی تاریخ دراصل فلسفیوں اور حکما کے نظریات یا کسی معاشرے کے چند افراد کے تصورات، خواہ وہ

قنوطیت زدہ ہوں یا خوش عقیدگی کے حامل، سے نہ تو متعین ہوتی ہے اور نہ اس کا سفر اس پر منحصر ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ دراصل سماجی رشتوں کی تاریخ ہے اور خود سماجی رشتے پیداواری قوتوں سے متعین ہوتے ہیں۔

'ماضی کے مزار' میں سبط صاحب نے وادیٔ دجلہ وفرات کے نظام عقائد و افکار کا کھوج اس خطے کے مادی حالات ہی کے تناظر میں لگایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ 'کسی پرانی قوم کے عقائد و افکار کا جائزہ لیتے وقت اس کے سماجی اور معاشرتی حالات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے ورنہ ان عقائد و افکار کے اصل محرکات ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتے'۔[۳] قدیم معاشروں میں کائنات اور حیاتِ انسانی کی ابتدا کے حوالے سے دو تصورات پائے جاتے تھے، یعنی سلبی تصور اور جدلی تصور، جن کے بارے میں سبط صاحب لکھتے ہیں:

> 'پرانی تہذیبوں میں تخلیق کائنات کے دو تصور ملتے ہیں۔ ایک سلبی دوسرا جدلی۔ سلبی تصور زیادہ قدیم ہے۔ اس لیے کہ ابتدائی انسان کو عمل تخلیق کا شعور سب سے پہلے اپنی اور جانوروں کی پیدائش سے ہوا۔ بشر تولید کے قوانین سے تو واقف نہ تھا البتہ تجربے اور مشاہدے سے وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ بچہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ عورت کی طرح گائے، بھینس، ہرن، بھالو سب کی ماداؤں کے پیٹ پھولتے ہیں اور معینہ وقت کے بعد ان کے جسم کے ایک مخصوص مقام سے جیتا جاگتا مولود برآمد ہوتا ہے۔ یہ عمل شروع شروع میں لوگوں کو شاید بہت عجیب لگا ہو۔ لیکن پھر وہ اس کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ عورت ان کی نظر میں تخلیق کا سرچشمہ اور افزائش نسل کی علامت بن گئی۔ انہوں نے زمین کو بھی ماں (عورت) کا رتبہ دے دیا۔ کیوں کہ پانی زمین ہی سے نکلتا تھا۔ درخت، پودے اور ہریالیاں زمین سے اگتی تھیں اور زمین ہی کے سینے پر لہراتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے زمین کو اگر دھرتی ماتا کا رتبہ دیا تو کیا غلط کیا۔ یہی وجہ ہے کہ افزائش نسل و فصل کی تمام پرانی رسمیں ہر خطے اور قوم میں عورت ہی کے گرد گھومتی ہیں۔'[۴]

البتہ تخلیق کا جدلی تصور یہ تھا کہ کائنات دو افراد یا دو قوتوں مثلاً عشتار اور ارشی گل، تیامت اور اپسو، یزداں یعنی نور اور اہرمن یعنی ظلمت کی جنگ کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ جدلی تصور کا محرک بھی سبط صاحب انسانی معاشرے کی آویزش و پیکار میں تلاش کرتے ہیں:

'تخلیق کائنات کا جدلی تصور اس آویزش اور پیکار کا ذہنی پرتو ہے جو انسانی معاشرے میں ایک خاص دور میں شروع ہوئی یہ جدلی تصور غیر طبقاتی معاشرے میں پیدا نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اس وقت ابھرا جب معاشرہ طبقات میں بٹ گیا۔ بادشاہتیں قائم ہوئیں اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔ جنگیں چھڑتیں، بستیاں اجڑتیں، لشکریوں کے ساتھ بے گناہوں کا خون بہتا، اور جو فریق فاتح ہوتا اس کے کارناموں کی دھوم مچتی۔ اس کی شان میں داستانیں لکھی جاتیں اور بھجن اور گیت گائے جاتے، حتیٰ کہ ہر قسم کی اچھائی کو اس کی ذات سے منسوب کر دیا جاتا تھا اور دشمنوں کو بدی کا پتلا بنا دیا جاتا تھا۔' [۵]

تخلیق کائنات کے ان تصورات کی طرح افزائش نسل، تقدیر اور حیات بعد الموت کے بارے میں قدیم تہذیبوں میں رائج تصورات بھی انسان کی اس وقت کی سماجی زندگی اور مادی کوائف کا پرتو تھے۔ ان عقائد و تصورات میں صدیوں تک کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لہٰذا قدیم نوشتوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں تک انسانی افکار و عقائد یکسانیت کا شکار رہے۔ سبط صاحب اس جمود اور یکسانیت کا سبب بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سماجی زندگی کے حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں:

'بظاہر یہ بڑی حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے لیکن وادیٔ دجلہ و فرات کے لوگوں کے خیالات میں اس پورے دور میں درحقیقت بہت کم تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس مدت میں وہاں بار بار سیاسی تغیرات رونما ہوئے، کبھی سلطنتِ بابل کا پرچم اقتدار بلند ہوا، کبھی کسدیوں اور ایرانیوں کی یلغار کا شور مچا اور کبھی اشور کی فتوحات کا غلغلہ اٹھا۔ لیکن معاشرے کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ پرانے طبقاتی

رشتے اپنی جگہ بدستور قائم رہے۔ چنانچہ مندر کے پروہتوں کا تسلط ہو یا نظم ونسق کے اصول، زراعت کے طریقے ہوں یا صنعت وحرفت کے انداز جو شرد قین اور حمورابی کے عہد میں تھے وہی اشور بنی پال اور بخت نصر کے زمانے میں بھی رائج رہے۔ بہت ہوا تو سومیریوں کے انو دیوتا کی جگہ بابل کے یا مردک کو مل گئی یا اتو کا شمس ہو گیا ورنہ پرانے رسوم ورواج اور طرزِ زندگی میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔ اور فرق آنا ممکن بھی نہ تھا کیوں کہ کسی معاشرے کے طرزِ زندگی اور فکری اسلوب میں تبدیلیاں اُس وقت پیدا ہوتی ہیں جب معاشرے کا وجود ان تبدیلیوں کا متقاضی ہو اور معاشرے کا وجود اسی وقت تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے جب پیداوار کے پرانے رشتے معاشرے کی ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگیں تب نئے اور پرانے خیالات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ فرسودہ رشتوں اور فکروں کی مخالفت شروع ہوتی ہے اور نئے افکار ونظریات پیش کیے جاتے ہیں۔ وادیٔ دجلہ وفرات کے لوگوں کو تقریباً دو ہزار برس تک عناصر پیداوار یا پیداواری رشتوں کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، وہی کانسی کے آلاتِ پیداوار اور آلات جنگ جو شہری ریاستوں کے ابتدائی زمانے میں استعمال ہوتے تھے، چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانیوں کے غلبہ کے وقت بھی رائج تھے، نہ معاشرے کی بنیادی ساخت بدلی اور نہ خیالات اور عقائد کی دنیا میں کوئی ہلچل پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کی سرزمین سے زرتشت، مانی یا مزدک کی مانند کوئی انقلابی شخصیت کبھی نہ ابھری اور نہ کوئی ایسی سماجی تحریک پیدا ہوئی جو پرانے توہمات اور عقائد کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرتی۔'[۶]

مارکسی فکر کے اثرات، 'ماضی کے مزار'، کی طرح سبط صاحب کی اگلی تصنیف، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' میں بھی نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

عہد قدیم سے سلطنت مغلیہ کے زوال تک ان علاقوں میں جواب پاکستان میں شامل ہیں کون

سے تہذیبی عوامل کارفرما ہے اور تہذیب کا سفر کس انداز میں آگے بڑھا، یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ عام طور سے مارکسی مؤرخ تاریخ کے مختلف ادوار کو سماجی رشتوں کی نوعیت کے حوالے سے مشترکہ ملکیت، غلام داری، فیوڈلزم اور پھر صنعتی دور میں تقسیم کرتے ہیں۔ یوں سماج کی بالائی سطح پر نمودار ہونے والی مختلف سیاسی وحدتیں خواہ وہ سلطنتیں ہوں یا حکمرانوں کے خاندان (dynasties) بنیادی اہمیت کے حامل نہیں بلکہ تاریخ کے حقیقی محرکات یعنی پیداواری رشتے اولیت کے حامل قرار پاتے ہیں۔ سبط صاحب نے اس کتاب میں ابواب کی تقسیم اس طریقے پر تو نہیں کی ہے اور وادی سندھ کی قدیم تہذیب آریا تہذیب یونانی، ساکا اور کشن اثرات، عربی تہذیب، ترکی اور ایرانی تہذیب اور پھر مغلیہ تہذیب کو علیحدہ علیحدہ ابواب کا موضوع بنایا ہے تاہم ان ابواب میں نفسِ مضمون کا جہاں تک تعلق ہے اس میں انہوں نے تہذیب کے حقیقی عوامل کو یکسر نظرانداز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ کتاب کا پہلا باب ہی تہذیب کی تعریف کے موضوع پر ہے۔ اس میں وہ تہذیب کے چار عناصر بیان کرتے ہیں۔ اوّل طبعی حالات، دوئم آلات واوزار، سوئم نظام فکر واحساس اور چہارم سماجی اقدار، ان عناصر میں وہ آلات واوزار کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں:

'دراصل تہذیب کی عمارت کا مدار آلات واوزار پر ہے اور انسانی تہذیب کی ترقی آلات واوزار کی ترقی پر منحصر ہوتی ہے۔ جس قسم کے آلات واوزار ہوں گے تہذیب بھی اسی قسم کی ہوگی۔ اسی لیے دانایان فرنگ نے تہذیب کے مختلف ادوار آلات واوزار ہی کی مناسبت سے مقرر کیے ہیں۔' [۷]

کسی معاشرے کے ارتقا کا ذرائع پیداوار پر کس درجہ دارو مدار ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ دانہ گندم کی مثال دیتے ہیں:

- 'گیہوں کی کاشت اگر ہل بیل سے ہوتی ہے تو دیہاتی معاشرے کی ایک شکل ہوگی۔ اور اگر بڑے بڑے فارموں پر ٹریکٹروں اور بھاری مشینوں کے ذریعے ہوتی ہے تو معاشرے کا نقشہ دوسرا ہوگا۔ اس تبدیلی میں انسانوں کی اپنی مرضی اور خواہش کو دخل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ معاشرتی تغیر آلات واوزار کی تبدیلی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔' [۸]

تہذیب کا ایک اہم عنصر نظام فکر و احساس ہے۔ مگر یہ عنصر بھی 'اس رشتے کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے جو معاشرے کے افراد اور موجودات میں استوار ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان کے حالات وجود جس سطح پر ہوں گے اس کے شعور کی سطح بھی وہی ہوگی۔' [۹] نظام فکر و احساس میں تبدیلی بھی آلات و اوزار اور سماجی روابط میں تغیرات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ بقول سبط صاحب 'دراصل نظام فکر و احساس کی تبدیلی خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ معاشرے کی تخلیقی اساس اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔' [۱۰]

تہذیب کے حقیقی مفہوم کو متعین کرنے کے بعد سبط صاحب پاکستان کے علاقوں میں تاریخی طور پر اس کی تفصیلات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری تاریخ کے ایسے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں جو ہمارے یہاں لکھی جانے والی اکثر کتبِ تاریخ اور بالخصوص نصاب کی کتابوں میں یکسر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تاریخ بالعموم بادشاہوں اور ان کے درباروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ پرانے تاریخ دانوں میں بھی ہمارے لیے قابل قبول وہی رہے جو تاریخ دان نہیں بلکہ درباری روزنامچہ نگار تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے کوتاہ اندیش مؤرخ تاریخ کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنے سے کتراتے ہیں کہ مبادا مسلمان بادشاہوں کی محلاتی سازشوں اور ظالمانہ طرز حکمرانی سے پردہ اُٹھنے پر خود اس مملکت کے جواز (legitimacy) پر حرف آجائے جو دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ مگر جس بات کا ادراک یہ مؤرخ نہیں کر پاتے وہ یہ ہے کہ جس منفی سوچ کے ذریعے وہ اس مملکت کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں وہ اس کو مضبوط بنانے کے بجائے کمزور کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ پاکستان کے استحکام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی نئی نسل کو ماضی کے بارے میں گمراہ کن معلومات فراہم کرنے اور اسے کنویں کا ایسا مینڈک بنا کر رکھ دینے کے بجائے جسے کنویں سے باہر کچھ نظر نہیں آتا، تاریخ کے حقیقی تصور سے بہرہ ور کیا جائے۔ سبط صاحب نے 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کے ذریعے تاریخ کے حقیقی تصور کو نئی نسل کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جہاں برصغیر کے مسلمان بادشاہوں کی حکمرانی کے حقیقی شب و روز سے پردہ اٹھاتے ہیں، وہیں ان ادوار گزشتہ میں عوامی زندگی کے خدوخال اور سابقہ معاشروں کے طرز فکر و احساس کا بھی بغور جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دونوں کام وہ ماضی کے مادی حالات و کوائف اور سماجی ماحول کے تناظر میں کرتے ہیں، یوں تاریخ کا ایک ایسا منظر ابھر کر سامنے آتا ہے جو تعصبات سے پاک اور

معروضیت کا حامل ہوتا ہے۔

'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کے مباحث میں ایک قابلِ قدر بحث سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور ہندوستان میں انگریزی تسلط کے اسباب سے متعلق ہے۔ مغلیہ تہذیب کے زوال کے اسباب کے ضمن میں ہمارے بیشتر مورخین کا نقطۂ نظر موضوعی (Subjective) ہے، ان میں سے بعض مورخین کا خیال ہے کہ مغلیہ سلطنتوں کی سرحدیں اس قدر وسعت حاصل کر چکی تھیں کہ ان کا انتظام وانصرام عملاً ناممکن ہو گیا تھا۔ بعض مغلوں کی مبینہ آرام کوشی اور عیاشیوں کو ان کے زوال کا سبب گردانتے ہیں بعض کے نزدیک شاہی خاندان کا اندرونی خلفشار اور باہمی سازشیں سلطنت کو لے ڈوبیں، ایک حلقہ اس زوال کا سبب اندرونی و بیرونی دشمنوں کو قرار دیتا ہے۔ سبط صاحب ان تمام اسباب کی جزوی صداقت سے انکار نہیں کرتے مگر ان کے خیال میں ان میں سے کوئی بھی سبب یا یہ کُل اسباب بھی مغلیہ تہذیب کے زوال کا بنیادی سبب قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ان کا نتیجۂ فکر یہ ہے کہ دراصل مغلیہ تہذیب کے زوال کا اصل محرک وہ خودکفیل معاشرہ تھا جس میں ایجاد واختراع کے امکانات مفقود ہو چکے تھے۔ اس تہذیب کی بنیاد ان پیداواری قوتوں اور آلات واوزار پر استوار تھی جن میں صدیوں سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ملک میں ایک جاگیری نظام قائم تھا جس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس جاگیری نظام کے سہارے ملک میں ایک مطلق العنان شخصی حکومت جملہ امور کی مالک ومختار تھی اور رعایا حکمرانوں کے رحم وکرم پر تھی۔ نیز ملک میں افکار وعقائد کا ایک ایسا نظام رائج تھا جس میں رہتے ہوئے خود پڑھا لکھا طبقہ عقل وخرد کی روشنی سے محروم تھا،[۱۱] سبط صاحب کارل مارکس کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ معاشرے کا خودکفیل ہونا بھی بعض اوقات اس کی بربادی کا باعث ہوا ہے۔[۱۲]

مغلیہ ہندوستان کی خودکفالت کے مضمرات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ گو یہاں بادشاہتیں تبدیل ہوتی رہیں مگر طریقۂ پیداوار میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جو صنعتیں مغلیہ دور میں قائم ہوئیں وہ بھی بنیادی طور پر دستکاریاں ہی تھیں۔ پھر ہندوستان میں افرادی قوت کی بھی کمی نہیں تھی لہٰذا خودکار مشینوں کی ایجاد کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس خودکفیل معیشت کے نتائج بڑے مہلک ثابت ہوئے۔ مثلاً ہندوستان میں بحری طاقت کی ضرورت پر خاطر خواہ غور نہیں کیا جا سکا۔ یا پھر یہ کہ یہ بھی اسی خودکفیل معاشرے کا نتیجہ تھا کہ یہاں مروجہ نظام کے خلاف

کوئی بامعنی بغاوت بھی نہیں ہوئی۔ جو بغاوتیں ہوئیں بھی وہ بھی زیادہ تر جاگیری نظام کے اندر رہتے ہوئے کی گئیں۔ان کا مقصد اس نظام کو ختم کر کے کوئی دوسرا بہتر نظام لانا نہیں تھا۔یہی نہیں بلکہ ان بغاوتوں پر قبائلی، علاقائی اور مذہبی عصبیتوں کا رنگ بھی غالب تھا، ہندوستان کا یہ جمود زدہ معاشرہ ظاہر ہے کہ ان انگریز حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جو مادی اعتبار سے زیادہ مضبوط و مستحکم تھے، ان کے پاس زیادہ ترقی یافتہ وسائلِ پیداوار اور جدید ہتھیار تھے اور ان کی علمی استعداد بھی مقامی لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔

ہندوستان میں انگریز کی آمد دور رس تہذیبی اثرات کا سبب بنی اور معاشرے میں جمود کی کیفیت جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی وہ ختم ہوئی۔ سبط صاحب نے انگریز کی آمد کے حوالے سے یہ رائے قائم کی کہ 'انگریز نہ آتے تو ممکن ہے کہ ایشیاء کا یہ مرد بیمار چین کی مانند سو دو سو سال اور گھسیٹ لے جاتا مگر اس بوڑھے کی طرح جس کے ہاتھوں میں جنبش کی سکت نہ ہو مگر آنکھوں میں دم ہو، جو خود کچھ نہ کر سکتا ہو مگر جس میں دید کی ہوس باقی ہو۔'[۱۳]

سبط صاحب کے اس مؤقف سے جس بحث کا آغاز ہوا اس میں بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا واقعی انگریز سے قبل کے ہندوستانی پیداواری ذرائع اس درجہ پیش پا افتادہ تھے کہ وہ معاشرے کی نئی ضروریات کی تکمیل کے اہل نہیں رہے تھے۔ اس سوال کے جواب کی روشنی میں برصغیر میں انگریزی استعمار کے اصل کردار کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ مغلیہ عہد کے پیداواری نظام کی بابت ممتاز ادبی نقاد محمد علی صدیقی نے رجنی پام دت کے حوالے سے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مغلیہ دور کے زرعی رشتے انگریزی دور کے بندوبست استمراری کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسندانہ تھے،[۱۴] اس ضمن میں یہ نکات بھی پیش کیے گئے کہ ۱۷۵۰ء تک ہندوستان کی صنعتی صورت حال کسی بھی ملک سے زیادہ امید افزا تھی اور یہ کہ ہندوستان میں فی کس آمدنی کا تناسب قابلِ رشک تھا۔'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کا اختتام عہد مغلیہ اور اس کے زوال کے اسباب پر ہوتا ہے لہٰذا خود انگریز کی ہندوستان آمد کے مقاصد اور مضمرات و نتائج اس کتاب کے دائرہ میں نہیں آتے تھے۔ حسن اتفاق سے سبط صاحب کی اگلی ہی کتاب سوشلزم کی تاریخ کے موضوع پر شائع ہوئی۔ جن دنوں 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کے حوالے سے مذکورہ بحث کا آغاز ہوا ان دنوں وہ 'موسیٰ سے مارکس تک' پر کافی کام کر چکے تھے۔[۱۵] چنانچہ انہوں نے کتاب میں ہندوستان کے حوالے سے مارکس کے

خیالات پر ایک علیحدہ باب تحریر کیا اور مذکورہ موضوع پر مارکسی نقطۂ نظر زیادہ وضاحت وتشریح کے ساتھ سپردِ قلم کیا۔

موضوع کے ربط کے نقطۂ نظر سے یہاں ہم پہلے 'موسیٰ سے مارکس تک' کے اسی باب کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ بعدازاں اس کتاب کے ان دیگر پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے گا جو نفسِ مضمون یعنی سبط صاحب کی فکری اساس سے متعلق ہیں۔ ہندوستان کے موضوع پر کارل مارکس اور اینگلز کی تحریریں بڑی ذہن کشا اور فکر انگیز ہیں۔ مارکس اور اینگلز نے ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیانی عرصے میں نیویارک ٹریبیون میں ہندوستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی پر جو مضامین لکھے وہ اگرچہ اخباری حیثیت کے تھے مگر ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی کہ ان دونوں نے ہندوستان کی تاریخ و معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تہذیب کا احوال بیان کرتے ہوئے مارکس نے لکھا تھا:

> 'ہندوستان کے ماضی کا سیاسی پہلو خواہ کتنا ہی بدلتا کیوں نہ نظر آئے، اس کی سماجی حالت میں قدیم ترین عہد سے ۱۹رویں صدی کی ابتداء تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔' [۱۶]

مارکس کی نظر میں اس سماجی جمود کے دو اسباب تھے۔ ایک تو زرعی زندگی میں قدیم طریقۂ پیداوار اور دوسرا گاؤں کا خود کفیل سماجی نظام۔ سبط صاحب نے ڈاکٹر برنیئر کے خیالات اور ان پر مارکس اور اینگلز کی آرا کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جن کے مطابق ہندوستان میں زمینداری نظام بھی اس طور پر نافذ نہیں ہو سکا جس طرح وہ یورپ میں نافذ العمل رہا ہے۔ مطلق العنان بادشاہ بلاشرکت غیرے زمین کا مالک ہوتا تھا اور وہ ایک طرح کے معاہدے کے تحت ایک مخصوص عرصہ کے لیے زمین کسی شخص کو دے دیتا تھا اور بدل میں اس سے دو (۲) ہزار، چار (۴) ہزار یا حسبِ ضرورت افراد حاصل کرتا تھا جو فوجی خدمات کے لیے مختص ہوتے تھے۔ منصب داری نظام کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ زمین وراثتاً منتقل نہیں ہوتی تھی اور زمیندار کے مرنے کے بعد دوبارہ بادشاہ کی ملکیت قرار پاتی تھی۔ اینگلز نے ملکیت زمین کی جاگیردارانہ شکل کی ہندوستان میں عدم موجودگی کا سبب یہاں کے موسم اور زمین کی نوعیت کو قرار دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان علاقوں میں آلات پیداوار کے ساتھ ساتھ مصنوعی آبپاشی بھی زراعت کے لیے لازمی شرط ہے اور مصنوعی

آبپاشی کے انتظام و انصرام کی اہلیت بادشاہوں یا حکومت ہی کے پاس ہوسکتی تھی۔ بقول سبط صاحب:

'ہندوستان میں وہی بادشاہ کامیاب ہوا جس نے آبپاشی کے نظام کو فروغ دیا اور وہی بادشاہ ناکام ہوا جس نے نہروں، تالابوں اور کنوؤں کی تعمیر کی طرف سے غفلت برتی' [۱۷]

لہٰذا انگریزوں نے اگر مغربی یوپی، پنجاب اور سندھ وغیرہ میں نہریں کھدوائیں تو ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ بہتر آبپاشی کے نتیجہ میں زرعی پیداوار بڑھتی رہے اور یوں اس کے سامراجی مقاصد کی تکمیل ہوتی رہے۔

زرعی پیداوار کے لیے مصنوعی آبپاشی کی ناگزیریت اور حکومت پر زراعت کی خوبی وخرابی کے دارومدار کے نتیجے میں ہندوستان کی دیہی معاشرت میں وہ رجحان پیدا ہوا جس کو مشرقی استبدادیت (Oriental Despotism) کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز کی آمد سے قبل ہندوستانی صنعت بھی زراعت سے وابستہ تھی اور ان دونوں کا دائرہ کار گاؤں تک محدود تھا۔ خود گاؤں کا کردار ایک خود مختار اور خود کفیل جمہوریت کا تھا۔ چنانچہ ہر گاؤں کے اپنے بڑھئی، جلاہے، نان بائی، پٹواری اور مکھیا ہوتے تھے، مارکس کا خیال ہے کہ:

'ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بظاہر یہ بے ضرر، سادہ اور دلکش دیہی جمعیتیں مشرقی استبدادیت کی ہمیشہ ٹھوس بنیاد رہی ہیں۔ انہوں نے انسانی ذہن کو بہت ہی چھوٹے چھوٹے دائروں میں محدود کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگ تو ہمات کے بے چون و چراشکار ہوگئے ہیں اور روایتی ضابطوں کے غلام بن گئے ہیں اور ان کے دماغ ہر قسم کی بلند خیالی اور تاریخی توانائیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ذات پات کی تفریق اور غلامی کا زہر یہاں تک سرائت کر چکا ہے کہ انسان حالات کا آقا ہونے کے بجائے ان کا غلام بن گیا ہے اور خود کار سماجی کیفیت ناقابل تغیر تقدیر میں بدل گئی ہے۔' [۱۸]

ہندوستان کی دیہی زندگی کے اس جمود کو توڑنے کا کام انگریز کے ہاتھوں انجام پایا۔ یہاں

مارکس کا وہ تاریخی فقرہ یاد آتا ہے کہ 'انگلستان کو ہندوستان میں دو فریضے ادا کرنے ہیں۔ ایک تخریبی اور دوسرا احیاتی۔ قدیم ایشیائی معاشرے کو نیست و نابود کرنا اور ایشیا میں مغربی معاشرے کی مادی بنیاد رکھنا۔ [19]

مارکس انگریزوں کی ہندوستان آمد کا موازنہ اس سے قبل ہندوستان آنے والے حملہ آوروں سے کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انگریزوں سے پہلے جو حملہ آور ہندوستان آئے انہوں نے مقامی تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا لیکن انگریز جو ہندوستانیوں کے مقابلے میں اعلیٰ تمدن کے حامل تھے انہوں نے مقامی تمدن کی تباہی و بربادی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انہوں نے صدیوں سے چلی آنے والی دیہی جمعیتوں اور مقامی صنعتوں کو تباہ کر دیا۔ اور یوں ہندوستان میں تخریب کا آغاز کیا۔ البتہ اس تخریب میں ایک پہلو تعمیر کا بھی تھا جیسے ہر شر میں خیر کا ایک پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ مارکس کے خیال میں ہندوستان پر انگریز کا قبضہ تاریخ کا ایک غیر شعوری آلۂ کار ثابت ہوا جس کے نتیجہ میں معاشرتی احیاء کی بنیاد پڑی۔ [20]

مارکس ان مادی بنیادوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دس علامتوں کی نشاندہی کرتا ہے جس میں ہندوستان کا پہلی مرتبہ ایک سیاسی وحدت بننا، تار برقی اور ریلوں کے نظام کا قیام، دیہی سپاہیوں کی مغربی اصولوں کے مطابق تربیت اور چھاپہ خانوں کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں اہم ترین علامت ملکیت زمین کا نظام تھا۔ ملکیت زمین کا نظام ماضی کے نظام کے مقابلے میں کیا نوعی فرق رکھتا تھا اس کے بارے میں سبط صاحب مارکس ہی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> 'جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مارکس کی رائے میں ہندوستان کے معاشرتی جمود کا بڑا سبب یہ تھا کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ کاشتکار زراعت اور زرعی پیداوار کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں نے یہاں پہلی بار ملکیت زمین کا طریقہ رائج کیا۔ انہوں نے اپنی سہولت کے لیے شمالی ہند میں زمینداری کا نظام اور جنوبی ہند میں رعیت واری نظام کو رواج دیا۔ مارکس نے ان دونوں طریقوں کی برائیاں گنوائیں لیکن اس بات کو تسلیم کیا کہ بہرصورت ملکیت زمین کے اصول نے رواج پایا۔ زمینداری اور رعیت واری نظام ہر چند کہ نہایت مکروہ ہیں

لیکن زمین کی ذاتی ملکیت کی دوصورتیں تو ہیں' [21]

سبط صاحب نے مارکس کے حوالے سے ہندوستان کے معاشرتی جموداور انگریزوں کی آمد کے بعد ہونے والی بامعنی اور دوررس تبدیلیوں کی بابت جونتائج اخذ کیے ہیں وہ رجنی پام دت کے خیالات سے مختلف نہیں ہیں۔خودرجنی پام دت نے بھی مارکس ہی کی تحریروں کوحوالہ بناتے ہوئے لکھا ہے:

> 'مارکس کو بورژوا سماجی انقلاب کی ان لامتناہی تکالیف کا اندازہ تھا جواس نے ہر ملک کو پہنچائی تھیں اور ہندوستان میں توان کی شدت یہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے اور بھی زیادہ تھی۔مگر ساتھ ہی ساتھ یہاں کے دیہی نظام کا انتہائی فرسودہ کردار بھی اس کے پیش نظر تھا۔اور یہ بھی کہ اگر یہاں انسانیت کو آگے بڑھنا ہے تو اس نظام کی تباہی لابدی ضرورت ہے۔' [22]

رجنی پام دت تو اپنے زمانے کے ان احیاء پسندوں کی بھی مذمت کرتے ہیں جو ہندوستان میں برطانوی استعمار کے خلاف لڑائی میں محض اس شرط اور نعرے کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے کہ 'برطانوی تسلط سے قبل کے اس ہندوستان کا احیا کیا جو چرخے (Spinning Wheel) اور کھڈی (Handloom) کا ہندوستان تھا۔' [23]

مسئلہ ہندوستان 'موسیٰ سے مارکس تک' کا ایک اہم حصہ ہے مگر بنیادی طور پر اس کتاب کا موضوع اشتراکی فکر کی تاریخ اور اس کا ارتقا ہے۔گو سبط صاحب نے اپنی دوسری کتابوں میں جن موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے ان کے بارے میں مارکسی نقطۂ نظر ہی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں بھی ضروری خیال کیا وہاں مارکسزم کے اصولوں کی نشاندہی بھی کی ہے مگر 'موسیٰ سے مارکس تک' میں وہ براہ راست طور پر اشتراکیت اور مارکسزم ہی کو موضوع گفتگو بناتے ہیں۔ اشتراکیت کے بارے میں ہمارے ملک کے ایک بڑے حلقے کی معلومات یا تو بالکل نہ ہونے کے برابر ہیں یا پھر بہت ناقص ہیں۔اس پر مستزاد اشتراکیت کے مخالفین کا مخالفانہ پروپیگنڈہ ہے جو بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بنا ہے۔البتہ وہ لوگ جن کی اشتراکی ادب تک دسترس ہے اور جنہوں نے کھلے ذہنوں کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کے بارے میں آزادانہ طور پر اپنی حقیقت

پسندانہ رائے قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ مگر کیوں کہ یہ ادب بیشتر انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں میں ہے لہٰذا وہ افراد جو ان زبانوں سے واقف نہیں ہیں یا اُن میں اُن کی ہلیت واجبی سی ہے، وہ خواہش کے باوجود اس کے بلا استعیاب استفادے سے محروم ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی ضروریات کے پیشِ نظر سبط صاحب نے یہ کتاب تصنیف کی تھی۔

'موسیٰ سے مارکس تک' کی تصنیف سے قبل سبط صاحب اس موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھ چکے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایوب خان کے زوال کے بعد ملک ایک مرتبہ پھر مارشل لا کی گرفت میں آچکا تھا اور جنرل یحییٰ خان نے قوم سے انتخابات کا وعدہ کیا تھا۔ ملک بھر میں غیر معمولی سیاسی گہما گہمی تھی اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اپنے پروگراموں کے ساتھ عوام کے سامنے بلند بانگ دعوے کر رہی تھیں۔ ایک جانب وہ جماعتیں تھیں جو سماجی انصاف، بنیادی حقوق کی بحالی، صوبائی خودمختاری اور پارلیمانی نظام کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں جب کہ دوسری طرف وہ جماعتیں صف آرا تھیں جو ان امور کو خاطر خواہ اہمیت کا حامل تصور نہیں کرتی تھیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کا اصل مسئلہ ایک ایسی مذہبی ریاست کا قیام تھا جو ان کے تئیں صرف اسی وقت عالم وجود میں آسکتی تھی جب خود ان جماعتوں کی قیادت برسرِ اقتدار آجاتی۔ اس دور میں سوشلزم نظریاتی کشمکش کا اصل محور تھا۔

انہی دنوں لاہور کے ہفت روزہ 'ایشیا' نے مفتی محمد یوسف کا ایک مضمون شائع کیا تھا[۲۴] جس میں مضمون نگار نے ایک عرب مصنف محمد بشیر العوف کی تصنیف 'اشتراکیہم واسلامنا'، کی بنیاد پر اپنے تئیں سوشلزم کی تاریخ بیان کی تھی اور یہ انکشاف کیا تھا کہ سوشلزم کی ابتداء مزدک نے کی اور پھر 'کارل مارکس یہودی اور لینن اور انجلز نے جدید اشتراکیت کی صورت میں پیش کیا۔' اس ایک ہی انکشاف میں کئی غلط فہمیاں پوشیدہ تھیں۔ سبط صاحب نے اس مضمون کے رد میں ایک فاضلانہ مقالہ تحریر کیا جو ہفت روزہ 'لیل و نہار' میں دو قسطوں پر شائع ہوا[۲۵] اس مقالے کا عنوان تھا 'سوشلزم، کچھ خیالی کچھ حقیقی' اس مقالے میں سبط صاحب نے اشتراکیت کی تاریخ مرحلہ وار بیان کی اور ثابت کیا کہ مزدک نہ تو معاشرتی اعتبار سے اشتراکیت کا بانی تھا کہ:

'اشتراکیت کسی فرد کی ایجاد نہیں ہے بلکہ زندگی کے تقاضوں کی ایجاد ہے
اور یہ تقاضے انسانی زندگی کے ساتھ ہی وجود میں آئے۔ اب سے لاکھوں

برس پہلے جب مزدک کیا اس کے آباؤ اجداد بھی پیدا نہ ہوئے تھے انسان
اپنی بقا کے لیے آپس میں مل جل کر رہنے پر مجبور تھا۔"[۲۶]

اور نہ ہی قدیم اشتراکیت کی فکری اساس کا موجد مزدک کو قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس فکری اساس کا موجد افلاطون تھا، جو مزدک سے تقریباً نو سو سال قبل یونان میں پیدا ہوا تھا۔ رہا مارکس کے یہودی ہونے کا تعلق تو اس ضمن میں بھی سبط صاحب نے بڑے دلکش پیرائے میں اظہار خیال کیا:

'مارکسزم محنت کشوں کا تمام دنیا کے محنت کشوں کا خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، ہندو ہوں یا پارسی، انقلابی فلسفہ ہے۔ کارل مارکس، اینگلز اور لینن تمام عمر سرمایہ داری نظام کے خلاف لڑتے اور لکھتے رہے۔ وہ کلیسا کے پادری نہ تھے اور نہ کسی مذہبی فرقے کی اصلاح کرنے اٹھے تھے۔ وہ تو سرمایہ داری نظام کے نقاد تھے اور سوشلزم کے مبلغ۔ وہ جانتے تھے کہ آلات پیداوار اور پیداواری رشتوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ سرمایہ دار ہندو بھی ہو سکتا ہے، مسلمان بھی، عیسائی بھی اور یہودی بھی۔ اسی طرح مزدور یا کاشت کار بھی ہندو یا مسلمان ہو سکتا ہے۔ سرمایہ دار جو برتاؤ اپنے ہم مذہب مزدوروں سے کرتا ہے وہی دوسرے سے بھی۔ لہٰذا اُن کے فکر و عمل کا دائرہ رنگ، نسل اور مذہب کی قید سے آزاد تھا۔ وہ انسانوں کی مادی، اخلاقی اور ذہنی زندگی سنوارنے کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ لوگوں کی عاقبت سنوارنے کا دعویٰ انہوں نے کبھی نہیں کیا۔"[۲۷]

مذکورہ مقالے میں سبط صاحب نے مفتی محمد یوسف اور ان جیسے دوسرے حضرات کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے اشتراکیت کے عہد بہ عہد ارتقا کی تاریخ نسبتاً اختصار کے ساتھ درج کر دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اُسی وقت انہوں نے اس موضوع پر اس کی اہمیت کے پیش نظر ایک مربوط کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

'موسیٰ سے مارکس تک' میں سوشلزم کی تاریخ چوبیس ابواب پر پھیلی ہوئی ہے ابتداء میں 'قدیم اشتراکیت' کے حوالے سے نیچر اور نیچر کی جدلیات اور ابتدائی انسان کے طرز بود و ماند کا سراغ لگایا

گیا ہے۔ اس کے بعد کے نو ابواب میں موسوی شریعت، یونان کی اشرانی کیمونزم، مسیحی اشتراکیت، مزدک کی تحریک، سر تھامس مور کی یوٹوپیا، بیکن کی مادیت اور انقلاب فرانس کے پس منظر میں جدید اقتصادی رویوں کا بیان ہے۔ کتاب کے آخری چودہ ابواب مارکس اور اینگلز کے اشتراکی نظریات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ انہی آخری ابواب میں ذیلی طور پر ہیگل کے تصور مطلق اور اس پر مارکس کے نقد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

'موسیٰ سے مارکس تک' ہو یا سبط صاحب کی کوئی اور تصنیف، یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا کہ وہ اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ ہی ان کے خیالات نقد و جرح سے بالا تھے، لہٰذا اگر ان کی تحریروں پر علمی سطح پر گفتگو کی جائے تو یہ امر اپنی جگہ بہت خوش آئندہ ہے کیوں کہ تنقید اور تحقیق مزید ہی سے خیالات کی تطہیر ہوتی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی صورت اختیار کرتے ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے ملک میں علمی تنقید کی روایت کچھ زیادہ پختہ نہیں ہے۔ عام طور سے مخالفت برائے مخالفت اور دشنام طرازی ہی کو تنقید تصور کرلیا جاتا ہے۔ خود سبط صاحب کی تصانیف بھی اس دشنام طرازی کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکیں۔ یوں تو ان کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس پر بے بنیاد اعتراضات نہ کیے گئے ہوں لیکن جو لے دے 'موسیٰ سے مارکس تک' پر ہوئی وہ اور کسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ کچھ لوگوں نے کتاب پڑھے بغیر اس کے نام سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ سبط صاحب نے حضرت موسیٰ کو سوشلسٹ قرار دیا ہے۔ حالاں کہ سبط صاحب نے حضرت موسیٰ کا ذکر پرانے زمانے کی قبیلہ واری مساوات کے ضمن میں کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کتاب کی اشاعت کو ایک سازش قرار دیا جس کا مقصد مذہبی عقائد کو مجروح کرنا تھا۔ حالانکہ اس کتاب کے نفس مضمون کا کوئی تعلق مذہبی عقائد سے نہیں تھا۔ اکثر معترضین نے شاید کتاب کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا یا اگر کیا بھی تو تعصب کی عینک لگا کر۔ اس کتاب پر ایسا ہی ایک طویل تبصرہ لاہور کے 'نوائے وقت' نے چھاپا تھا جو کئی قسطوں پر مشتمل تھا۔ تبصرہ نگار کا نام مشتاق گمٹالوی تھا۔ موصوف نے کالم کے کالم 'اسلامی عقائد کی تنسیخ کی اس اشتراکی سازش' کو سمجھانے میں صرف کیے جو اس کتاب کے مطالعے کے دوران ان پر منکشف ہوئی تھی۔ مگر خود اشتراکیت کے بارے میں ان کا علم بالکل صفر تھا۔ ان کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دادا فیروز الدین منصور کون تھے۔ سبط صاحب نے کتاب کا انتساب برصغیر کے ممتاز انقلابی دادا فیروز الدین منصور کے نام کیا تھا جنہیں ان کی

بزرگی اور طویل تجربے کی بنا پر پاکستان اور ہندوستان کے نوجوان انقلابی کارکن پیار کے ساتھ 'دادا' کہتے تھے یہاں تک کہ 'دادا' ان کے نام کا جزو بن گیا۔ 'دادا' کے لفظ سے مضمون نگار یہ سمجھے کہ وہ سبط صاحب کے دادا تھے اور سبط صاحب نے اشتراکی فلسفہ ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

'فاضل مصنف نے کتاب اپنے دادا مرحوم کے نام یوں منسوب کی ہے 'دادا فیروزالدین منصور کے نام جو مرتے دم تک سوشلزم کے لیے جدوجہد کرتے رہے' دادا کے ساتھ 'مرحوم' ہم نے 'فیروزالدین' اور مرتے دم تک، کی مناسبت سے لکھ دیا ہے فاضل مصنف نے نہ جانے کیوں اپنے دادا کو مرحوم لکھنا پسند نہیں فرمایا۔ انتساب ظاہر کرتا ہے کہ اشتراکی فلسفہ مصنف کو ورثہ میں ملا ہے اور اس کی تبلیغ واشاعت وہ بطور خاندانی روایت ضروری سمجھتے ہیں۔'[۲۸]

اشتراکیت اور ملک کے ایک اہم انقلابی رہنما کے بارے میں مضمون نگار کی لاعلمی پر تو صدمہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے مگر ایک اہم قومی اخبار اور اس کے مدیر کی بے خبری کو کیا نام دیا جائے جنہوں نے اس مضمون کی اشاعت کے لیے اپنے صفحات مختص کیے۔

'موسیٰ سے مارکس تک' پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ یہ یہودی فکر کی تاریخ ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا خیال تھا کہ کیوں کہ حضرت موسیٰ یہودی مذہب کے بانی تھے اور مارکس کے بارے میں عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ماں باپ کی اولاد تھا (حالاں کہ یہ بات بھی خلاف حقیقت ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی) لہٰذا موسیٰ سے مارکس تک' لامحالہ یہودیت کے ارتقاء کی تاریخ ہوگی، اور تو اور مشہور ادبی نقاد اور شاعر پروفیسر انجم اعظمی بھی جو ایک صاحب مطالعہ بزرگ ہیں۔ اسی مغالطے کا شکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

'موسیٰ اور مارکس میں صرف ایک قدر مشترک ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتری اور یہودی مذہب شروع ہوا اور مارکس نسلاً یہودی تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔'[۲۹]

بجا کہ حضرت موسیٰؑ ایک نبی تھے اور ان سے یہودیت کا آغاز ہوا مگر کارل مارکس کسی معنی میں بھی یہودی نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی بھی مذہبی عقیدے کو تسلیم نہ کرتا تھا اور نہ ہی اس کی فکری کاوشوں کا مقصد مذہبی مسائل میں الجھنا تھا۔ کسی ایک مذہب کے خلاف دوسرے مذہب کی لڑائی

لڑنا بھی اس کے نزدیک کاوشِ لاحاصل تھا۔ البتہ اس کی دلچسپیوں کا اصل میدان سرمایہ دارانہ نظام کے اقتصادی و سماجی رشتوں کی تفہیم تھا۔ بالفرض کوئی مارکس کے باپ دادا کے مذہب کو زبردستی اس سے منسوب بھی کرنا چاہے تب بھی وہ یہودی بہرحال قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ اس کے باپ نے یہودی مذہب ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس امر کی نشاندہی خود سبط صاحب نے، کتاب میں مارکس کے بارے میں اپنے پہلے باب کے پہلے ہی پیراگراف میں کردی ہے مگر ان لوگوں کی نظر اس پر کیوں کر جاسکتی تھی جن کی تنقید کو تحقیق کے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ معترضین نے اس کتاب کا مطالعہ تو کجا ورق گردانی بھی صحیح طور پر نہیں کی ورنہ اس میں ان کو عہد موسوی اور مارکس کے درمیان افلاطون کی اشرافی کمیونزم، مسیحی اشتراکیت، مزدک کی تحریک، سرتھامس مور، بیکن، ہابس، لاک، روسو، بابیو، ماربلی، مسابل، سینٹ سائمن، رابرٹ اووین، چارلس فوریئر، چارلس ہال، ولیم تھامپسن، ٹامسن ہاج کن، جان گرے، فرانسس برے اور باربنی پر وہ آٹھ ابواب ضرور نظر آجاتے جو کوئی دو سو صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جوان سب مفکروں اور مصلحین میں قدر مشترک ہے وہ کسی ایک یا دوسرے مذہب سے ان کی وابستگی نہیں بلکہ ذاتی ملکیت کے خلاف اور اجتماعی ملکیت کے حق میں سوچنے کا انداز ہے۔ یہ سب افراد اجتماعی ملکیت کو انسانی معاشرے کے لیے خیر کا موجب تصور کرتے تھے۔ البتہ ان کے خیالات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ سبط صاحب نے کتاب میں اس چیز کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اجتماعی ملکیت کے بارے میں کس مفکر کے خیالات کیا تھے۔ ان میں کون خیالی سوشلسٹ تھا اور کس نے اس مسئلے کو سائنسی انداز میں برتا تھا۔

پروفیسر انجم اعظمی کو اس کتاب کے نام پر بھی اعتراض ہے اور اسی اعتراض نے بظاہر انہیں مذکورہ بالا نکتہ پیدا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'موسیٰ سے زندگی کا آغاز نہیں ہوتا۔ تاریخ کا آغاز بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ موسیٰ سے کیوں یہ کتاب شروع ہورہی ہے۔ میں نے کتاب پڑھی وہ اس عنوان کی ندرت کے بارے میں خاموش ہے۔'[۳۰]

عنوان کی ندرت پروفیسر صاحب پر شاید اس لیے واضح نہیں ہوسکی کیوں کہ انہوں نے اس کا

مطالعہ انسانی زندگی یا تاریخ کے ارتقا کی کتاب سمجھ کر کیا۔ حالانکہ کتاب کا موضوع نہ تو انسانی زندگی کا ارتقا ہے اور نہ ہی یہ تاریخ کے مختلف ادوار کے مطالعے پر مشتمل ہے، کتاب کا اصل موضوع تو ان مفکرین کے خیالات ہیں جو معاشرتی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے آرزومند تھے اور کسی نہ کسی شکل میں ملکیت کے اشتراکی اصولوں کے حامی تھے۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ کتاب کا آغاز موسیٰ سے ہوتا ہے کیونکہ موسوی عہد کے بارے میں جو باب مصنف نے رقم کیا ہے وہ کتاب کا دوسرا باب ہے جبکہ پہلے باب میں ابتدائی کمیونزم کے مختلف مظاہر کی، جو ماضی قدیم کے قبائلی معاشروں میں نظر آتے ہیں، تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ البتہ کتاب کے عنوان میں موسیٰ سے آغاز کرنے کا سبب یہ ہے کہ قبل از موسوی عہد کے اشتراکی نظاموں کو جو مختلف قبائل میں رائج تھے نہ تو کسی مفکر سے منسوب کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اب تک کسی ایسے جامع فکری منصوبے کو تلاش کیا جاسکا ہے جو اس قدیم عہد میں پیش کیا گیا ہو۔

'موسیٰ سے مارکس تک' پر ہونے والے سارے ہی تبصرے متعصّبانہ نہیں تھے۔ بلکہ بعض حضرات نے اس پر علمی سطح پر تنقید بھی کی اور اس میں چند ایک اہم فروگزاشتوں کی نشاندہی کی۔ مثلاً اس کتاب میں اجتماعی ملکیت اور اشتراکیت کے حوالے سے مسلم معاشروں کے کسی بھی مفکر اور مصلح تمدن کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ اس جانب زبیر صدیقی مرحوم نے ڈان میں اور جمیل الدین عالی نے جنگ میں نشاندہی کی۔ خوش قسمتی سے ہمیں سبط صاحب کے پرانے کاغذات میں ایک نامکمل مضمون کا ابتدائی مسودہ مل گیا جس میں انہوں نے اس تنقید پر اپنی وضاحت پیش کی ہے۔ یہ مضمون وہ بوجوہ مکمل نہیں کر سکے اور ان کا تفصیلی موقف ضبط تحریر میں نہیں آسکا۔ تاہم اس کے صرف ایک پیراگراف ہی سے ان کے طرزِ فکر کا اندازہ ہوجاتا ہے:

> 'مجھ کو اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن اصل سبب یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا میرا مطالعہ بہت ہی محدود ہے، میں مسلمانوں کی تاریخ سے بھی زیادہ واقف نہیں، لہٰذا میں نے اپنی ناقص معلومات کی بناء پر اسلام میں سوشلزم کے خدوخال تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ میرا اصل مقصد پڑھنے والوں کو سوشلسٹ نظریوں کے عہد بہ عہد ارتقاء سے روشناس کرنا تھا۔ مذہبی بحثوں میں رواداری کا یہ عالم ہے کہ سوشلزم پر

سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے ذرا ذرا سی بات پر اسلام دشمنی کے فتوے لگتے ہیں۔ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے اور نظریوں کی تردید نظریوں سے کرنے کے بجائے یہ کہہ کر زبان بند کی جاتی ہے کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس الزام کے بعد بحث و تمحیص کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔'

اسلامی تعلیمات کے بارے میں اپنے مطالعے کے محدود اور اپنی معلومات کے ناقص ہونے کی بات تو شاید سبط صاحب نے انکساری کے طور پر کی تھی کیوں کہ اس وقت بھی جب کہ وہ 'موسیٰ سے مارکس تک' پر کام کر رہے تھے مسلمانوں کی تاریخ اور ہم عصر مسلم معاشروں کے تہذیبی و سیاسی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی البتہ انہوں نے اس وقت تک ان موضوعات پر اتنی تحقیق نہیں کی تھی جو ان کا تقاضا تھا۔ مگر جلد ہی انہیں اس کا موقع مل گیا۔

۱۹۷۰ء کے عشرہ میں عالم اسلام کے مطلع سیاست پر بعض اہم واقعات رونما ہوئے۔ مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ممالک کا ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد تیل کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا اقدام۔ ۱۹۷۰ء سے ذرا پہلے یعنی ۱۹۶۹ء میں پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس اور اسلامی سیکریٹریٹ کا قیام۔ بعد کے برسوں میں ایسی ہی مزید اسلامی سربراہ کانفرنسیں، ۱۹۷۹ء میں ایران میں رضا شاہ پہلوی کے آفتاب اقبال کا غروب ہونا اور علماء کی قیادت میں انقلاب کا برپا ہونا اور پھر پاکستان میں قومی اتحاد کی تحریک جس کا آغاز انتخابات میں دھاندلیوں کے الزام کے ساتھ ہوا مگر جس نے بعد ازاں تحریک نظام مصطفیٰ کا پیرایہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں ایک ایسی حکومت کا قیام جس نے انتخابات کے وعدوں کی بوجوہ عدم تکمیل کے بعد اسلامی نظام کے قیام کو اپنا مقصد و منشور قرار دے ڈالا۔ یہ سب ایسے واقعات تھے جنہوں نے نہ صرف مسلم ممالک میں بلکہ عالمی پریس کو بھی یہ تاثر اخذ کرنے میں مدد دی کہ مسلم ممالک میں مذہبی نشاۃ الثانیہ کی تحریک ثمر بار ہو رہی ہے۔ ان ممالک میں اتحاد و اشتراک کی قوتیں ان کے باہمی تضادات پر غالب آ گئی ہیں اور یہ ممالک گویا ایک بلاک کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ جنہیں حیران کرنے ہی میں مہارت حاصل نہیں ہے بلکہ جو حیران ہو جانے میں بھی ملکہ رکھتے ہیں، ان واقعات سے متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ 'اسلامی بنیاد پرستی' ان پر ایک خبر کی

صورت میں منکشف ہوئی اور وہ یہی سوچا کرتے کہ عالم اسلام کا رخ اسی بنیاد پرست رجحان کے حوالے سے متشکل ہو رہا ہے۔

خود مسلم ممالک میں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اپنے ذرائع ابلاغ کے صبح و شام کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی جو انہیں یہی باور کرارہے تھے کہ نہ صرف یہ کہ ان کی دنیائے فکر و عمل میں ایک انقلاب واقع ہو رہا ہے بلکہ باقی ماندہ دنیا بھی اس کی حلقہ بگوشی کے لیے مضطرب و بے چین ہے۔ مسلم ممالک میں مذہبی رومانیت پسندی (Religious Romanticism) کا رجحان ویسے تو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے موجود تھا اور اس کے اپنے سماجی محرکات بھی تھے مگر اس رجحان میں جس قدر اضافہ اس زمانے میں ہوا اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اتفاق سے ہجری کیلنڈر کی چودہ صدیاں بھی ۱۹۷۹ء میں مکمل ہو رہی تھیں۔ پندرہویں صدی ہجری کی آمد ایک علامتی قدر کی حامل تھی۔ چنانچہ دعوے کیے جانے لگے کہ آنے والی صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہوگی۔

یورپ میں پندرہویں صدی کے اوائل تک کا عرصہ نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کا دور کہلاتا ہے، اس دور میں یورپی معاشرے میں بنیادی اقتصادی، سماجی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ فیوڈل ازم کا خاتمہ ہوا تھا اور اس کی جگہ ایک بورژوا معاشرے نے لی تھی۔ نشاۃ الثانیہ کے اس دور میں تہذیبی سطح پر انسان دوستی اور بہبود بشر کے تصور (Humanism) کا دور دورہ ہوا جس کے مطابق فرد کے وقار اور اس کے حقوق کا احترام لازمی قرار پایا اور انسان، ایک انسان کی حیثیت سے لائق احترام ٹھہرا۔ شخصیت کی نشو و نما، خوشحالی اور فکر کی آزادی کو فرد کے بنیادی فطری حقوق کے طور پر تسلیم کیا گیا، نشاۃ الثانیہ کی یہ تہذیبی اقدار عہد وسطیٰ کی مذہبی جنونیت، عدم رواداری اور کٹھ ملائیت کی عین ضد تھی۔ اس فکری رجحان کو سائنسی ایجادات اور انکشافات سے غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ نشاۃ الثانیہ کے اس دور کے اپنے بہت سے تضادات بھی تھے۔ مثلاً فطرت کی طرف اس دور کے مفکرین کا رویہ غیر تاریخی تھا۔ انفرادیت پسندی پر غیر معمولی اصرار نے معاشرے کی اجتماعی شخصیت اور کردار کو پس پشت ڈال دیا تھا یا پھر یہ کہ نشاۃ الثانیہ کے اس دور میں فرد کے حقوق اور اس کے شخصی وقار کے خواب انفرادیت پسندی اور ذاتی ملکیت کے حوالے ہی سے دیکھے گئے، تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے دائرے میں فرد کی آزادی اور اس کی

بشری صلاحیتوں کی نشوونما کے امکانات ویسے ویسے معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں جیسے جیسے یہ نظام ترقی کرتا جاتا ہے۔ان تضادات کے باوجود تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کا مثبت پہلو یہی تھا کہ اس نے یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے تاریک عہد سے باہر نکالا اور قرونِ وسطیٰ اور روشن خیالی (Enlightenment) کے دور (یعنی ۱۷رویں اور ۱۸رویں صدی) کے درمیان واسطے کا کام کیا۔

نشاۃ الثانیہ کی اصطلاح کو مسلم ممالک میں بڑی بداحتیاطی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے یہاں اس کو بالعموم مذہب کے احیا کے مفہوم میں برتا جاتا ہے احیا پسندوں کے ذہن میں ایک بڑا سادہ سا World View ہے جس کی رو سے عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی زندگیاں رفتہ رفتہ اسلام سے دور ہوتی چلی گئیں جس کے نتیجے میں وہ امت جو دنیا میں حکمرانی اور شوکت وقوت کے مناصب پر فائز تھی، قعر مذلت میں گرتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ حاکم سے محکوم اور غالب سے مغلوب بن گئی۔ اگر مسلمان ایک مرتبہ پھر عروج چاہتے ہیں (عروج کا تصور بھی بالعموم غلبۂ اسلام اور دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی کے تصور پر استوار ہوا ہے) تو انہیں چاہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر اصل اسلام کی طرف پلٹیں اور اس کو اپنی زندگیوں میں جاری وساری کریں۔ اصل اسلام، کا تصور بھی ان کے نزدیک بالعموم یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کی جو صورتیں عہد رسالت میں متشکل ہوئی تھیں انہیں کو ہو بہو اختیار کر لیا جائے۔ گویا زیادہ زور اسلام کی روح پر نہیں بلکہ اس کے خارجی مظاہر اور رسوم وروایات (rituals) پر دیا جاتا ہے۔

احیائے اسلام کے اس تصور میں زمان ومکان کی حقیقیں کوئی حیثیت رکھتی ہیں نہ تاریخ کے ارتقائی عمل کے اعتراف کا کوئی اشارہ مل پاتا ہے۔انسان کے سماجی حالات میں اور افکار وخیالات میں گزشتہ چودہ صدیوں میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کو اسلام کا یہ جامد تصور خاطر میں نہیں لاتا۔ چودہ سو سال کے طویل عرصے میں مسلم معاشرے جن تجربات سے گزرے ہیں یا دنیا کے دیگر مراکز تہذیب میں جن انقلابی تبدیلیوں کی کارفرمائی رہی ہے، ان کو بھی لائق اعتنا تصور نہیں کیا جاتا۔

اس غیر تاریخی رویے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خود عہد حاضر کے سماجی ومعاشرتی حقائق بھی چشم تصور سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ آج مسلم معاشرے کن سماجی واقتصادی حالات سے دوچار ہیں، ان

معاشروں میں مقتدر طبقات اور سواد اعظم میں مغائرت کی کیا نوعیت ہے، سیاسی اقتدار کن افراد کے تصرف میں ہے، ان سب سوالات سے اس تصوری نقطۂ نظر کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نتیجتاً اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے علمبرداروں اور ان کی فکر سے نہ تو مروجہ سماجی و سیاسی نظاموں کو کوئی خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی مسلم معاشروں کے مقتدر طبقات اس فکر سے کسی قسم کا خوف محسوس کرتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ فکر حالات کو جوں کا توں برقرار رکھنے (Status quo) میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ گزشتہ چند برسوں میں مسلم ممالک میں اقتصادی و سیاسی حکمرانی پر فائز حضرات نے جس چابکدستی سے اسلام کے نام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے وہ شاید ہی کسی کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ آج مسلم ممالک کی اکثریت یا تو ملوکیتوں کے تہہ دام ہے یا فوجی آمریتوں اور شخصی حکومتوں کے زیر تسلط ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فی زمانہ اسلام کے احیاء کے سب سے بڑے دعوے دار بھی یہی حکمران ہیں۔ چنانچہ کوئی دن نہیں جاتا جب ان ملکوں میں کثیر سرمائے سے بین الاقوامی کانفرنسیں نہ منعقد کی جاتی ہوں۔ آئے دن اسلامی یکجہتی کے پرشکوہ اعلامیے جاری کئے جاتے ہیں۔ مذہبی تہواروں پر عقیدت و احترام کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جن ملکوں میں حکمران طبقات کے خلاف نفرت و مزاحمت میں شدت کے آثار پیدا ہوتے ہیں وہاں اسلام کو اس احتجاجی رو کی بیخ کنی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور عہد وسطیٰ کے تعزیری نظام کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر مخالفین کو اس کے شکنجے میں کس دیا جاتا ہے۔ مسلم ممالک جہاں اکثر و بیشتر شخصی حکمرانی کا دور دورہ ہے کس طرح اسلام کو حکمرانوں کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کی مثالیں کم و بیش ہر ملک میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ سابق شاہ ایران رضا شاہ پہلوی جن کے استبدادی طرز حکمرانی کی تفصیلات سے ساری دنیا واقف ہو چکی ہے بقول خود، انبیائے کرام سے مسلسل رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ حضرت علی خواب میں نہیں بلکہ عالم بیداری میں ان کے پاس تشریف لاتے اور ان کو مشوروں سے نوازتے تھے۔ اوریانا فلاچی کو اپنے انٹرویو میں انہوں نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ انہیں عالم تصور میں انبیائے دائمہ سے رہنمائی کے جو تجربات ہوتے ہیں ان کا سبب یہ ہے کہ خدا نے انہیں ایک خصوصی مشن کی تکمیل کے لیے منتخب کیا ہے۔ جب اوریانا نے ان روحانی تجربات کی تفصیل جاننا چاہی تو شاہ نے انہیں ریاستی راز (State Secret) قرار دے کر چپ سادھ لی۔[۳۱]

عہدِ وسطیٰ میں مطلق العنان بادشاہ اپنی حکمرانی کو ودیعت الٰہی اور خود کو الوہی اقتدارِ اعلیٰ کا پرتو قرار دیتے تھے۔ ہم عصر مسلم ممالک کے طرزِ حکمرانی میں بھی اسی رجحان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں مذہب کو جس طرح ریاست کی نظریاتی اساس کے طور پر پیش کیا جارہا ہے وہ واقعی ایک 'سیاسی و ریاستی راز' (State Secret) ہے اور دانش حاضر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس 'راز' کو راز نہ رہنے دے اور مسلمان عوام کی معتوب و محکوم اکثریت کے سامنے اس کو طشت از بام کرے۔ مارکس نے اپنی تصنیف یہودی مسئلے کے بارے میں، (On Jewish Question) میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مذہب کی جانب سے سیاست میں کسی کردار کا مطالبہ ہوتا ہے تو مسئلہ مذہبی نہیں رہتا بلکہ سیاسی بن جاتا ہے اور اسے سیاست ہی کے دائرے میں رکھ کر دیکھنا چاہئے۔ مسلم ممالک میں جہاں کہیں ریاستی اداروں کے حوالے سے قیامِ اسلام یا نفاذِ اسلام کی کوششیں یا دعوے کیے جارہے ہیں وہاں ان کے پیچھے کارفرما سیاسی محرکات کا جائزہ از حد ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم عصر مسلم معاشروں کے حالاتِ زیست اور ان کے اقتصادی و سیاسی نظاموں کے تضادات سبط صاحب کی نظرِ حقیقت شناس سے اوجھل نہیں رہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی بیشتر تخلیقی سرگرمیوں کا محور مسلم معاشروں اور بالخصوص پاکستان کے سماجی مسائل ہی تھے۔ اس ضمن میں ان کی تحقیق اور مطالعے کے ابتدائی نقوش ان اخباری مضامین میں دیکھے جاسکتے ہیں جو پروفیسر قمر الدین خان اور ایڈووکیٹ خالد اسحاق کے ساتھ دو علیحدہ مباحثوں کے حصوں کے طور پر شائع ہوئے۔ ان میں سے اول الذکر مباحثے کا پس منظر یہ تھا کہ پروفیسر مذکور نے جو ایک عالم فاضل بزرگ تھے، ۱۹۷۳ء میں یوم پاکستان کے موقع پر روزنامہ 'ڈان' میں مسلم ممالک میں جمہوریت کی ناکامی کے موضوع پر ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔[۳۲] جس میں ان ملکوں میں جمہوریت کے برگ و بار نہ پانے کے کئی اسباب گنوائے تھے۔ مثلاً ان کا خیال تھا کہ مسلمان ممالک جمہوری نظریات کی تخلیق کی طرف سے غافل رہے۔ مذہبی علماء بھی بیشتر مسلکی اختلافات یا برسرِ اقتدار حکمرانوں کو اسناد شریف دینے میں مصروف رہے۔ جمہوری نظریات کی عدم موجودگی میں حکمران مطلق العنان سے مطلق العنان تر ہوتے چلے گئے اور عوام پر ان کا جبر روز افزوں رہا۔ پروفیسر قمر الدین خان کے نزدیک علاقائیت کے رجحانات نے بھی مسلم معاشروں میں جمہوریت کی راہیں مسدود کیں اور ان

معاشروں کو کبھی بھی مستحکم نہ ہونے دیا۔ فیوڈل ازم بھی ان کے خیال میں ایک سنگِ راہ تھا جس کی وجہ سے جمہوریت کا سفر شروع نہ ہوسکا۔ البتہ وہ فیوڈل ازم کو بنیادی رکاوٹ تصور نہیں کرتے۔ سبط صاحب نے پروفیسر قمرالدین خان کے مضمون پر اپنے تبصرے [۴۳] میں ان کے اس خیال کی تائید کی کہ مسلم معاشرے ہنوز جمہوریت سے محروم ہیں اور یہ کہ ان ممالک میں جمہوری نظریات صدیوں سے ناپید رہے ہیں، مطلق العنان حکومتوں کو علماء اور مذہبی پیشواؤں کی جانب سے جو تائیدی فتوے دیے جاتے تھے ان کے منفی اور مضر اثرات کے بارے میں بھی پروفیسر صاحب کے خیالات سے سبط صاحب کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ مسلم معاشروں کی جو مایوس کن تصویر پروفیسر قمرالدین خان کے مضمون میں ابھرتی تھی وہ سبط صاحب کے ذہن میں موجود مسلم تاریخ کے خاکے سے بڑی حد تک مختلف تھی۔ سبط صاحب کا پروفیسر صاحب پر اعتراض یہ تھا کہ ان کا تصور تاریخ حرکی نہیں بلکہ ساکت (Static) ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کو بڑے سپاٹ انداز میں دیکھ رہے ہیں جب کہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح مسلمان بھی گزشتہ تقریباً چودہ صدیوں میں مختلف ادوار سے گزرے ہیں۔ مکہ اور مدینہ کے ابتدائی مسلم معاشرے قبائلی طرز کے حامل تھے لہٰذا ان میں جمہوریت کی نوعیت بھی قبائلی تھی جس میں اطاعت امیر کا اصول بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ قبائلی معاشرے کا دوسرا اہم نظریاتی ستون 'تقدیر' (Predestination) کا تصور تھا جس کی رو سے انسان کی اپنی تقدیر کا فیصلہ خدا کی طرف سے پہلے ہی کردیا جاتا ہے۔ اس نظریے کے نتیجے میں انسان کی اپنی قوت عمل ماند پڑجاتی ہے اور اسے با آسانی یہ باور کرایا جاسکتا ہے کہ اگر زندگی میں اس کو کلفتوں اور تکالیف کا سامنا ہے تو یہ مصائب اس کی تقدیر میں لکھے ہیں اور ان سے نجات کی کوئی سبیل، کوئی تدبیر اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوسکتی۔ تقدیر کا تصور امتیازات پر قائم معاشروں میں مقتدر طبقات کے دائمی تسلط کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے کیوں کہ محکوم اکثریت کو بڑی آسانی کے ساتھ اس تصور کے ذریعے بے عمل بنا دیا جاتا ہے۔ سبط صاحب کا خیال تھا کہ تقدیر کا یہ تصور دیگر قبائلی معاشروں میں بھی رائج تھا چنانچہ قدیم سمیری، مصری اور یونانی بڑی شدت کے ساتھ اس پر یقین رکھتے تھے۔

مدینہ کی قبائلی جمہوریت بہت زیادہ عرصہ باقی نہ رہ سکی اور جلد ہی ایک فیوڈل ریاست میں تبدیل ہوگئی، بعدازاں فتوحات کے ذریعے اس ریاست کی توسیع بھی ہوتی رہی۔ گو عربوں اور

مسلمانوں کی تاریخ میں مختلف خاندان سریر آرائے حکومت ہوئے مگر فیوڈل ازم کا نظام برقرار رہا۔

فیوڈل حکمرانوں نے قبائلی جمہوریت کو تو ختم کر دیا مگر اطاعتِ امیر اور تقدیر کے نظریات فیوڈل ازم میں بھی جاری رہے، سبط صاحب کا خیال تھا کہ گو قدامت پسند اور مصلحت کوش علماء نے ان نظریات کو قبول عام دلانے میں سرگرمی سے حصہ لیا اور مطلق العنان حکمرانوں کے حق حکمرانی پر حرف گیری کو اسلام کو کمزور کرنے اور اسلامی ریاست کے شکوہ کو ضعف پہنچانے کے مترادف قرار دیا لیکن اس سے یہ ہرگز نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں حکومت وقت کے خلاف آواز احتجاج بلند کرنے کی کوئی روایت نہیں رہی۔ ابوذر غفاری، امام حسین، امام ابوحنیفہ کی قربانیاں اس امر کی تائید کرتی ہیں۔ مسلم تاریخ میں ایسے گروہوں کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے اپنے عہد کی فیوڈل اقدار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ضمن میں سبط صاحب نے معتزلہ کے تصورات اور صوفیائے کرام کی خدمات کا حوالہ دیا۔

سبط صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فیوڈل ازم ہی دراصل مسلمانوں کی جمہوریت سے محرومی کا بنیادی سبب ہے، ماضی میں جو احتجاجی تحریکیں اٹھیں اور جن شخصیات نے عوام کے حقوق کے لیے آواز اٹھا کر سلاطین اور حکمرانوں کے غضب کو دعوت دی، وہ اگر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکیں تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ ان حالات کو پیدا کرنے میں ناکام رہیں جو جمہوریت کے لیے ضروری ہیں۔

سبط صاحب نے یورپ میں فیوڈل ازم کے زوال اور جمہوریت کے فروغ کے اسباب کا ذکر کیا اور پھر عالم اسلام سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ یورپ میں جمہوریت کی تحریک تجارتی اور صنعتی طبقے کی زیر قیادت شروع ہوئی تھی۔ مسلمان ممالک کے تجارتی اور صنعتی طبقات کو بھی اصولاً یہی کردار ادا کرنا چاہئے تھا مگر یہاں ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانوی اور فرانسیسی بورژوازی کو محنت کش طبقات کے نظریہ یعنی سوشلزم کے خطرے کا سامنا نہیں تھا مگر مسلم ممالک کے تجارتی اور صنعتی طبقات محنت کش طبقات کے ابھار کا خطرہ ہردم محسوس کرتے ہیں لہٰذا انہوں نے فیوڈل طبقے کے ساتھ مصالحت کی راہ اختیار کر لی ہے اور جمہوریت اور شہری آزادی کے خلاف ایک نوع کا محاذ بنالیا ہے۔ مسلم بورژوازی نے فیوڈل طبقے کی قیادت کو بھی اس شرط کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اس کی منافع خوری کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔

فیوڈل ازم نے مسلم ممالک میں جو منفی کردار ادا کیا ہے وہ صرف اقتصادی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ پورا نظامِ تمدن اس سے متاثر ہوا ہے۔ کیوں کہ بقول سبط صاحب، فیوڈل ازم محض اقتصادی نظام نہیں ہے بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو رجعت پسندی اور توہمات کو جنم دیتا ہے اور مروجہ مسلمات کے بارے میں سوالات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ نیز معاشرے کے نچلے طبقات کو تعلیم کی سہولت بہم نہیں ہوتی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آج مسلم ممالک کی ایک بڑی اکثریت کے تخلیقی جوہر کو ابھرنے سے روک دیا گیا ہے۔ فیوڈل ازم کا سب سے ضرر رساں پہلو یہ ہے کہ اس نے مسلم ممالک میں بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ اگر مسلم ممالک کے جمہوری عناصر جمہوریت کے قیام میں مخلص ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ فیوڈل ازم کے خلاف صف آرا ہوں جو ان کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے۔

سبط صاحب کے جوابی مضمون کے بعد پروفیسر قمر الدین خان کا جواب الجواب شائع ہوا[۳۴] انہوں نے نہ صرف مسلم تاریخ کے بارے میں اپنے نتائج مطالعہ کا دفاع کیا بلکہ جمہوریت کے عدم فروغ کے ضمن میں فیوڈلزم کے بنیادی عامل ہونے کے بارے میں سبط صاحب کی رائے سے بھی اختلاف کیا۔ مسلم تاریخ کے ضمن میں ان کو اصرار رہا کہ گزشتہ چودہ صدیوں میں جمہوریت کے قیام کی کوئی قابل ذکر تحریک مسلمان معاشروں میں نہیں اٹھی۔ جن تحریکوں اور رجحانات کی جانب بالعموم اشارہ کیا جاتا ہے مثلاً خوارج، معتزلہ، باطنیہ، قرامطہ، اخوان الصفا یا صوفیا کرام کا مسلک، قمر الدین خان کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی تحریک یا رجحان جمہوریت کے عناصر اپنے اندر نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ یہ یا تو نراجیت پسند تھے (خوارج، باطنیہ، قرامطہ) یا 'نام نہاد عقلیت پسند' تھے جو عقل کی روشنی میں اسلام کی تعبیر پیش کرنے کے بجائے محض یونانی علوم اور اسلام میں ارتباط کے جویا تھے (معتزلہ) صوفیائے کرام کا کردار بھی جمہور دشمن کردار تھا کیوں کہ وہ عوام کو دنیاوی چیزوں کی طرف راغب نہ ہونے، محض اللہ سے لو لگانے اور مصائب کا صبر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا پیغام لوگوں کو عمل پر اکسانے کے بجائے، بے عملی کا راستہ دکھاتا تھا۔

مسلم معاشروں میں فیوڈلزم کی شروعات اور اس کے کردار کی وسعت کے بارے میں پروفیسر قمر الدین خان کو سبط صاحب سے بنیادی اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فیوڈل ازم اسلامی تاریخ میں تیسری اور چوتھی صدیوں میں متعارف ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور

اسلام کی تعلیمات پس منظر میں جاتی جا رہی تھیں۔ سلطنت کو مکمل تخریب سے بچانے کے لیے مشہور سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی نے اس کو چھوٹے بڑے ہزاروں تعلقوں میں تقسیم کر کے انہیں جاگیرداروں کے سپرد کر دیا۔ مقصد اس انتظام کا یہ تھا کہ جاگیردار ان تعلقوں کے عوض مرکز سے وفاداری نبھائیں گے اور یوں سلطنت کو سہارا مل جائے گا۔ یہ امید تو پوری نہیں ہوئی البتہ بعد میں آنے والے سیاسی طالع آزماؤں نے اس نظام کو برقرار رکھا کیونکہ یہ نظم و ضبط (regimentation) کے نقطۂ نظر سے بڑا کارآمد ثابت ہوا تھا۔

فیوڈلزم کی شروعات کے ضمن ہی میں پروفیسر قمر الدین مختلف نقطۂ نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے دائرہ اثر کے بارے میں بھی ان کی رائے سبط صاحب سے مختلف تھی۔ ان کا خیال تھا کہ فیوڈل ازم مسلم معاشروں میں جمہوریت کی ناکامی کا ایک سبب تو ہو سکتا ہے مگر 'واحد' سبب ہرگز نہیں ہے۔ دراصل پروفیسر صاحب سے سبط صاحب کے مؤقف کو سمجھنے میں ایک چوک ہوئی۔ وہ یہ سمجھے کہ سبط صاحب فیوڈلزم کو ناکامی جمہوریت کا 'واحد' سبب سمجھتے ہیں جب کہ سبط صاحب اس کو 'بنیادی' سبب قرار دے رہے تھے۔ پروفیسر قمر الدین خان کا فیوڈلزم کا تصور کس قدر غیر تاریخی اور محدود تھا اور وہ اس کو زندگی کے دیگر شعبوں مثلاً سیاست اور فکر و اخلاق سے کس درجہ لاتعلق سمجھتے تھے اس کا اندازہ ان کی اس رائے سے ہو جاتا ہے:

> "صنعتی انقلاب (یورپ میں) کے بعد فیوڈلزم اپنی موت آپ مر گیا۔ اور سوائے فرانس کے کہیں بھی اس کو تشدد کے ذریعے ختم نہیں کیا گیا۔ مغربی اقوام کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انہوں نے پادریوں کے مفروضات سے گلوخلاصی حاصل کی، بنیادی حقوق، شہری آزادیوں، قانون کی حکمرانی، مساوات، فرد کے وقار اور سب سے بڑھ کر اقتصادی جمہوریت کے لیے جدوجہد کی اور انہوں نے یہ سب فیوڈلزم کے خاتمے سے پہلے حاصل کر لیا تھا۔"[۳۵]

سبط صاحب نے اس مباحثے کے اختتامی مضمون میں ان غلط فہمیوں اور فکری مغالطوں کی تصحیح کی کوشش کی جو پروفیسر قمر الدین خان کے نقطۂ نظر میں پوشیدہ تھیں۔[۳۶]

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس امر پر زور دیا کہ گو مسلم معاشروں میں نہ تو کبھی کوئی باضابطہ

جمہوری فلسفیانہ نظام مدون ہوا اور نہ ہی کوئی منظم جمہوری تحریک شروع ہوئی مگر ان معاشروں کو کامل سکوت کا شکار بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ فیوڈل آمریتوں کے خلاف بغاوت کے جو رجحانات پیدا ہوتے رہے وہ کوئی واضح رُخ اختیار نہیں کر سکے۔

مسلم معاشروں میں فیوڈل ازم کے آغاز کے بارے میں انہوں نے پروفیسر قمرالدین خان کے اس خیال کی تردید کی کہ یہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں متعارف ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

'حقیقت یہ ہے کہ اموی اور عباسی دور میں بھی جو نظام تھا وہ بنیادی طور پر فیوڈل تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ فیوڈلزم سے مراد کیا ہے فیوڈلزم ایک ایسا سماجی نظام ہے جو بنیادی طور پر زراعت پر بنیاد رکھتا ہے اور جس میں زمین کی ملکیت ایک ایسے طبقے کے پاس ہوتی ہے جو خود کاشتکاری نہیں کرتا۔ ایشیاء میں زمین کی ملکیت ریاست یا بادشاہ کے قبضے میں ہوتی تھی جو یہ زمین لوگوں میں ان کے مراتب یا ریاست کے لیے ان کی خدمات کی مناسبت سے تقسیم کرتا تھا۔ لہٰذا ہر فیوڈل ریاست میں شاہی خاندان، اشرافیہ، ناظمین، مذہبی پیشواؤں اور سپاہیوں کا ایک طبقاتی نظام مراتب (hierarchy) ہوتا تھا جسے بادشاہ کی طرف سے زمین عطا کی جاتی تھی۔ کاشتکاروں کو ملکیت کا کوئی حق نہیں تھا بلکہ وہ زمینداروں کی مرضی و منشا کے پابند ہوتے تھے جو پیداوار میں سے ریاست کے ٹیکس کی ادائیگی کے بعد زیادہ تر حصے پر خود قبضہ کر لیتے تھے۔ یہ نظام ایران اور عراق کی ساسانی سلطنت اور شام اور فلسطین کی بازنطینی سلطنت میں اس وقت بھی قائم تھا جب ساتویں صدی میں اسلام کا ظہور ہوا۔'[۳۷]

یورپ میں فیوڈلزم کے زوال کے بارے میں سبط صاحب نے لکھا کہ یورپ کے عوام نے اپنے جمہوری حقوق فیوڈلزم کے خلاف جدوجہد کے عمل ہی کے دوران حاصل کیے۔ یہ حقوق انہیں فیوڈل ازم کے خاتمے سے پہلے حاصل نہیں ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ فیوڈل ازم کو صنعتی قوتوں نے شکست دی۔ یہ اپنی موت آپ نہیں مرا کیوں کہ کوئی بھی سماجی نظام رضاکارانہ طور پر اقتدار سے

علیحدگی اختیار نہیں کرتا۔

اپنے ابتدائی مضمون میں پروفیسر قمرالدین خان نے علاقائیت کو جمہوریت کے فروغ نہ پانے کا ایک سبب قرار دیا تھا۔ سبط صاحب اپنے اختتامی مضمون میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مگر علاقائیت کا جمہوریت کی ناکامی سے کیا تعلق ہے۔ علاقائیت کی تحریکیں اور ملکوں میں بھی موجود رہی ہیں مثلاً برطانیہ میں ویلز اور اسکاٹ لینڈ کی علیحدگی پسند تحریکیں، سوئٹزرلینڈ میں جرمنی، اطالوی اور فرانسیسی رجحاناتِ علیحدگی اور کینیڈا میں انگریزی اور فرانسیسی اختلافات مگر جمہوریت ان ملکوں میں پھر بھی کامیاب ہے، ہندوستان میں بھی زبردست علیحدگی پسند تحریکیں موجود رہی ہیں مگر جمہوریت وہاں ناکام نہیں ہوتی۔ دوسری طرف جنگ عظیم دوئم سے قبل کا جرمنی اور جاپان ہیں جہاں کوئی علیحدگی پسند تحریک نہیں تھی مگر پھر بھی جمہوریت ناکام رہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علیحدگی پسند تحریکیں کامیاب ہی اس وقت ہوتی ہیں جب لوگوں کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کردیا جاتا ہے۔"[۳۸]

مذکورہ مباحثے کی روشنی میں سبط صاحب کے طرزِ فکر کے خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، وہ فیوڈل ازم کو محض ایک اقتصادی نظام تصور نہیں کرتے بلکہ پیداواری رشتے کے ایک ایسے دروبست کے طور پر دیکھتے ہیں جس کے اثرات سماجی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا خواہ وہ سیاست ہو یا اخلاق، یا پھر نظامِ فکر و احساس، احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے فکری نظام میں انسانی تمدن کی بنیاد قوانین معاش یا پیداواری رشتوں پر استوار ہوتی ہے، جب کہ اس کا بالائی نظام سیاست و اخلاق میں متشکل ہوتا ہے۔ مسلم معاشروں کی بابت ان کا اندازِ نظر یہی تھا کہ ان میں معنوی تمدنی تبدیلی کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی تکمیل بالائی ڈھانچے میں بعض اوپری یا سطحی ردوبدل سے نہیں بلکہ پیداواری رشتوں میں انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

دوسری اہم بات جو اس مباحثے سے اجاگر ہوئی وہ تاریخ کے باب میں ان کی بصیرت تھی۔ سبط صاحب کے نزدیک تاریخ بدلتے ہوئے سماجی رشتوں کے سلسلۂ عمل کا نام ہے۔ مسلم معاشرے

داخلی سطح پر ہر چند بہت زیادہ تغیرات سے نہیں گزرے اور ایک بار قبائلیت سے فیوڈل ازم میں قدم رکھنے کے بعد یہ بیشتر اسی کے ہو رہے مگر مسلمانوں کی تاریخ اختلافات و احتجاج کے رجحانات سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ رجحانات ان تضادات ہی کا مظہر تھے جو فیوڈل ازم کا شاخسانہ ہیں۔ البتہ اگر یہ اختلافی واحتجاجی آوازیں اور خیالات و مسالک اپنے مقاصد میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوئے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کا ہدف براہ راست طور پر اس تمدنی بگاڑ کی بنیاد یعنی فیوڈل ازم نہیں تھا بلکہ اس کے بعض ناپسندیدہ مظاہر تھے۔ دوسری بات یہ کہ ابھی ان معاشروں میں وہ حالات پیدا نہیں ہوئے تھے اور وہ اقتصادی بنیادیں فراہم نہیں ہوئی تھیں جو حقیقی تبدیلی کی راہ ہموار کرتیں۔

دوسرا اخباری مباحثہ جو پہلے کے مقابلے میں زیادہ طویل ثابت ہوا سیکولرازم کے موضوع پر تھا یہ مباحثہ بھی 'ڈان' ہی کے صفحات میں شروع ہوا اس سلسلے میں سبط صاحب نے سیکولرازم کی حمایت اور مشہور قانون دان خالد اسحاق ایڈووکیٹ نے مخالفت میں اپنے اپنے دلائل دیئے بعد ازاں اس مباحثے میں اور بھی حضرات شامل ہوئے اور یوں کئی ماہ تک یہ موضوع علمی حلقوں میں زیر بحث رہا۔ یہاں ہم سیکولرازم کے موضوع پر سبط صاحب کے خیالات کی تفصیل میں نہیں جا رہے اس کا احاطہ آئندہ صفحات میں اس مقام پر کیا جائے گا جہاں 'نوید فکر' اور پاکستان میں افکار کی جنگ' کی تفصیلات آئیں گی۔

جن دنوں سبط صاحب پاکستان میں نظریاتی کشمکش اور اس کے پیچھے کارفرما سماجی و اقتصادی اسباب کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر میں مصروف تھے اور ریاست اور مذہب کے موضوع پر ایک کتاب ان کے پیش نظر تھی انہی دنوں ہمسایہ ملک ایران ایک زبردست انقلابی ہلچل کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پہلوی ریاست جس کی بنیادیں بظاہر بہت مضبوط تھیں اور جس کی تعمیر میں امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا آناً فاناً ریت کی دیوار کی طرح بیٹھی جا رہی تھی تا آنکہ انقلاب کامیاب ہوا۔ شاہ کو فروری ۱۹۷۹ء میں ملک سے رخصت ہونا پڑا اور انقلابی حکومت نے آیت اللہ خمینی کی قیادت میں ملک کی باگ دوڑ سنبھالی۔ انقلاب ایران ایک دنیا کے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔ شاہ کے دور عروج میں کون سوچ سکتا تھا کہ وہ سلطنت جسے اس خطے میں استحکام اور قوت و شوکت کا گہوارہ کہا جاتا تھا وہ خس و خاشاک کا گھروندا ثابت ہوگی۔ انقلاب ایران کے بعد سماجی و سیاسی علوم کے ماہرین نے اس واقعہ کے اسباب و محرکات کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس کا سلسلہ

آج تک جاری ہے اردو زبان میں بھی اس موضوع پر کئی کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں مگر ان میں سے بیشتر میں یا تو انقلاب سے قبل اور بعد کے واقعات کو یکجا کر دیا گیا ہے یا مصنفین نے انقلاب کے بعد ایران کا دورہ کر کے اپنے مشاہدات اور تاثرات رقم کر دیئے ہیں۔ بہت کم تحریریں انقلاب کے محرکات، انقلابی عمل کی نوعیت اور مستقبل کے امکانات کے جائزہ پر مشتمل ہیں۔ ایران میں انقلابی ہلچل کے آغاز ہی پر سبط صاحب نے دوسرے موضوعات پر اپنے کام کو مؤخر کر کے اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا ان کی تصنیف 'انقلاب ایران' بجا طور پر ایرانی انقلاب کے سماجی و اقتصادی محرکات، انقلاب کے حقیقی کردار اور انقلاب کے بعد ایران میں جنم لینے والے تضادات کا معروضی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

معروف مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی نے کہیں لکھا تھا کہ ہم عصر تاریخ کو ضبطِ تحریر میں لانا ماضی قریب و بعید کی تاریخ لکھنے کے مقابلے میں بدرجہا مشکل کام ہے یہ بات بھی درست ہے کہ انسان جس کل کا خود حصہ ہو اس کا مکمل مشاہدہ اور ادراک اور پھر اس کا ایسا معروضی تجزیہ کرنا کہ تحریر محض صحافیانہ عبارت بن کر نہ رہ جائے خاصا دشوار کام ہے۔ انقلاب ایران کے تجزیہ کے ضمن میں اضافی مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس موضوع پر ہمارے یہاں بنیادی نوعیت کا مواد بھی میسر نہیں تھا۔ ہمارے اخبارات اور نہ ہی جامعات اور دیگر تحقیقی اداروں نے کبھی ایران کے بارے میں تنقیدی نقطۂ نظر سے سوچا تھا چنانچہ سبط صاحب کو زیادہ تر انگریزی اور فارسی زبان کے قدیم و ہمعصر حوالوں سے مدد لینی پڑی۔ جن دنوں وہ اس کتاب پر کام کر رہے تھے ان کا بیشتر وقت شہر کی مختلف لائبریریوں میں گزرتا تھا جہاں وہ کتابوں کے علاوہ تازہ اخبارات و جرائد سے بھی نوٹس لیتے تھے۔ پیر حسام الدین راشدی کے ذاتی کتب خانے سے بھی انہوں نے فارسی ادب کی بعض نادر کتابیں حاصل کیں اس کے علاوہ وہ مختلف ذرائع سے اس انقلابی لٹریچر کو بھی حاصل کرتے جو ایران کے انقلابی خفیہ طور پر چھاپتے کیوں کہ ایران میں اس کی ممانعت تھی۔ انگریزی کی بھی بعض کتابوں سے سبط صاحب نے کافی مدد لی۔ مثلاً فریڈ ہالیڈے کی کتاب 'ایران، آمریت اور ترقی'[۲۷] جو بجائے خود پہلوی ریاست کے موضوع پر چند بہترین کتابوں میں شامل ہے سبط صاحب کے مطالعے میں رہی اور انہوں نے اپنی تصنیف میں اس سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا۔

ایرانی انقلاب ہمارے عہد کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ ہے اس انقلاب کے نتیجے میں دور حاضر

کی ایک انتہائی منظم استبدادی حکومت کے تارو پود بکھر گئے اور وہ بظاہر چشم زدن میں معزول ہوگئی انقلاب کے دوران ایرانی عوام کا اتحاد ان کی بے مثال قربانیاں اور جوش و ولولہ اپنی جگہ ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے جس نے انقلابی عمل کو مہمیز کیا البتہ ایرانی انقلاب کی تحدیدات (Limitations) بھی تھیں جن سے صرف نظر کر کے اس انقلاب کے حقیقی تشخص کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ان تحدیدات کو نظر سے محو کرنے کے نتیجے میں بعض حضرات نے ایرانی انقلاب کے بارے میں ایسی رائے قائم کی جو کچھ زیادہ ہی حسن ظن کی حامل تھی۔

معروف مستشرق پروفیسر برنارڈ لوئیس نے اپنے ایک مقالے[۱۲] میں ایرانی انقلاب کی بابت یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ اسی طرح معتبر و مستند اور حقیقی انقلاب ہے جس طرح انقلاب فرانس یا انقلاب روس تھے۔ ایک مستند انقلاب کس کو کہتے ہیں اور غیر مستند انقلاب کیا ہوتا ہے ان کی تشریح وہ نہیں کرتے البتہ انقلاب ایران اور فرانس اور روس کے انقلابات کی جو مماثلتیں انہوں نے گنوائی ہیں ان سے ان کے حقیقی انقلاب کے تصور کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے۔ لوئیس کے خیال میں ایران میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ایسی تبدیلیاں جو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں آئے دن کے انقلابات کے نتیجے میں بالعموم دیکھنے میں نہیں آتیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایران میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کی بنیادیں کہیں زیادہ گہری ہیں یہاں حقیقتاً حکمران چہروں میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ پورا سماجی نظام نئے قالب میں ڈھل گیا ہے یہ سماجی تبدیلی انتقال اقتدار کے واقعہ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہ انقلاب ایران اور مذکورہ بالا دو انقلابوں میں چند اور مشترک اقدار بھی تلاش کرتے ہیں مثلاً انقلاب سے قبل ان ملکوں میں سماجی تبدیلیوں کے عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان تبدیلیوں نے معاشرے میں شدید کھنچاؤ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ روایتی طبقے ان تبدیلیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے لہٰذا عوامی سطح پر ان تبدیلیوں کی مزاحمت کا رجحان زور پکڑتا چلا گیا اور یوں انقلاب واقع ہوئے۔ ایک اور قدر مشترک جس کی نشاندہی فاضل پروفیسر نے کی ہے وہ بعد از انقلاب کے اقتصادی، جنگی، سیاسی اور داخلی کشمکش کے مسائل ہیں جن سے ان ملکوں کو سابقہ پیش آیا۔

انقلاب کا یہ تصور بڑی حد تک نامکمل ہے۔ اس تصور کے مطابق قبل از انقلاب جدیدیت کی جو کوششیں ایران میں ہوئیں وہ ایک روایتی معاشرے کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ لہٰذا ان

کوششوں پر پیہم اصرار کے ردعمل میں عوام نے بغاوت کر دی۔اس نظریے میں نہ تو اس جدیدیت کی وضاحت ہو پاتی ہے جو ایران میں پہلوی ریاست کے زیر اثر متعارف ہوئی تھی نہ ہی ان دیگر عوامل کا کہیں ذکر آتا ہے جو ریاست اور عوام کے درمیان دوری کا باعث بنے۔ایرانی انقلاب کو فرانس اور روس کے انقلابات کی طرح سماجی انقلاب قرار دینا بھی محل نظر ہے کیوں کہ ایران میں بعض سماجی تبدیلیوں کے باوجود سماجی رشتوں کی نوعیت میں انقلاب نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

سبط صاحب ایران کے انقلاب کے بارے میں زیادہ صاف ذہن رکھتے ہیں۔انقلاب ایران کے بارے میں تجزیہ کا نقطۂ آغاز خود ان کا تصور انقلاب ہے۔ وہ انقلاب کو انسانی معاشرے کے جدلیاتی عمل کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ان کے خیال میں کسی انقلاب کی نوعیت اور اس کے حقیقی کردار کا تعین بھی اس چیز سے ہوتا ہے کہ وہ سماجی رشتوں کی تبدیلی کے ضمن میں کس قدر کامیاب ہوا۔اپنے تصور انقلاب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

'انقلاب انسان کے معاشرتی عمل کا نقطۂ عروج ہے مگر وہ اتفاقاً وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت ایک تحریک، ایک 'پراسس' کی ہوتی ہے اس اثنا میں وقت کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔لینن کے بقول 'زمانہ بیل گاڑی کے بجائے بھاپ کے انجن کی رفتار سے چلنے لگتا ہے' اور صدیوں کی مسافت دنوں میں طے ہو جاتی ہے۔زندگی کے اصول بدلتے ہیں،، سماجی رشتے بدلتے ہیں، طاقت کا توازن بدلتا ہے۔زندگی کی قدریں بدلتی ہیں اور فکر و احساس کے انداز بدلتے ہیں، وہ لوگ جو انقلاب کو معاشرے کے قانون حرکت و تغیر سے الگ کر کے محض زندگی کا ایک حادثہ خیال کرتے ہیں وہ نہ انقلاب کے تاریخی کردار کو سمجھ سکیں گے اور نہ انقلاب کے فلسفے کو'[۴۲]

انقلاب کے تصور کی وضاحت کے بعد ایرانی انقلاب کے بارے میں سبط صاحب کی رائے کو سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔ایرانی انقلاب کی نوعیت اور اس کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

ایرانی انقلاب سوشلسٹ انقلاب نہیں تھا کہ محنت کش طبقہ برسر اقتدار آتا

> اور ریاست کے پرانے ڈھانچے کو توڑ کر نیا ڈھانچہ تیار کرتا جیسے روسی انقلاب میں ہوا یا ایرانی انقلاب فرانس کے ۱۸ اردیں صدی کے انقلاب کی مانند سماجی انقلاب بھی نہ تھا کہ پرانے رشتے بدل جاتے اور نوابوں، جاگیرداروں کی فیوڈل ملوکیت کی جگہ سرمایہ داروں کی بورژوا جمہوریت قائم ہو جاتی ہے۔ ایرانی انقلاب فقط شاہ دشمن اور سامراج دشمن سیاسی انقلاب تھا جس کے رہنماؤں کا مقصد سرمایہ داری نظام کے دائرہ میں رہتے ہوئے بالائی طبقے کے نمائندوں کو اقتدار کا مالک بنانا تھا۔[۴۳]

سبط صاحب انقلاب ایران کے محرکات کا سراغ صرف پہلوی ریاست کے نظام اقتصاد و سیاست میں نہیں لگاتے بلکہ وہ ایرانی تاریخ میں بھی اس کی جڑیں تلاش کرتے ہیں۔ کتاب کا پہلا باب قاچاری دور کے سیاسی و اقتصادی رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں جو مختلف تحریکیں اٹھتی رہیں اور انہوں نے وہاں کے حالات پر جو اثرات مرتب کیے، سبط صاحب ان کا مفصل تذکرہ کرتے ہیں۔ نیز برطانوی استعماری ایران میں مداخلت اور اس کے سامراجی ہتھکنڈوں پر سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں، اسی پس منظر میں انہوں نے بابی تحریک کا ذکر کیا ہے، جسے وہ بیداریٔ مشرق کی ابتدائی شکلوں میں ایک شکل شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس باب کا ایک قابل قدر حصہ وہ ہے جس میں بعض آزادی خواہ ایرانی ادیبوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے 'کبھی ظلم اور ناانصافی کے پرانے قصوں کے حوالے سے، کبھی طنزیہ تمثیلوں کے سہارے، کبھی علامتی اور رمزیہ انداز بیان اختیار کر کے لوگوں کو مسائل حیات پر غور کرنے کی دعوت دی،'[۴۴] اس سلسلے میں وہ صادق چوبک، پروین اعتصامی، نادر نادر پور اور احمد شاملو کی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کے انقلابی طرز فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

قاچاری عہد کے بعد سبط صاحب ایران میں بیداری کی لہر اور 'مشروطہ کی تحریک' کے عنوان سے ایرانی عوام کی بیداری کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ بیداری کے اس طویل عرصے کو وہ چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں (اول) انقلاب فرانس کے اثرات کا زمانہ جو ناصر الدین شاہ کے قتل پر ختم ہوا (دوم) ۱۹۰۳ء سے پہلی جنگ عظیم تک کا عرصہ یعنی مشروطہ کی تحریک کا دور، (سوم)

انقلابِ روس سے کسب فیض کا دور، اور (چہارم) پہلوی دور۔

پہلوی ریاست کے کردار سے بحث کرتے ہوئے وہ اس دور کے ایران کے سماجی حالات بالخصوص صنعت و تجارت کی نوعیت، بیوروکریسی کے مقام، ایرانی بازار کے رجحانات، شراکتی و غیر ملکی سرمائے کی وسعت کو تجزیے کی بنیاد بناتے ہیں۔ ایران میں امریکی عمل دخل، امریکہ کی سیاسی و اقتصادی ریشہ دوانیوں اور سی آئی اے، کی سازشوں کو بھی اس تجزیے میں شامل کیا گیا ہے کیوں کہ پہلوی ریاست کے کردار کو متعین کرنے میں ان کا غیر معمولی کردار تھا۔ نیز وہ فوج اور ساواک کے اداروں کو بھی خاطر خواہ اہمیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔

پہلوی ریاست کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں سیاسی جماعتوں کی روایت بہت کمزور رہی۔ چنانچہ 'سرفروشوں کا ایک انبوہ ضرور تھا اور مقامی رہنما بھی تھے مگر ترکی، مصر، ہندوستان یا انڈونیشیا کی مانند ایران میں ایسی شخصیتیں نہیں ابھریں جو قومی تحریک کی علامت سمجھی جاتیں'[۴۵]
ایران میں سیاسی جماعتوں کی روایت کی عدم موجودگی میں وہاں کی سوشلسٹ تحریک کا مطالعہ بڑا اہم قرار پاتا ہے۔ سبط صاحب نے اس موضوع پر ایک علیحدہ باب رقم کیا ہے جس میں روس کے انقلاب اکتوبر کے بعد سے سوشلسٹ تحریک کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

انقلاب کے بعد ایران میں جو رجحانات پروان چڑھے، سبط صاحب ان کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایران کا انقلاب عوام کی توقعات پر پورا نہیں اترا اور یہ معاشرہ میں کوئی بنیادی تبدیلی لانے میں ناکام رہا۔ انقلاب کے قائدین کا کردار ہی اس کی راہ میں مانع ہوا جو ایک مرتبہ پھر شخصی آمریت کو پروان چڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

غرض 'انقلاب ایران' اپنے موضوع پر ایک معروضی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، گو اس کتاب کو شائع ہوئے چھ سات سال ہو رہے ہیں مگر اس میں پیش کردہ خیالات کی تازگی ہنوز باقی ہے بلکہ سبط صاحب نے ایرانی علمائے کرام کی روش کے پیش نظر جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس عرصے میں درست ثابت ہوئے ہیں'[۴۶]

'انقلاب ایران' کے کوئی دو برس بعد سبط صاحب کی اگلی کتاب 'نوید فکر' منظر پر آئی۔ یہ کتاب ان کے برسوں کے مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ قرار دی جا سکتی ہے، گو کتاب متفرق موضوعات پر ان کے مضامین پر مشتمل ہے مگر ان سب میں ایک نوع کی فکری ہم آہنگی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

بنیادی طور پر کتاب کا موضوع ریاست اور مذہب کا تعلق ہے اور مباحث کا پس منظر پاکستان کے حالات سے فراہم ہوتا ہے۔ پاکستان میں آزادی کے بعد ہی سے ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ایک نظریاتی کشمکش موجود رہی ہے۔ قومی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو اس کشمکش میں مختلف نقطہ ہائے نظر کارفرما رہے ہیں مگر بنیادی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرزِ فکر جس کے وکلاء علماء کرام، بیشتر مذہبی گروہ، نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں، مذہبی پریشر گروپ اور بعض ایسے دانشور جو بظاہر جماعتی وابستگیوں سے آزاد ہیں، پیش پیش رہے ہیں۔ اس طرزِ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد ایک خالص مذہبی ریاست کو عالم وجود میں لانا تھا۔ تحریک پاکستان ایک مذہبی مشن کا حصہ تھی جس کا منتہا دنیا میں غلبۂ اسلام کی منزل تھا، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے یعنی یہ سیاست، معیشت، تعلیم غرض جملہ شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں باقاعدہ نظام فراہم کرتا ہے۔ جہاں تک ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کا تعلق ہے اس نقطۂ نظر کی رو سے حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ذات میں مرتکز ہے۔ ریاست میں آئین سازی و قانون سازی کے منابع قرآن اور سنت ہیں اور ان کی تشریح و انطباق کی بہترین صلاحیت علماء کرام اور مذہبی پیشواؤں ہی میں ہو سکتی ہے چنانچہ ہر چند کہ ملک میں ایک منتخب مجلس قانون ساز موجود ہو سکتی ہے مگر اس کی ہوئی قانون سازی پر مذہبی علماء کو حق استرداد یا ویٹو کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ حکومت کے مختلف اداروں مثلاً انتظامیہ اور عدلیہ کو بھی قرآن و سنت کی روشنی میں متشکل کرنا چاہیے۔ اس کی مختلف شکلیں بھی بیان کی جاتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں مذکورہ حلقوں کا رجحان زیادہ تر اسلامی تاریخ کے نظائر کو قانون سازی کی بنیاد بنانے کی طرف رہا ہے۔ طرز حکومت کے ضمن میں بھی اس نقطۂ نظر کے حاملین کی اکثریت صدارتی نظام کے حق میں رہی ہے۔ طریقۂ انتخابات کے بارے میں مخلوط کے بجائے جداگانہ طرزِ انتخاب کو صحیح قرار دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ فکر کے متوازی جو دوسرا طرزِ فکر موجود رہا ہے اس کی رو سے تحریک پاکستان کا مقصد ایک جدید جمہوری ریاست کا قیام تھا جس میں مسلمانوں کو اس اقتصادی و سیاسی استحصال کا احتمال نہیں تھا جس کا اندیشہ متحدہ ہندوستان کے اندر بوجوہ ان کو لاحق تھا۔ پاکستان کا جو تصور بانی پاکستان کے ذہن میں تھا وہ بھی ایک جدید جمہوری ریاست کا تھا۔ آزادی سے قبل قائداعظم نے بارہا تھیوکریسی کی مذمت کی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایسا کہتے وقت ان کا اشارہ یورپ کی پاپائیت کی

طرف تھا کیوں کہ وہ بہر حال مجوزہ پاکستان ہی کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے اور اس ملک میں تھیوکریسی سے مراد ایک ایسی ریاست ہی ہو سکتی تھی جس پر مسلمان علماء کو تصرف حاصل ہوتا۔ قائداعظم ہی کی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر ان حلقوں کے نزدیک پاکستان کے سیاسی نظام کے بارے میں ان کی سوچ کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ اس تقریر میں قائداعظم نے واضح الفاظ میں ریاست پاکستان میں مذہب کے مقام و منصب کی تشریح کر دی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا:

'ہم کو اسی جذبے کے تحت مل کر کام کرنا چاہیے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اکثریتی فرقے اور اقلیتی فرقے کے زاویوں کا فرق مٹ جائے گا کیونکہ مسلمانوں میں پٹھان ہیں، پنجابی ہیں، شیعہ ہیں، سنی ہیں اور ہندوؤں میں برہمن، وشنو اور کھتری ہیں اور پھر بنگالی اور مدراسی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ ہندوستان کے حصول آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی فرق رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کب کے آزاد ہو چکے ہوتے۔ لہٰذا ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اب آپ کسی مذہب، کسی ذات، کسی عقیدے کے بھی ہوں، امورِ ریاست کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کچھ مدت پہلے انگلستان کے حالات ہندوستان کے موجودہ حالات سے بھی کہیں بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے رہتے تھے۔ آج بھی بعض ملک ایسے ہیں جن میں بعض طبقوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ ہوتا ہے اور پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس عہد میں کام نہیں شروع کر رہے ہیں۔ ہم ایسے عہد میں کام شروع کر رہے ہیں جب ایک فرقے اور دوسرے فرقے کے درمیان کوئی فرق، کوئی امتیازی سلوک نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں۔ اور ایک واحد ریاست کے مساوی شہری ہیں۔ انگلستان کے لوگوں کو زندگی کی حقیقتوں سے سابقہ پڑا تھا اور حکومت نے ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی تھیں ان کو پورا کرنا تھا اور وہ اس آگ میں سے قدم بہ

قدم گزرے۔ آج آپ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ (وہاں) رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کا وجود نہیں ہے۔ جو موجود ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص ایک شہری ہے اور برطانیہ عظمیٰ کا مساوی شہری ہے اور وہ سب اپنی قوم کے رکن ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم سب کو یہی نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں، کیونکہ وہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنی میں، بہ حیثیت ریاست کے شہریوں کے۔"[۱۲]

جہاں تک اقتدار اعلیٰ کا تعلق ہے اس مکتبۂ فکر کا نقطۂ نظر یہ رہا کہ ایک جمہوری ریاست میں عوام ہی کو حاکمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے اور وہی اپنے منتخب ارکان کے ذریعے اس کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تھیوکریسی میں جو اختیار مذہبی پیشواؤں کے پاس ہوتا ہے جمہوریت میں اس پر عوام کو تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔ مذکورہ حلقے اسلامی تاریخ کے نظائر کو قانون سازی کی بنیاد بنانے پر بھی آمادہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے خیال میں سماجی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی ماضی کے نظائر از کار رفتہ ہوتے جاتے ہیں۔ البتہ ہر نئے دور میں قانون سازی کے وقت ماضی کے قوانین کے اندر موجود روح کو پیش نظر رکھنا سود مند ہو سکتا ہے۔ طرز حکومت کے باب میں ان حلقوں کا غالب رجحان پارلیمانی جمہوریت کی طرف رہا ہے، کیونکہ یہ پاکستان کے معروضی سیاسی حالات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ طریقہ انتخاب کے ضمن میں ان کی رائے جداگانہ طریقہ انتخاب کے بجائے مخلوط طریقۂ انتخاب کے حق میں ہے کیونکہ یہ طریقہ جدید ریاستوں کے مزاج کے عین مطابق ہے جن میں ریاستی باشندوں کو از روئے آئین مساوی حیثیت اور یکساں حقوق شہریت حاصل ہوتے ہیں۔

کسی ملک کی نظریاتی کشمکش محض چند متحارب دانشور حلقوں کی فلسفیانہ موشگافیوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ یہ فی الواقعی اس ملک کے معروضی حالات، اس کے ریاستی ڈھانچے اور اس ڈھانچے کی بنیادوں میں کارفرما اقتصادی نظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پاکستان کی نظریاتی کشمکش کو اس کے مادی

عوامل کے تناظر میں دیکھیں تو بعض فکر انگیز حقائق سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کا ریاستی ڈھانچہ جن خطوط پر استوار ہوا ہے وہ اس کو ایک ایسی جدید نوآبادی ریاست کا تشخص فراہم کرتے ہیں، جس میں داخلی سطح پر فیوڈل اور سرمایہ دار طبقات نے سول اور فوجی افسر شاہی کی مدد سے عنانِ اقتدار سنبھالے رکھی ہے۔ یہ ریاستی ڈھانچہ ملک کے سوادِ اعظم کے مفادات کی تکمیل کے بجائے ان کے استحصال پر اپنی بنیاد رکھتا ہے، فطری طور پر اس کی مزاحمت ہوتی ہے جس کا توڑ ریاستی اداروں کے جبر کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ ریاستی جبر ملک کے قیام کے بعد سے روز افزوں رہا ہے۔ البتہ گزشتہ چالیس برسوں میں مذکورہ ریاستی ڈھانچے کے تضادات میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔
اگرچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ریاستی اداروں نے اور حکمران طبقات نے اپنے استحکام اور تسلسل کی خاطر مذہب کے نعرے کو استعمال کرنے کی بہت زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور 'اسلامی ریاست' کی تشکیل کا خواب محض چند مذہبی جماعتوں تک محدود تھا تاہم جوں جوں ریاستی ڈھانچے کے تضادات بڑھتے گئے حاکم طبقات میں مذہب کے نعرے کو استعمال کرنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اواخر میں 'اسلامی ریاست' کی تشکیل خود ان طبقات کا فرض منصبی قرار پایا۔ انہیں اس نئی ذمہ داری کو سنبھالنے کا ایک فائدہ یہ پہنچا کہ خود علماء کرام، مذہبی جماعتوں اور پریشر گروپوں میں سے انہیں معتدبہ تعداد میں ایسے حلیف میسر آگئے جنہوں نے نہ صرف ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کی تائید کی بلکہ اس کو مشیت الٰہی اور رحمتِ خداوندی قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے جمہوریت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کے لیے اسلام کی نت نئی تاویلیں پیش کیں۔ اس ضمن میں بیسیوں بیانات پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اس رجحان کی وضاحت کے نقطۂ نظر سے صرف ایک عالم دین کے خیالات ہی کافی ہوں گے۔ یہ بزرگ مولانا محمد مالک کاندھلوی ہیں جو مذہبی حلقوں میں بڑے محترم مقام کے حامل ہیں اور ماضی میں مارشل لاء حکومت کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے اہم رکن رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ کسی موجود اقتدار کو ہٹانے کی کوشش غیر اسلامی حرکت ہے۔ ان کے خیال میں 'موجود اقتدار کا مقابلہ کرنا ملک کی تخریب کے مترادف ہوتا ہے لہٰذا بجائے اس کے کہ سیاسی جماعتیں کسی اقتدار کے مقابلے کے لیے کوشش کریں اس سے بہتر یہ ہے کہ ملک میں جو اصلاحات ہیں اس کے نفاذ کے لیے وہ تعاون اور کوشش کریں۔' کیونکہ ان دنوں 'عام

حلقوں میں مذہب سے اور دین سے وابستگی وہ نہیں پائی جارہی ہے۔ اس حالت میں ایک ایسے شخص کو ہم یہ تصور کریں کہ کوئی دوسرا شخص آئے جب کہ ہمیں اس کے بارے میں یہ امید نہیں ہوسکتی کہ وہ کون ہوگا یا اس کے اندر ایمانی جذبہ ہوگا تو کبھی بھی میں اس کی حمایت نہیں کرسکتا (کہ) بکریوں کا چرواہا جو ہے گلے کو چھوڑ کر چلا جائے۔' مولانا صاحب صرف قوم کو بکریوں کا گلہ اور حاکم وقت کو چرواہا ہی تصور نہیں کرتے بلکہ مارشل لاء کو بھی عین شرعی چیز کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی تاریخ کا پہلا مارشل لاء حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نافذ کیا تھا:

> 'اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مارشل لاء اسی چیز کے لیے لایا جاتا ہے جب ایسی حالت ملک میں واقع ہو رہی ہو کہ جس سے ملک کی بقا اور سالمیت خطرے میں پڑ رہی ہو تو یقیناً ان حالات کو دور کرنے کے لیے اور ان عناصر کی سرکوبی کے لیے مارشل لاء ضروری ہے اور اس پر کوئی اعتراض عقلاً اور شرعاً درست نہیں ہوگا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں اس نہج کی بات پیش آئی ہے اس کہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی ایک مارشل لاء ہی تھا۔ اور پہلا مارشل لاء تھا جس وقت کہ زکوٰۃ کا انکار کرنے والوں نے زکوٰۃ کا انکار کیا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے اوپر فوج روانہ فرمائی تو معلوم ہوا کہ فوجی قوت کے ساتھ ان کی سرکوبی کی گئی ان کو اسلام کے خلاف بغاوت سے روکا گیا اسلام کے خلاف بغاوت ملک کی بغاوت تھی تو اس سے بہتر مثال تاریخ میں نہیں ہوسکتی۔'[۴۸]

ملک کا یہی نظریاتی بحران ہے جس کے پس منظر میں سبط صاحب نے 'نوید فکر' تحریر کی۔ ہمارے یہاں نظریاتی ادب کا بڑا حصہ ایسی تحریروں پر مشتمل ہے جن میں معروضی تجزیہ نگاری کا شدید فقدان پایا جاتا ہے۔ ان میں مسائل کو سائنٹفک انداز میں پرکھنے اور تاریخ اور دیگر سماجی علوم کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی جہت بھی اکثر بہت کمزور ہوتی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہ رجحان تمام طبقہ ہائے فکر کی تحریروں میں مختلف درجوں میں جگہ پاتا ہے۔ ایسی تحریروں میں، لکھنے والا اپنے معتقدات کو درست ثابت کرنے کے لیے اپنا سارا زور بیان صرف کرتا ہے۔ کہیں منطق سے سہارا لینا پڑا تو اس کا سہارا لے لیا، کہیں دلکش فقرے بازی سے کام نکلتا نظر آیا تو فقرے

بازی کرلی، اگر مخالف فکر میں کوئی قابل گرفت چیز نظر نہیں آئی تو اس کے علمبرداروں کی ذاتی کمزوریوں کو موضوع بحث بنالیا۔ جہاں سیاسی نعروں سے تقویت ملی وہاں نعرے لگائے۔ اس قسم کے سطحی ادب کی خامی یہ ہے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہوتے جو مخالف نقطہ نظر رکھتے ہیں یا جو ہنوز کسی ادب تک نہیں پہنچے ہوتے بلکہ اس ادب کے مخاطب وہی عناصر بن پاتے ہیں جو پہلے سے اس نقطۂ نظر کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ایسی ہی صورت ہے جیسے کسی سیاسی جلسے میں کوئی رہنما ایسی تقریر میں مصروف ہو جس کا مقصد صرف اپنے سیاسی کارکنوں کو مزید پرجوش بنانا اوران سے مزید واہ واہ کرانا ہو۔ سبط صاحب کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی سطحی انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ وہ جسٹس محمد منیر کی طرح سیکولرازم کے حامی اور بہت سے علماء کرام کی ژولیدگیٔ فکر کے ناقد ہیں مگر ان کا طرز نگارش جسٹس منیر سے مختلف ہے جو علماء کرام پر طنز اوران کے تضادات اور جدید عصری حقائق سے ناواقفیت پر ان کا مذاق اڑا کر آگے بڑھ جاتے ہیں[۴۹] سبط صاحب مخالف فکر کا بھی اس کے سماجی پس منظر ہی میں محاکمہ کرتے ہیں۔ ان کا رویہ تفحیک کے بجائے تنقید کا رویہ ہے۔

اس تنقیدی رویے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں قارئین کو پرشکوہ مگر فکر سے عاری لفاظی کے ذریعے مرعوب کرنے کا رجحان بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے ہم خیال قارئین کو بھی فکر مزید کی دعوت دیتے ہیں اور خود بھی ان کے لیے دانش وحکمت کے نئے نئے گوشے اجاگر کرتے جاتے ہیں۔ یوں ان کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جو غور وفکر پر آمادہ اور تہذیبی مسائل کی سائنسی تفہیم کا آرزو مند ہو۔

سبط صاحب اپنے استدلال کی بنیاد تاریخ اور سماجی ارتقا کے قوانین پر استوار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر عہد کا نظام اقدار (value system) اس عہد کے معروضی حالات، اقتصادی رشتوں اور سماجی ماحول سے متعین ہوتا ہے لہٰذا نہ تو ہم عصر نظام اقدار کی روشنی میں ماضی کے نظاموں کو ہدف ملامت بنایا جاسکتا ہے اور نہ ہی ماضی کی از کار رفتہ اقدار کی آج کے یکسر مختلف سماجی ماحول میں بازیافت ممکن ہے۔ صحیح تاریخی شعور کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ کسی بھی عہد کی متحرک ومتحارب قوتوں میں کس قوت کا مفاد ومقصد مروجہ نظام کی بقا میں تھا اور کونسی قوتیں اس نظام کی تبدیلی کی نقیب تھیں، ان قوتوں کے تضاد کی نوعیت کیا تھی اور تصادم کی شدت کس درجے

میں تھی۔ خود انسانی اداروں، خواہ وہ ریاست کا ادارہ ہو یا کوئی اور سماجی ادارہ، کے باب میں بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لہٰذا کسی عہد کی ریاست کے خدوخال کو اس کے معاشرتی تناظر سے جدا کر کے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ریاست کی جتنی شکلیں ابتداء سے اب تک وجود میں آئی ہیں وہ اپنے زمانے کے حالات کا نتیجہ تھیں۔ آج کی ریاست کی شخصیت و کردار بھی آج کے معاشرتی حالات سے متعین ہوتا ہے نہ کہ ماضی کے معاشرتی حالات سے۔ ماضی کے ریاستی نظام آج کے انسان کے لیے از کار رفتہ اور غیر متعلق و بے محل ہیں خواہ اپنے زمانے میں ان کا کردار کتنا ہی مناسب کیوں نہ رہا ہو۔ سبط صاحب تھیوکریسی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابتدائی ریاستیں تھیوکریسی ہی کی شکل تھیں۔ ابتدائی ریاستوں کے اس مذہبی تشخص کے ساتھ ظہور میں آنے کی 'وجہ یہ تھی کہ بڑی بڑی عبادت گاہیں اپنے گردونواح کی سب سے بااثر اور دولت مند طاقت ہوتی تھیں۔ عبادت گاہ میں جس دیوی دیوتا کی پوجا ہوتی تھی بستی اسی کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھی بلکہ اسی دیوتا کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔'[۵۰]

پھر جب ان ریاستوں نے شہری ریاستوں کی شکل اختیار کی تو ان ریاستوں کے 'سربراہ معبدوں کے مہا پروہت ہوتے تھے جو زمین پر آسمانی دیوتاؤں کے نمائندے خیال کیے جاتے تھے اور جن کے احکام دیوتاؤں کے احکام کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ مذہبی پیشوا بھی تھا اور حاکم اعلیٰ بھی۔ وہ قوانین بناتا تھا اور ان کو اپنے خدا سے منسوب کر دیتا تھا۔ نظم و نسق کا نگراں بھی وہی تھا۔'[۵۱] مگر پروہتوں کے اقتدار کا سورج زیادہ عرصے تک باقی نہ رہ سکا اور اس کو بادشاہت کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ بادشاہت کے آغاز کا سبب یہ تھا کہ تھیوکریسی کے زمانے میں جب کبھی جنگ ہوتی تو 'پروہتوں کو عسکری اختیارات سالار لشکر کے سپرد کرنے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ تجربے سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تقسیم کار کے بغیر ریاست کا نظم و نسق درست نہیں رہ سکتا۔ بادشاہتوں کا ظہور دراصل اسی مسئلہ کا حل تھا۔ چنانچہ فوج کے سالاروں نے جن کو اختیارات عارضی طور پر سونپے جاتے تھے، اپنی طاقت اور شہرت کے بل پر ان اختیارات کو مستقل کر لیا اور بادشاہ بن گئے۔ ریاست کی حاکمیت بادشاہوں کا حق قرار پائی اور مذہب ریاست کے تابع ہو گیا۔'[۵۲] البتہ بادشاہوں نے پروہتوں کے اثر ورسوخ کو بعض شعبوں میں جاری رہنے کا موقع دیا۔ مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات بھی انہیں کو تفویض کیے، مذہبی عبادت گاہوں کو بھی تحفظ فراہم کیا۔ چنانچہ پروہتوں

نے بادشاہوں کو خدا، خدا کا اوتار، خدا کا نائب قرار دے دیا۔ سبط صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی شخصیت کے گرد تقدس کا جو ہالہ ان پروہتوں نے چھ ہزار برس پہلے کھینچا تھا ملوکیت کے زوال تک مشرق اور مغرب میں تھوڑے تھوڑے فرق سے ہر جگہ بدستور قائم رہا۔[۵۲]

پروہتوں سے ملوکیتوں کو اقتدار کی منتقلی ریاست کے بالائی ڈھانچے میں تبدیلی کے مترادف تھی، البتہ ریاست کا بنیادی کردار اس سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ پرانا قتصادی ڈھانچہ ملوکیتوں میں بھی جاری رہا۔ اس میں صرف یہ فرق واقع ہوا کہ پہلے زمین کی ملکیت عبادت گاہوں اور ان کے پروہتوں کے پاس ہوتی تھی ملوکیت میں یہ بادشاہوں، سلطنتوں اور امراء کا حق قرار پائی۔ البتہ آلات پیداوار اور پیداواری رشتے جوں کے توں رہے۔ ملوکیتوں کا ریاستی نظریہ بھی ہنوز تھیوکریسی ہی رہا۔

ملوکیت میں اصل مقتدر بادشاہ ہوتا تھا اور مذہب ریاست کے تابع تھا۔ ریاست کی مصلحتیں احکام شرعی پر فوقیت رکھتی تھیں۔ سبط صاحب کے الفاظ میں 'شرع احکام اگر سیاسی مصلحتوں سے ہم آہنگ ہوتے تو ان سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا مگر ریاست کی بنیادی حکمت عملی اور شرعی احکام میں اگر تصادم کی صورت پیدا ہوتی تو تنخواہ دار پادریوں، پنڈتوں اور مفتیوں سے ریاست کے حق میں فیصلے حاصل کرا لیے جاتے تھے اور شرعی احکام کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔'[۵۳]

سبط صاحب کا کہنا ہے کہ پروہت راج کے خاتمے کے بعد مذہبی پیشوا مشرقی ممالک میں تو کبھی سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہوئے البتہ مغرب میں مسیحی کلیسا نے سیاسی طاقت اور قوت کا بار ہا مظاہرہ کیا۔ رومن کلیسا تو اپنی جگہ ایک بڑی دولت مند اور جاگیردار قوت تھا۔ کلیسائے روم کی بادشاہتوں سے ٹکر بھی ہوتی رہی۔ کلیسا کا غیر معمولی اقتدار و اختیار کوئی ایک ہزار برس تک یورپ میں جاری رہا۔ یہی یورپ کا عہد تاریک کہلاتا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ہی سرمایہ دار طبقے کی پیدائش ہوئی جو فیوڈلزم کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس نئے طبقے کے احیاء کے ساتھ ہی فیوڈل ازم سے مربوط کلیسا کے وقار کو بھی سخت دھچکا لگا۔ جوں جوں سرمایہ دار جمہوریتیں قائم ہوتی گئیں اور اس کے ساتھ ہی سائنسی علوم، جمہوریت و بلدیاتی حقوق کے تصورات کو مقبولیت حاصل ہوئی کلیسا کا طلسم ٹوٹتا چلا گیا۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کے زیر اثر طرز حکومت میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ برطانیہ میں بادشاہ کے الوہی استحقاق کو پارلیمنٹ نے جو نئی قوتوں کی نمائندہ تھی تسلیم

کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نزاع نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کی۔ آخر کار بادشاہ چارلس اول (۱۶۲۵ء۔۱۶۴۹ء) کو شکست ہوئی، اس کا سر قلم کر دیا گیا اور برطانیہ ری پبلک قرار پایا۔ ہر چند برطانیہ میں آج بھی بادشاہت کا ادارہ موجود ہے مگر الوہی استحقاق کا تصور شاہ چارلس اول کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔'[۵۵]

تھیوکریسی کے آغاز و انجام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد سبط صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

'تھیوکریسی کوئی ابدی اور مقدس نظریۂ ریاست نہیں ہے بلکہ معاشرتی ارتقا کے ایک مخصوص عہد میں تاریخی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی اور جب یہ ضرورتیں باقی نہ رہیں تو تھیوکریسی کا بھی وہی انجام ہوا جو غلامی کا ہوا۔'[۵۶]

چنانچہ:

'تھیوکریسی کے احیاء کی کوشش ارتقائے انسان کو پیچھے کی طرف لے جانا ہے۔ تھیوکریسی سائنسی علوم اور سائنسی سوچ کی دشمن ہے۔ وہ اجتہاد کے بجائے تقلید اور تحقیق و جستجو کے بجائے منقولات اور روایت پرستی کی تعلیم دیتی ہے۔ تھیوکریسی خوف اور لالچ کی عفریتی قوتوں سے عقل و خرد کا گلا گھونٹنے کے درپے رہتی ہے۔ تھیوکریسی ظلمت پرستوں کا آخری حربہ ہے جو خدا کی حاکیت کی آڑ میں تنگ نظر ملاؤں کا راج قائم کرنا چاہتے ہیں، فیوڈلزم اور فیوڈل قدروں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور عوام کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔'[۵۷]

تاریخ میں تھیوکریسی کے عروج و زوال کے محرکات اور اس کے کردار کے تفصیلی جائزے کے بعد سبط صاحب 'اسلامی ریاست' کے موضوع پر آتے ہیں جو ہمارے یہاں علمائے کرام، بعض سیاستدانوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں کی مرغوب اصطلاح ہی نہیں بلکہ ان کی فکری اور عملی کاوشوں کا محور بھی ہے۔ ان حلقوں کے نزدیک اسلام اور اسلامی ریاست لازم ملزوم ہیں، اسلام جن تعلیمات کا داعی ہے ان کے لیے ریاست ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد ایسی ہی

ریاستوں کا قیام تھا اور یہ کہ آج بھی 'اسلامی ریاست' کا قیام ایک مذہبی فریضہ ہے جو مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اور جس کی تکمیل ہی کے ذریعے مسلمان اپنے موجودہ معاشرتی، معاشی و سیاسی مسائل سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں سو ان کی ساری جدوجہد اسی سمت میں اور اسی مقصد کے حصول میں صرف ہونی چاہیے۔ سبط صاحب نے مذہبی ریاست کے حوالے سے پائے جانے والے مفروضات کی تردید تاریخی حقائق کی روشنی میں کی ہے۔ وہ تاریخ میں اسلامی ریاست کے وجود سے انکار نہیں کرتے البتہ اس ریاست کا مطالعہ وہ تاریخی ذہنیت (Historical Mindedness) کے ساتھ کرتے ہیں جو اس امر کی متقاضی ہے کہ سماجی اداروں یا عقائد و افکار کا تجزیہ ان کے تاریخی پس منظر میں کیا جانا چاہیے۔ سبط صاحب کا خیال ہے کہ اسلام یا کسی بھی مذہب کا اصل مقصد ریاست قائم کرنا نہیں۔ قرآن بھی کسی مخصوص ریاستی نظام کا خاکہ پیش نہیں کرتا۔ نہ ہی قرآن میں کسی مربوط سیاسی نظام کی تفصیل بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> 'خدا کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ریاست کا نظام شاہانہ ہے، آمرانہ ہے، جمہوری ہے یا اشتراکی۔ قرآن میں بادشاہتوں کے تذکرے ہیں مگر ریاست جیسے اہم مسئلہ پر قرآن بالکل خاموش ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نمرود کی مطلق العنان بادشاہت پر معترض نہیں ہوتے بلکہ اس کے دعوائے خدائی سے انکار کرتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ فرعون کی ملازمت کو برا نہیں سمجھتے، حضرت موسیٰ فرعون کی طرز حکومت کی مخالفت نہیں کرتے البتہ اس کے دعوائے ربوبیت کو رد کرتے ہوئے خدائے واحد کی ربوبیت کا اعلان کرتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ تو نبی بھی ہیں اور بادشاہ بھی۔ پس معلوم ہوا کہ خدا نے انسان کو اس بات کی مکمل آزادی دے دی ہے کہ وہ جس طرز کی ریاست یا حکومت چاہے قائم کرے۔'[۵۸]

مذہب کا بنیادی مقصد معاشرہ سازی ہے نہ کہ ریاست سازی، چنانچہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام میں سے محض چند ایک ہی ایسے تھے جنہوں نے سیاسی اقتدار یا تشکیل ریاست کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ پھر جن انبیاء نے سیاسی اقتدار کو بھی برتا ان سب کا طرز حکمرانی بھی یکساں نہیں تھا۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ بادشاہ تھے مگر نبی اکرمؐ نے بادشاہت کو رائج نہیں کیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ

کرنا غلط نہ ہوگا کہ مذہب کا بنیادی مقصد انسانی معاشرت کی اصلاح ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے عمل میں خود ریاست کا مذہبی اثرات سے متاثر ہونا عین فطری بات ہے مگر مذہب ریاست کو معاشرہ سے برتر حقیقت کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو مذہب اور ریاست کو لازم ملزوم تصور کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بیشتر انبیائے کرام نے نہ تو کوئی ریاست قائم کی اور نہ ہی کبھی اس کے لیے جدوجہد کی خود نبی اکرمؐ نے بھی نبوت کے ساتھ ہی ریاست کے قیام کا اعلان نہیں کردیا تھا۔ نہ ہی مکی دور میں آپؐ نے اس کے لیے کوشش کی۔ ریاست کی تشکیل ہجرت کے بعد مدینہ میں وہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر کی گئی۔ اس ضمن میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے ریاست کا قیام انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کے صدیوں بعد عمل میں آیا جب کہ انبیاء کرام کی بعثت اس سے قبل بھی جاری رہی۔ تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں بیسیوں ایسے ممالک ہیں جہاں اسلامی مذہبی اقلیتیں موجود ہیں۔ یہ اقلیتیں اپنا جداگانہ معاشرتی تشخص تو رکھتی ہیں مگر ان کی کوئی ریاست نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل میں بظاہر اس کے کوئی امکانات نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر مذہب کا مقصود ریاست سازی نہیں ہے تو پھر چند انبیاء نے اس امر کی جانب توجہ کیوں کی اور اپنے زمانے میں سیاسی اقتدار کیوں حاصل کیا۔ مدنی ریاست کے حوالے سے اس سوال کا جواب سبط صاحب یوں دیتے ہیں:

> 'سرزمین حجاز میں ریاست کا ظہور وہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلیوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ مدنی ریاست رفتہ رفتہ انہی تاریخی عوامل کے بروئے کار آنے سے وجود میں آئی جن کے باعث بعض اوقات چھوٹی بستیاں شہروں میں اور شہر، شہری ریاستوں میں تبدیل ہوگئے۔ یہ تبدیلیاں کسی فرد واحد کی خواہشوں یا کوششوں کی مرہون منت نہ تھیں بلکہ معاشرتی حالات ان کا سبب تھے۔ آنحضرتؐ کبھی نہ ریاست قائم کرنے کے آرزو مند ہوئے، نہ انہوں نے ریاست قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور نہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کی البتہ مدینے کے حالات ہجرت نبوی کے بعد ایسی صورت اختیار کرتے چلے گئے کہ ریاست کا قیام

ناگزیر ہوگیا۔'[59]

تشکیل وانتظام ریاست کے ضمن میں انبیائے کرام کے کارہائے نمایاں ان کے منصبی فرائض کا حصہ نہ تھے بلکہ یہ اس زمانے کے ان مخصوص معاشرتی وسیاسی حالات کا نتیجہ تھے جن سے انبیاء کو عہدبرآ ہونا پڑا۔ سبط صاحب نے مدنی ریاست کے بارے میں جو بنیادی نکات پیش کیے ہیں ان کی تائید مسلمانوں کی علمی وفکری روایت کے بعض اہم مفکروں کے افکار سے بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جن کی نکتہ سنجیوں کو مولانا شبلی نعمانی نے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارناموں سے کہیں زیادہ اہم اور وقیع قرار دیا ہے، خود احادیث نبوی اور آپؐ کی سنت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ احادیث وسنن جو منصب رسالت کا حصہ ہیں اور دوسری وہ جو اس وقت کے مخصوص حالات اور ضروریات کی پیداوار تھیں۔ سنت کی اس دوگونہ نوعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'حجۃ اللہ البالغہ' میں لکھتے ہیں:

> 'پہلی قسم ان حدیثوں کی وہ ہے جن کی نوعیت تبلیغ رسالت کی ہے۔ من جملہ ان کے وہ حدیثیں ہیں جن میں عالم معاد کے واقعات وکوائف اور عالم ملکوت کے عجائبات کا ذکر ہے۔ ان کی بنا وحی پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کا مآخذ اور منبع خود نبی اکرم ﷺ کا اجتہاد نہیں ہوسکتا، اور من جملہ ان کے وہ حدیثیں ہیں جن میں احکام وشرائع کا بیان ہے، عبادت کے ارکان وآداب وغیرہ کی توضیح ہے۔ ارتفاقات کی تشریح اور ان کی پابندی کی ترغیب وتحریص ہے۔ حدیثوں کی دوسری قسم وہ ہے جن کی نوعیت تبلیغ ریاست کی نہیں۔ انہی حدیثوں کے متعلق آپ کا یہ ارشاد ہے کہ 'میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، جب میں دین کی بابت تم سے کچھ کہوں تو اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور جب میں اپنی رائے دوں تو پھر یاد رکھو میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں۔' من جملہ اس قسم کے آپؐ کا وہ قول وعمل ہے جب کہ آپؐ کے پیش نظر کوئی جزوی مصلحت ہوتی۔ اس لیے آپؐ کے اس قول اور عمل کی پابندی امت مسلمہ کے سب افراد پر عائد نہیں ہوتی۔'[60]

شاہ ولی اللہ اس مبحث میں بہت سے ایسے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں رسول اکرمؐ نے خود اپنے احکام کی تنسیخ کی یا صحابۂ کرام نے آپ کے احکامات سے ہٹتے ہوئے کوئی راہِ عمل اختیار کی۔[۷۱]

مولانا الطاف حسین حالی بھی جو سر سیّد احمد خان کی طرح عقلیت کے علمبردار تھے، احادیث و سنن کے اتباع کے ضمن میں شاہ ولی اللہ ہی کی نہج پر سوچتے تھے بلکہ انہوں نے اس موضوع پر زیادہ کھل کر اور بالصراحت اظہارِ خیال کیا۔ اب سے تقریباً ایک صدی قبل کا ان کا مقالہ 'الدین یسر' ان کی مضمون آفرینی اور خرد پسندی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس مضمون میں وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دین کی اصل کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے طرح طرح کے حاشیے چڑھا دیے ہیں۔ یہاں تک کہ متن اور حاشیے کی تمیز کرنا دشوار ہو گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'پہلا حاشیہ جو اس ملت بیضا پر چڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ جو باتیں رسولِ خدا نے محض اصلاح معاش کے لیے تعلیم فرمائی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالحِ دنیوی تھا وہ بھی شریعت میں داخل کی گئیں اور ان کو بھی ضروریات دین سے سمجھا گیا، حالانکہ یہ ایک صریح مغالطہ تھا جس کو خود رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں حل کر دیا تھا۔' اصل یہ ہے کہ جس قوم میں رسول ﷺ مبعوث ہوئے تھے اس کی اندرونی اور بیرونی دونوں حالتیں زمانہ جاہلیت کے امتداد سے معالجے اور اصلاح کی محتاج تھیں، جس طرح ان کے عقائد اور اخلاق بگڑ گئے تھے، اُسی طرح ان کا طریق تمدن اور طرز معاشرت بری حالت میں تھا۔ وہ جیسے مبدأ و معاد سے غافل تھے ویسے ہی کھانے پینے اور پہننے کے آداب سے ناواقف تھے۔ ان کی مجلسیں تہذیب سے معرا تھیں، ان کے معاملات وحشیانہ تھے، ان کا طریق معاش بے ڈھنگا تھا۔
>
> پس اس دینِ ہادی اور دنیا کے رہبر نے جیسا اپنے منصبی فرائض یعنی تبلیغ احکامِ الٰہی کو ضروری سمجھا اور اس کو مبدأ و معاد کی حقیقت سے آگاہ کیا اور

ان کے عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ کی اصلاح فرمائی، اسی طرح رقت نوعی اور قومی ہمدردی کے مقتضا سے ان کے طریق کو بھی درست کیا، ان کی مجلسوں میں تہذیب پھیلائی، لباس اور طعام کے آداب سکھائے، نشست و برخاست کے قاعدے بنائے۔ سلام، مصافحہ، معانقہ، تہنیت، تعزیت، مہمانی، ضیافت بیاہ، شادی، لین دین، سفر، اقامت، کھیتی، تجارت، حفظ صحت، دوا دارو، غرض کہ جملہ امور دنیوی کے اصول تعلیم فرمائے، مگر اسی قدر جتنے کہ اس زمانے اور اس ملک کے مناسب تھے۔

ان دونوں میں سے پہلی تعلیم آپ کا منصبی فرض تھا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ اسی کا نام شریعت رکھا گیا اور اسی کی مخالفت پر ضلالت کا اطلاق کیا گیا۔

دوسری تعلیم، جو کہ معاش سے علاقہ رکھتی تھی، وہ آپ کے منصبی فرائض سے بالکل علیحدہ تھی۔ نہ اس کی تعلیم امت پر فرض کی گئی اور نہ اس کے خلاف عملدرآمد کرنے کی ممانعت ہوئی۔ اور اسی تعلیم کی نسبت آں حضرت نے یہ ارشاد فرمایا: 'انما انا بشر اذا امر تکم بشئ من وینکم نغزوابه دازا امرتکم بشئ من رای تاتما انا بشر.' (ترجمہ! یقیناً میں بھی (تم جیسا) ایک آدمی ہوں۔ جب دینی امور میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی تابعداری کرو اور دنیوی امور میں اپنی رائے سے میں کچھ کہوں تو بے شک میں انسان ہوں۔' (یعنی غلطی بھی کر سکتا ہوں)۔'[۶۲]

شاہ ولی اللہ اور مولانا حالی کے ان رشحات فکر کی روشنی میں نبی اکرمؐ کی مدنی ریاست کے قیام اور اس کے انصرام و انتظام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ ریاست اور اس کا کردار و تشخص اس زمانے کے حالات پر استوار ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد اس ریاست کو چلاتے کے لیے صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ پھر اپنے عہد کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیاسی فیصلے کئے چنانچہ خلفائے راشدین میں سے چاروں

خلفاء کے سریرآرائے خلافت ہونے کا طریقہ کار ایک دوسرے سے جدا تھا۔ اس زمانے میں ریاست وحکومت کے حوالے سے نظریہ سازی نہیں کی گئی جس کا اتباع ہر نسل پر فرض ہوتا۔ وقتی مصالح اور حالات کی نوعیت ہی ریاستی امور کے تعین میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی تھی۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ریاست کے حوالے سے نظریہ سازی کا آغاز بنی عباس کے عہد ملوکیت میں ہوا۔ جب ملوکیت کے پروردہ بعض فقہا نے ملوکیت کو قرآن وسنت کی مدد سے سندیں فراہم کرنا شروع کیں۔ اس دور میں قرآن اور احادیث کی نت نئی تاویلیں گھڑی گئیں اور آیاتِ قرآنی کو ان کی شانِ نزول سے الگ کر کے ان سے اپنے دور کے استبدادی نظام کو جائز قرار دیا جانے لگا۔ سبط صاحب نے 'نوید فکر' میں ایسی ہی ایک قرآنی آیت کا حوالہ دیا ہے جس کا مفہوم فقہاء کے ہاتھوں کیا سے کیا ہوگیا۔ ایسی ہی ایک آیت 'اطیعوا اللّٰہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم' ہے۔ سبط صاحب ابوالحسن علی ابن احمد الواحدی کی تصنیف 'اسباب نزول' کے حوالے سے اس آیت کی شانِ نزول یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلام نے حضرت خالد بن ولید کو ایک عرب قبیلہ کے ساتھ لڑنے کے لیے روانہ کیا عمار بن یاسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ عمار نے ایک عرب کو پناہ دینے کا فیصلہ کیا جو اسی وقت مسلمان ہوا تھا۔ حضرت خالد نے اس کو گرفتار کر لیا۔ اس پر عمار اور حضرت خالد میں اختلاف پیدا ہوا۔ مہم سے واپسی پر یہ اختلاف رسول اکرمؐ کے سامنے زیرِ بحث آیا آپؐ نے عمار کے فیصلے کو حق بجانب قرار دیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ سالار لشکر کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ دینا درست نہیں۔ یہ آیت اسی موقع پر وارد ہوئی [۲۳] مگر بعض فقہاء اور علماء نے اس آیت میں اولی الامر سے یہ مفہوم اخذ کر ڈالا کہ جو بھی حکمران وقت ہو اس کی اطاعت مسلمان عوام پر فرض ہے۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں:

> 'سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے لہٰذا یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ سلطانی اور فرازدی سلطانوں کو خدا نے مرحمت کی ہے لہٰذا ان کی اطاعت کرنی چاہیے ان سے محبت کرنی چاہیے اور ان کا حکم ماننا چاہیے۔ سلاطین سے جھگڑا کرنا درست نہیں اور ان سے نفرت کرنا غلط ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اطیعو اللّٰہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم۔' [۲۴]

مولانا مودودی اس آیت کو اسی مفہوم میں دیکھتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ:

'یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے۔'[۶۵]

ہمارے علمائے سلف نے تفہیم دین کے ضمن میں عبادات اور معاملات کے درمیان جو حد امتیاز قائم کی تھی اس کی مثالیں شاہ ولی اللہ اور مولانا حالی کے حوالے سے اوپر دی جاچکی ہیں۔ جن امور کو شاہ ولی اللہ مصالح دنیوی اور مولانا حالی اصلاح معاش کے دائروں میں رکھتے ہیں اور جن کو مقاصد دین سے جدا تصور کرتے ہیں ان کے ضمن میں ہر عہد میں ایجاد و اختراع کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ ہر دو بزرگ مصالحِ دنیوی اور اصلاح معاش کے امور کو شریعت کے دائرہ کار میں لانے کی مخالفت کرتے ہیں کیوں کہ اس سے اصل دین کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہے۔ اسی رویے کو جدید اصطلاح میں سیکولرازم کہا جاسکتا ہے۔

سیکولرازم سبط صاحب کی فکری کاوشوں میں ایک اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اس موضوع کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ 'ڈان' میں خالد اسحاق ایڈووکیٹ کے ساتھ اس موضوع پر ان کے مباحث کا حوالہ آچکا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں انہوں نے پاکستان میں مذہب و سیاست کی کشمکش کے تناظر میں، سیکولرازم پر اردو میں بھی ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا تھا[۶۶] یہی مقالہ بعدازاں مزید تشریح و توسیع کے ساتھ 'نوید فکر' میں ایک علیحدہ باب کے طور پر شامل کیا گیا۔ ان کی انگریزی تصنیف 'پاکستان میں افکار کی جنگ' تو بیشتر اسی موضوع پر مشتمل ہے۔

پاکستان میں سیکولرازم کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اس کے حقیقی مفہوم کو متعارف کرانے میں جن معدودے چند حضرات نے سنجیدگی سے کام کیا ان میں سبط صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ جو چیز اس باب میں ان کی کاوشوں کو معتبر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سیکولرازم کی حمایت کرتے وقت بھی اپنے تنقیدی طرز فکر کو خیر باد نہیں کہتے۔

ہمارے یہاں بالعموم سیکولرازم کا ترجمہ لادینیت کیا جاتا ہے'نوید فکر' میں سبط صاحب اس موضوع پر آغاز کلام ہی اس نکتے سے کرتے ہیں کہ سیکولرازم کا یہ مفہوم یا تو لاعلمی کا نتیجہ ہے یا جان بوجھ کر لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے کی کوشش کا مظہر ہے۔ وہ سیکولرازم کے حقیقی مفہوم کا انسائیکلوپیڈیا امریکانا کی مدد سے تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'سیکولرازم ایک اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے اور

> الہامی مذہب یا مابعد الطبعیات سے جدا ہے۔ اس کا پہلا کلیہ فکر کی آزادی ہے یعنی ہر شخص کا اپنے لیے کچھ سوچنے کا حق، (۲) تمام فکری امور کے بارے میں اختلافِ رائے کا حق، (۳) تمام بنیادی مسائل مثلاً خدا یا روح کی لافانیت وغیرہ پر بحث مباحثے کا حق۔ سیکولرازم یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ موجودہ زندگی کی خوبیوں کے علاوہ کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ البتہ اس کا مقصد وہ مادی حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان کی محرومیاں اور افلاس ناممکن ہو جائیں۔"[۶۷]

اس تعریف کی روشنی میں وہ جارج ہولی اوک کے حوالے سے سیکولرازم کے مبادیات بیان کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ سائنس انسان کی سچی رہنما ہے، علم وادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے، ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چاہیے، ہم کو اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ سیکولرازم کے ان اصولوں ہی کی بنیاد پر وہ اپنے تجزیے کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ 'سیکولرازم کا مقصد معاشرے کی صحت مند سماجی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنا نہیں ہے بلکہ سیکولرازم ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو خردمندی اور شخصی آزادی کی تعلیم دیتا ہے تقلید و روایت پرستی کے بجائے عقل و علم کی اجتہادی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔[۶۸]

سیکولرازم کی تشریح اور اس کے بنیادی کلیوں کی وضاحت کے بعد سبط صاحب زمانہ قدیم سے عہد جدید تک سیکولر خیالات کے سفر کا جائزہ لیتے ہیں اور انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں سیکولر رجحانات اور ان کے پس پردہ سماجی محرکات کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ مغرب سیکولر خیالات کی ابتدا آئیونیا (مغربی ترکی) میں نیچری فلسفیوں کے زیر اثر ہوئی جو یونانی الاصل تھے اور مظاہر قدرت کی تعبیر عناصر قدرت کے حوالے سے کرتے تھے۔ جب یونان کے زوال کے بعد مغربی سیاست کا مرکز روم منتقل ہوا تو سیکولر خیالات وہاں بھی ظہور میں آتے رہے۔ پہلی صدی عیسوی میں یورپی معاشرہ عیسائی مذہب سے غیر معمولی طور پر متاثر رہا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کا حق خدا کو دیا جائے اور قیصر روم کا حق قیصر روم کو، حضرت عیسیٰؑ کے حقیقی پیرد کاروں کو اس تعلیم کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہ تھا مگر قیصر روم کے لیے مسیحی تعلیمات ناقابل برداشت تھیں۔ چنانچہ عیسائی عوام پر مظالم توڑے گئے۔ پطرس اور پال کو تبلیغ دین کے جرم میں

صلیب دے دی گئی۔ تین سو سال کے اس بیداد کے بعد عبادت کی آزادی میسر آئی اور شہنشاہ قسطنطین نے مذہبی امور میں ریاست کی جانب سے مداخلت نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ مگر جلد ہی صورتحال بالکل الٹ گئی۔ شاہ قسطنطین خود عیسائی ہو گیا اور اس نے غیر مسیحی آبادی کو نشانۂ ستم بنانا شروع کر دیا۔ پرانے رومن دیوتاؤں کی عبادت ممنوع قرار دے دی گئی اور عبادت گاہوں کی جائیدادیں ضبط کر کے کلیسا کے سپرد کر دی گئیں۔ پاپائے روم عیسائیوں کا روحانی پیشوا بن گیا اور کلیسا کے دور اقتدار کا آغاز ہو گیا۔ کلیسا کا یہ اقتدار سلطنتِ روما کے زوال کے بعد بھی جاری رہا بلکہ اب تو اقتدار میں اس کا کوئی شریک بھی نہیں رہا تھا۔ یورپ میں قرون وسطیٰ کا عہد تاریک تمام تر کلیسا کے استبداد سے عبارت ہے۔ اس تاریک عہد میں روشنی کی ابتدائی لکیریں اس وقت اجاگر ہوئیں جب تیرہویں صدی میں سرمایہ داری نظام کی شروعات ہوئیں اور سیکولر افکار نے جڑ پکڑنا شروع کی۔ اس عمل کو عرب مفکروں کے خیالات نے مہمیز کیا چنانچہ الکندی، رازی، بوعلی سینا، ابن الہیثم، خوارزمی، البیرونی اور ابن رشد کے افکار اہل مغرب کے لیے مینارۂ روشنی ثابت ہوئے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی براہ راست زد فیوڈل ازم پر پڑتی تھی اور کلیسا خود سب سے بڑا فیوڈل ادارہ تھا۔ سو معاشرے کے تازہ تر رجحانات سے اس کے اقتدار و وقار کو ضعف پہنچنا عین فطری تھا۔ چودہویں صدی میں یورپ میں قومی ریاستیں قائم ہوئیں تو سیکولر خیالات کو مزید فروغ ملا۔ اٹھارویں صدی تو صنعتی انقلاب کی صدی ثابت ہوئی۔ اس صدی میں یورپ سیاسی انقلابات اور روشن خیالی کا مرکز بن گیا۔ امریکہ کی آزادی اور انقلاب فرانس نے فیوڈل ازم کی رہی سہی باقیات کو بھی تہہ تیغ کر ڈالا۔ اور یوں سیکولر خیالات، سیاسی اداروں اور ملکی دساتیر میں جاگزین ہوئے البتہ سیکولر ازم کے فروغ سے نہ تو لوگ لامذہب ہو گئے اور نہ ہی مذہبی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی گئی۔ بلکہ عوام کو مذہبی آزادیاں از روئے آئین فراہم کی گئیں۔ ریاست نے اپنا دائرہ عمل الگ سے متعین کر لیا۔

- مشرقی ملکوں میں سیکولر خیالات کی نشوونما کس نہج پر ہوئی۔ اس کا جائزہ سبط صاحب نے ترکی ور برصغیر کے حوالے سے لیا ہے۔ برصغیر میں جدید سیکولر خیالات کے احیاء کو وہ انگریزوں کی آمد سے مربوط کرتے ہیں۔ انگریز اثرات کے تحت برصغیر میں سیکولر خیالات کو فروغ ضرور حاصل ہوا مگر خود انگریزی حکومت کی سوچی سمجھی حکمت عملی سیکولر ازم کے خلاف تھی۔ انگریزی استعمار کا اصل

ہدف تو ہندوستان کے باشندوں کو آپس میں لڑانا اور ان کے اختلاف کو وسیع کر کے اپنے لیے استحکام کی راہیں نکالنا تھا مگر خود مغربی تعلیم، سائنسی ایجادات اور جدید ذرائع مواصلات کے فروغ نے سیکولر خیالات کو عوام تک پہنچا دیا۔ ہندوستان کے بعض روشن خیال دانشوروں اور مصلحین نے بھی سیکولرازم کو مقبول عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ سر سید احمد خان اور ان کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے دیگر اہل قلم نے عقلیت پسندی، فکر و نظر کی آزادی، سائنسی علوم کی اہمیت کے تصورات کو عام کرنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کی۔ سبط صاحب تحریک پاکستان کی سیکولر بنیادوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور قائداعظم کے فکر و عمل کو سیکولر قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ جن داعیوں پر تحریک پاکستان استوار ہوئی یعنی قومیت کی بنیاد پر تشکیل ریاست کا مطالبہ، وہ بھی اپنے جوہر میں سیکولر ہے۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ قائداعظم نے بھی کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ البتہ قائداعظم اور مسلم لیگ مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک علیحدہ ریاست کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ مگر قائداعظم کے انتقال کے بعد ملک کی عنان اقتدار جن افراد اور طبقات کے ہاتھ میں آئی وہ فیوڈل ازم کے پروردہ تھے اور سیکولرازم ان کے طبقاتی اقتدار و تسلط کے خلاف تھا۔ سو انھوں نے ملک میں اس کی راہیں مسدود کرنے کی ہر امکانی کوشش کی۔ سبط صاحب اس گفتگو کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> 'پاکستان گذشتہ ۳۰۔۳۲ برس سے سیاسی و اقتصادی بحرانوں کا شکار ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں زندگی کے ہر شعبے میں فیوڈل عناصر اور فیوڈل اقتدار کا غلبہ ہے۔ حالانکہ فیوڈلزم مدت ہوئی اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اب اس میں دور حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں۔ وہ ایک پیر تسمہ پا ہے جس کو گردن سے اتارے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب جمہوری اصولوں کو فروغ کا موقع ملے اور معاشرے کی از سر نو تنظیم سیکولر خطوط پر کی جائے۔ اس تاریخی منصب کو ملک کے روشن خیال عناصر عامتہ الناس کے عملی تعاون ہی سے پورا کر سکتے ہیں'[۶۹]

سیکولرازم سائنسی طرز فکر اور تخلیقی و تنقیدی نقطۂ نظر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ سبط صاحب خود

سیکولرازم کے بارے میں بھی تنقیدی و تخلیقی طرز فکر کے حامل ہیں۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ سیکولر ازم ہر چند کہ سائنسی انداز فکر اور سائنسی طرز تعلیم پر اصرار کرتا ہے، جاگیری نظام کا مخالف اور صنعتی نظام کا حامی ہے، جمہوری حکومت اور اقتدار اعلیٰ کے غیر مابعد الطبیعاتی تصورات پیش کرتا ہے، شہری حقوق کے احترام اور آزادیٔ فکر کی تعلیم دیتا ہے اور ریاست و مذہب کی خود مختاری کا اصول متعارف کراتا ہے، اور ہر چند کہ یہ وہ اقدار ہیں جو سیکولرازم اور سوشلزم دونوں میں مشترک ہیں لیکن کسی ریاست کے سیکولر ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سوشلسٹ بھی ہے۔ سیکولرازم طبقاتی امتیازات کو ختم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ البتہ وہ ریاستیں جو سوشلزم کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں ان میں غیر طبقاتی نظام کے ساتھ سیکولر اقدار کا بھی احیاء ہو جاتا ہے۔ سوشلسٹ ریاستوں کے علی الرغم، 'سیکولرازم کا رجحان عموماً سرمایہ داری نظام کی جانب رہا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سیکولرازم دراصل بورژوا جمہوریتوں کا سیاسی نظریہ ہے'' [۷] چنانچہ سیکولرازم کے فروغ کے لیے کوشاں حلقوں کو اپنے دائرہ عمل کا مکمل شعور اور سیکولرازم کی تحدیدات (limitations) کا احساس ہونا چاہیے۔

ان عناصر کے لیے جو پاکستان میں ایک ایسے معاشرے کے دلدادہ ہیں جو طبقاتی امتیازات سے پاک ہو، سیکولرازم کے حق میں آواز بلند کرنا کیوں ضروری ہے، اس اہم سوال کا جواب سبط صاحب نے 'پاکستان میں افکار کی جنگ' کے دیباچے میں بالصراحت دیا ہے۔ اس جواب ہی سے خود ان کی سیکولرازم کی اس قدر پرجوش وکالت کا پس منظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> 'راقم الحروف کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ انسانیت کا مستقبل سائنسی سوشلزم کے ساتھ وابستہ ہے وہ پاکستان میں سوشلسٹ افکار کی روز افزوں مقبولیت اور ان کے اثرات کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تاہم اس نے (اس کتاب میں) اشتراکی افکار کے اس کردار کو موضوع بحث نہیں بنایا ہے جو انہوں نے محنت کش طبقات، نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے سماجی شعور کو بڑھانے میں ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راقم الحروف کا خیال ہے کہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح پاکستان بھی ہنوز قومی جمہوری انقلاب کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ لہٰذا ہمارا

اولین مقصد ایک ایسی سیکولر، جمہوری ریاست کا قیام ہونا چاہیے جو استعماری شکنجوں سے آزاد ہو۔ ہمیں فیوڈل سماجی ڈھانچے کو بھی ختم کرنا ہوگا جو نوآبادیاتی دور کی پروردہ سول اور فوجی انتظامیہ کی پرورش کرتا اور عوام کو رجعت پسندانہ افکار و رسوم کی بیڑیوں میں جکڑ دیتا ہے۔'[۱۷]

'پاکستان میں افکار کی جنگ' کے نو میں سے سات ابواب سیکولرازم ہی کے موضوع پر سبط صاحب کے تجزیوں اور مطالعات پر مشتمل ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو اس میں انہوں نے انہی مباحث کو جو وہ پہلے اردو میں ضابطۂ تحریر میں لا چکے تھے انگریزی داں حضرات کے لیے پیش کیا ہے۔ ان میں وہ مضامین بھی قطع و برید کے بعد شامل ہو گئے ہیں جو 'ڈان' میں مباحثے کے طور پر چھپے تھے۔ البتہ اس کتاب میں انہوں نے موضوعات کو اتنا پھیلا لیا ہے کہ ہر چند ان کی جداگانہ حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اکثر ابواب کا پاکستان میں تصادم افکار سے براہ راست طور پر کوئی تعلق اجاگر نہیں ہوتا مثلاً انہوں نے کم از کم چار ابواب جن میں سے دو قدیم معاشروں کے سیکولر افکار اور دو مشرقی ممالک اور مصر کے سیکولر رجحانات پر سپرد قلم کیے ہیں جن کا مقصد اگر پاکستان کی نظریاتی کشمکش کو اجاگر کرنا ہے تو یہ ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مناسب ہوتا کہ یا تو ان میں سے کچھ ابواب کو علیحدہ سے شائع کر دیا جاتا یا کتاب کا عنوان عمومی نوعیت کا رکھا جاتا اور اس کو صرف پاکستان تک محدود نہ کیا جاتا۔ موجودہ صورت میں کتاب کے مشمولات، اس کے عنوان کو سامنے رکھتے ہوئے عدم تناسب کا شکار نظر آتے ہیں۔

'نوید فکر' اور 'پاکستان میں افکار کی جنگ' کا ایک اور پہلو جو فرو گزاشت کی ذیل میں آتا ہے، یہ ہے کہ سبط صاحب نے سیکولرازم کے جن مخالفین کے خیالات کو حوالہ بنا کر تنقید و تنقیح کا کام کیا ہے ان میں سے بیشتر نہ تو پاکستان میں سیکولرازم کے سب سے بڑے مخالف ہیں اور نہ ہی تھیوکریسی کے اہم ترین نمائندہ ہیں۔ مثلاً سبط صاحب نے الطاف گوہر کے سیکولرازم کے خلاف اعتراضات تنقیح کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور صفحوں کے صفحے ان کے جواب کے لیے مختص کیے ہیں مگر الطاف گوہر نے جن مضامین اور کتب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ایک محدود انگریزی داں حلقے ہی کے زیر مطالعہ رہے ہیں اور عام آدمی ان سے ناواقف ہے۔ پھر الطاف گوہر کے یہ خیالات ایک خاص زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب وہ وزیراعظم بھٹو کے دور حکومت میں گرفتار کر

لیے گئے تھے۔ زمانہ اسیری میں انہوں نے سیکولرازم کے بارے میں اپنے مخالفانہ خیالات وضع کیے تھے البتہ اب وہ ان میں سے بیشتر خیالات کا دفاع نہیں کرتے۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ سبط صاحب سیکولرازم کے خلاف پیش کیے جانے والے ان دلائل کو بھی زیر بحث لاتے جو زیادہ مؤثر علماء اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اس بات کی بھی بڑی گنجائش موجود تھی کہ خود اسلامی نظریاتی کونسل جیسے حکومتی اداروں یا سرکاری ایما پر قائم کردہ مختلف کمیٹیوں مثلاً انصاری کمیشن وغیرہ کی رپورٹوں اور سفارشات کا بھی احاطہ کرلیا جاتا۔ پاکستان کے مختلف دساتیر میں مذہب وریاست کے تعلق کے حوالے سے موجود دفعات کا تجزیہ بھی اس نظریاتی وفکری نزاع کو سمجھنے میں ممد ومعاون ہوسکتا تھا جس سے آزادی کے وقت سے ملک دوچار رہا ہے۔

سبط صاحب کی علمی، ادبی اور صحافیانہ تحریروں اور تصانیف کے اس جائزے سے جو کسی طور پر مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا کم از کم یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے متفرق موضوعات کے باوجود ان میں ایک فکری سمت اور فکری رویہ موجود ہے۔ یہ ایک ایسے ذہن کی تخلیقات ہیں جو سائنسی انداز میں سوچتا اور اسی نہج پر چیزوں کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سبط صاحب کے افکار کی بنیاد مارکسزم کے مبادیات اور کلیوں پر استوار ہوئی ہے۔ وہ عقلیت پسندی، روشن خیالی وخرد افروزی کے زبردست علمبردار ہیں مگر خود ان کے یہ رجحانات ان کی مارکسی فکر سے ماخوذ ہیں۔

سبط صاحب نے جو علمی کارنامے سرانجام دیے ان کی قدر وقیمت کا اصل اندازہ اور تعین اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کو اردو زبان میں موجودہ سرمایۂ علم کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ ہماری ترقی پسند فکری روایت ہرچند کہ بہت زرخیز اور متاثر کن ہے مگر اس کے بعض گوشے ہنوز خاصے کمزور اور توجہ طلب ہیں۔ گزشتہ تقریباً نصف صدی میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے تمام نامساعد حالات کے باوجود اس خطے کے باشندوں کے سماجی شعور کو جلا بخشنے میں مہتمم بالشان کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں مگر ترقی پسند ادیبوں نے زیادہ تر شاعری اور فکشن کو ہی کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ شاید اس رجحان کا سبب یہ رہا ہو کہ جس ماحول میں یہ ادب تخلیق ہوا اس میں جبر کے شکنجے اس درجہ کسے ہوئے تھے اور آزادیٔ افکار اس قدر مفقود تھی کہ رومانیت کا سہارا لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ جن ترقی پسند ادیبوں نے شاعری اور فکشن سے ہٹ کر لکھا ان میں سے بھی بیشتر تنقید تک محدود رہے۔ اس قسم کے ادب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر خالص سماجی وتہذیبی موضوعات پر تحقیقی کام کی

ضرورت وافادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں سماجی موضوعات پر اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو کھنگال کر دیکھیں تو بھی چند گنے چنے نام ہی سامنے آپاتے ہیں۔ اگر سرسیّد سے اس فہرست کا آغاز کیا جائے تو بھی ذہن دس پندرہ ناموں سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ قیام پاکستان کے بعد تو اس باب میں قحط الرجال کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سبط صاحب کی تحریروں کی اہمیت یہی ہے کہ انہوں نے خالص ادبی موضوعات ہی پر نہیں لکھا بلکہ دیگر سماجی و تہذیبی مسائل پر بھی قلم اٹھایا اور بڑے تسلسل اور جانکاہی کے ساتھ انتہائی خیال انگیز تصانیف سپردِ قلم کیں۔ انہوں نے جن موضوعات پر لکھا اور جو کچھ لکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں سے بیشتر پر انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں مواد کی کمی نہ ہو مگر ہمارے یہاں کتنے لوگ ہیں جو اس مواد سے مستفید ہونے پر قدرت رکھتے ہیں۔ سبط صاحب کا فکری کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے ہمعصر سماجی و تہذیبی مسائل کا مارکسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا اپنے رشحاتِ فکر کو اردو کے قارئین کے لیے نہایت آسان اور دلنشین پیرائے میں پیش کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب بھی کبھی پاکستان کی تہذیبی تاریخ لکھی جائے گی اور اس میں روشن خیالی و سائنسی اندازِ فکر کی جہت پر تحقیق ہوگی تو یہ سبط صاحب کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔

حوالہ جات اور حواشی

۱۔ سیّد سبطِ حسن، 'بنّے بھائی' ماہنامہ افکار کراچی (سجاد ظہیر ایڈیشن) دسمبر ۱۹۷۳ء

۲۔ سیّد سبطِ حسن 'خود نوشت' ماہنامہ افکار کراچی جنوری ۱۹۷۹ء

۳۔ سیّد سبطِ حسن، 'ماضی کے مزار'، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۶ء دوسرا ایڈیشن، ص ۴۹

۴۔ ایضاً ص ۲۱

۵۔ ایضاً ص ص ۲۱۸۔۲۱۷

۶۔ ایضاً ص ص ۵۲۔۵۱

۷۔ سیّد سبطِ حسن، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'، (کراچی: مکتبۂ دانیال، جنوری ۱۹۷۷ء
دوسرا ایڈیشن) ص ۲۷

۸۔ ایضاً ص ۲۸

۹۔ ایضاً ص ص ۳۷۔۳۶

۱۰۔ ایضاً ص ۳۷

۱۱۔ ایضاً ص ص ۳۷۴۔۳۷۳

۱۲۔ ایضاً ص ۳۷۴

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ محمد علی صدیقی، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، ایک جائزہ'، ماہنامہ افکار کراچی، ۱۹۷۵ء

۱۵۔ 'موسیٰ سے مارکس تک' کے بارے میں تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو: سیّد جعفر احمد،
'موسیٰ سے مارکس تک'، ایک مطالعہ'، ماہنامہ 'پاکستانی ادب' کراچی، اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۶۔ Karl Marx, 'The British Rule in India', in Marx, Engels, *On Colonialism,* (Moscow: Progress Publishers, 1976) p.38

۱۷۔ سیّد سبطِ حسن، 'موسیٰ سے مارکس تک'، بحوالۂ سابقہ، ص ۴۱۹

۱۸۔ Karl Marx, 'The British Rule in India', *op.cit,* p.40

۱۹۔ Karl Marx, 'The Future Results of British Rule in India',

Ibid, p.82

۲۰۔ Karl Marx, 'The British Rule in India', Ibid, p.41

۲۱۔ سیّد سبط حسن، 'موسیٰ سے مارکس تک' بحوالۂ سابقہ، ص ۴۲۹۔۴۲۸

۲۲۔ R. Palme Dutt, *India Today* (Lahore: Book Traders, 1979), p.91.

۲۳۔ Ibid.

۲۴۔ ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور، یکم مارچ ۱۹۷۰ء

۲۵۔ سیّد سبط حسن، 'سوشلزم، کچھ خیالی کچھ حقیقی'، ہفت روزہ 'لیل ونہار' کراچی، شمارے ۲۹ مارچ ۱۹۷۰ء اور ۵ اپریل ۱۹۷۰ء (جلد ا، شمارے ۲ اور ۷)

۲۶۔ ایضاً۔(شمارہ ۲۹، مارچ ۱۹۷۰ء)

۲۷۔ ایضاً۔(شمارہ ۵، اپریل ۱۹۷۰ء

۲۸۔ مشتاق گمالوی، 'اشتراکی فلسفہ' روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور ۲۲، جنوری ۱۹۸۱ء

۲۹۔ انجم اعظمی، 'سیّد سبط حسن مرحوم'، ہفت روزہ 'اخبار جہاں'، ۵۔۱۱، مئی ۱۹۸۶ء

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ Oriana Fallaci, *Interview with History* (Boston: Houghton Mifflin Company, 1976) p.268.

۳۲۔ Prof. Qamruddin Khan, 'Failur of Democracy in Muslim Countries', Daily *Dawn*, Karachi, 23 March 1973

۳۳۔ S. Sibte Hassan, 'Feudalism is the Big Hurdle', Daily *Dawn*, Karachi, 1 April 1973.

۳۴۔ Prof. Qamruddin Khan 'Not Just Feudalism', Daily *Dawn*, Karachi, 8 April 1973.

۳۵۔ Ibid.

۳۶۔ S. Sibte Hassan, 'More Light on Democracy in Muslim Countries', Daily *Dawn*, Karachi, 15 April 1973.

۳۷۔ Ibid.

۳۸۔ Ibid.

۳۹۔ Daily *Dawn*, Karachi, 28 March 1976, 18 April 1976, 9 May 1976, 23 May 1976, 27 June 1976.

۴۰۔ Fred Halliday, *Iran: Dictatorship and Development,* (England: Penguin Books Ltd., 1979)

۴۱۔ Bernard Lewis, *The Revolt of Islam,* The New York Review, 30 June 1983.

۴۲۔ سیّد سبطِ حسن، 'انقلاب ایران' (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۰ء، ص ص ۹۔۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۴۴۔ ایضاً، ص ۵۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۴۶۔ سبطِ حسن کی تصنیف 'انقلابِ ایران' پر تفصیلی تبصرے کیلئے ملاحظہ ہو: سیّد جعفر احمد، 'انقلاب ایران۔ ایران کا ماضی حال اور مستقبل'، ہفت روزہ 'معیار' کراچی، ۲۴ جون ۱۹۸۰ء (جلد ۵، شمارہ ۲۴)

۴۷۔ Quoted in Nazir Hussain Chaudri, *Cheif Justice Muhammad Munir, His Life, Writing and Judgements,* (Lahore: Research Society of Pakistan, 1973), pp.201-02

۴۸۔ روزنامہ جنگ لاہور' جمعہ میگزین' ۲۶ر اگست تا یکم ستمبر ۱۹۸۳ء

۴۹۔ Muhammad Munir, *From Jinnah to Zia* (Lahore: Vanguard Books, n.d.)

اس کتاب پر تفصیلی تنقیدی جائزے کے لیے ملاحظہ ہو:

Syed Jaffar Ahmed, 'Pakistan: The Politics of Ideology', *Journal of Social Sciences and Humanities* (Karachi: Univeristy of Karachi) 1985, Nos. 1 and 2

۵۰۔ سیّد سبطِ حسن 'نوید فکر' (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۲

۵۱۔ ایضاً، ص ص ۱۳۔۱۲

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۳

۵۴۔ ایضاً، ص ۲۷

۵۵۔ ایضاً، ص ص ۲۸۔۲۷

۵۶۔ ایضاً،ص ۳۷

۵۷۔ ایضاً،ص ۳۸

۵۸۔ ایضاً،ص ص ۵۶۔۵۵

۵۹۔ ایضاً،ص ص ۵۷۔۵۶

۶۰۔ شاہ ولی اللہ، 'حجۃ اللہ البالغۃ'، اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم (لاہور: قومی کتب خانہ، ۱۹۸۳ء)، جلد اول، ص ص ۶۰۶۔۶۰۳

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ الطاف حسین حالی، 'الدین یسر'، مشمولہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی (مرتب) 'کلیاتِ نثرِ حالی'۔ (جلد اول)، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء) ص ص ۸۔۷

۶۳۔ ابوالحسن علی ابن احمد الواحدی، اسباب النزول (قاہرہ: مطبع ہندیہ، ۱۳۷۵ھ) ص ص ۱۱۸۔۱۱۷

۶۴۔ امام غزالی 'نصیحت الملوک'، (لندن: ۱۹۶۴ء ص ۴۴)۔ منقول: نوید فکر، ص ص ۶۲۔۶۱

۶۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، 'اسلامی ریاست' (لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء) ص ۱۸۵

۶۶۔ سید سبط حسن، 'سیکولرازم۔ کیوں؟' 'پاکستانی ادب'، کراچی فروری۔ مارچ ۱۹۷۶ء (جلد ۳ شمارہ ۱۴۔۱۵)

۶۷۔ *Encyclopaedia Americana.* Vol. 24, p.521.

۶۸۔ سید سبط حسن، 'نوید فکر' بحوالہ سابقہ، ص ۸۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۷۹

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۸

۷۱۔ Sibte Hassan, *The Battle of Ideas in Pakistan* (Karachi: Pakistan Publishing House, 1986) pp.5-6.

دوسرا حصہ

شخص و عکس

سبطِ حسن

کیفی اعظمی

آج ہم ایک ایسی شخصیت کا جشن منا رہے ہیں جو شخصیت پرستی کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم نے ایک دوسرے کو آنکھ مار کے اور صاحب جشن کو ضرورت سے زیادہ بھولا سمجھ کے اس کو روشن خیالی کا جشن کہنا شروع کر دیا۔ اب اس کو کیا کہا جائے۔

ہم نے نام اس امید پہ بدلا کہ جب سود کو منافع کہنے سے سود حلال ہو جاتا ہے تو جشن کا نام بدلنے سے ہم کو جشن منانے کی اجازت بھی مل جاتی ہے۔

تاریخ کی ورق گردانی کر کے دیکھ لیجئے، ہر بڑی شخصیت نے ہمیشہ اپنے عقیدتمندوں اور چاہنے والوں سے یہی کہا کہ مجھے اپنے سے الگ نہ سمجھو، میں تمہیں میں سے ہوں اور تمہارے جیسا ہوں، مجھے دیوتا یا اوتار کا درجہ نہ دو، لیکن عقیدتمند اپنی عقیدتمندی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آئے۔ اسی لیے دنیا میں آج اتنے مذاہب اور اتنے نظامِ فکر ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے سبط حسن صاحب اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کو ہمیشہ روکتے اور منع کرتے رہے کہ میرا جشن منانے کی ضرورت نہیں کہ ایسے جشن نفسِ امارہ کو موٹا کرنے کی ایک سازش ہوتے ہیں۔ انہی سے شخصیت پرستی جنم لیتی ہے۔ شخصیت پرستی کے ہم بھی قائل نہیں۔ لیکن تاریخ میں فرد کا جو رول ہے اس کو نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ سبط حسن صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف اور اس کو سراہنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے پردے میں ہم روشن خیالی کے بعض پہلوؤں کو واضح کر سکیں گے۔

یہ مختصر مضمون 'طلوعِ افکار' (کراچی) کے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شامل ہے (مرتب)۔

کسی ایسے ملک کے لیے جو تعمیر کے مرحلوں سے گزر رہا ہو، تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے:

نمبر۱۔ روشن خیالی

نمبر۲۔ اور روشن خیالی

نمبر۳۔ زیادہ سے زیادہ روشن خیالی

یہ روشن خیالی تاریک اندیش حکمراں طبقے کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔ اسی لیے حکمراں طبقہ اس کو بغاوت سمجھتا اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو (جس پر اس کا قبضہ ہوتا ہے) اس کی اشاعت سے روکتا ہے۔

میں چونکہ ہندوستانی ہوں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ ان علمی کارناموں پر سبط حسن صاحب کو ستارۂ پاکستان ملنا چاہیے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جو حضرات پاکستان کو ہمیشہ فتح مند اور کامران دیکھنا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں کا مطالعہ ضرور کریں۔

ہمارے ادب کی اگر کوئی نئی تاریخ لکھی گئی تو موجودہ دور کو ڈائجسٹ کا دور کہا جائے گا۔ اس ڈائجسٹ کے دور میں ایسی علمی کتابیں لکھنا اگر سبط حسن صاحب کا کارنامہ ہے تو اس کا چھاپنا اور عام قاری تک پہنچانا ملک نورانی صاحب کا کارنامہ ہے۔ میں اپنے دونوں محترم دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور سب سے زیادہ مبارکباد پاکستان کے قاری کو دیتا ہوں۔ جس کی علمی پیاس کا یہ عالم ہے کہ مختصر مدت میں ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

سیّد سبطِ حسن: ایسا کہاں سے لائیں

حمید اختر

سیّد سبط حسن کی زندگی اور ان کا سفر آخرت کسی اساطیری داستان کا حصہ معلوم ہوتا ہے، پچاس برس قبل ایک نوجوان اپنا گھر، زمین جاگیر، بیوی اور تین برس کی بچی کو چھوڑ کر، اس دنیا کو بہتر بنانے کے مشن پر روانہ ہوتا ہے اور تقریباً پچاس برس بعد اسی مشن کی تکمیل کے سلسلے میں کراچی سے لکھنؤ کا سفر کرتا ہے انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات میں شمولیت کے بعد لکھنؤ سے دہلی پہنچتا ہے۔ دہلی سے کراچی کا ہوائی ٹکٹ گم ہو جانے کی وجہ سے واپس نہیں آسکتا اور وہیں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک سے آج بھی ہزاروں افراد روزانہ باہر جاتے ہیں مگر ان کا سفر مال و دولت بنانے یا سیر و تفریح کرنے کے لیے ہوتا ہے، سبط حسن آرام عیش، مال دولت سب ہی کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے، انہیں تلاش تھی زندگی کے حسن کی، صداقتوں کی اور سچائیوں کی، انہی کی تلاش میں انہوں نے سردار جعفری اور مجاز مرحوم کے ساتھ مل کر لکھنؤ سے ترقی پسند ادب کا پہلا مجلّہ شائع کرنا شروع کیا تھا، پھر بمبئی جا کر (غالباً ۴۳-۱۹۴۲ء میں) کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے، وہیں سے اس اخبار کی نمائندگی کے لیے اقدام متحدہ میں متعین ہوئے، یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا اور یہ وہ وقت تھا جب برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی تحریک پورے عروج پر تھی۔ چنانچہ امریکہ میں سبط حسن نے ملک کی مختلف ریاستوں میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر لیکچر بھی دیئے، وہیں سامراج دشمن سرگرمیوں کے الزام میں گرفتار ہوئے، ان کی گرفتاری کے خلاف اقوام متحدہ . متعین دنیا بھر کے اخباری نمائندوں نے اس

عالمی ادارے کی کارروائی کا ایک دن کے لیے بائیکاٹ کیا چنانچہ اس دن کی کارروائی کا اخباری ریکارڈ دنیا بھر میں کہیں موجود نہیں ہے۔

۱۹۴۸ء میں سبط حسن لاہور آ گئے، ان سے پہلی ملاقات مجھے اب تک یاد ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس ملاقات کے بعد ہم دونوں میں جس دوستی اور رفاقت کی بنیاد پڑی وہ چالیس برس تک قائم رہی، اس مدت میں ہم نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے، بہت سے خواب دیکھے، زندگی کے حسن کے، انسانوں کی بہتری کے، بہت سی شامیں گذاریں اور متعدد آمائشوں میں سے گذرے۔ ۱۹۵۱ء میں جب میں سال بھر قید تنہائی میں رہا سبط حسن کسی اور جیل میں محبوس تھے، میں ایک برس بعد رہا ہوا وہ ڈھائی تین برس زندان میں رہے اور یہ ایسی قید تھی جس میں کوئی ملاقاتی ان سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ جو لوگ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں انہیں اس بات کا علم ہے کہ جیل میں ملاقاتیوں کا آنا کیا معنی رکھتا ہے، نظر بند ایک ایک دن گن گن کر گذارتے ہیں اور پندرہ دن بعد ملاقات کی امید میں جیتے ہیں مگر سبط حسن سے تین برس تک ملنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے کہ نظر بندی کے قوانین کی رو سے سیاسی قیدیوں سے صرف قریبی عزیز ہی ملاقات کر سکتے ہیں، اُن کا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں تھا۔ دوست بہت تھے اور ان کے لیے تڑپنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی، مگر انہوں نے تنہا ہی یہ مرحلہ طے کیا۔

سبط حسن کے پاکستان آنے سے پہلے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں جب میں بمبئی گیا وہ اس سے چند ہی روز قبل امریکہ جا چکے تھے، اس لیے ان کی نزاکتوں اور نفاستوں کا ذکر بہت سنا۔ علی سردار جعفری، کرشن چندر اور سید سجاد ظہیر کی زبانی دو برس تک ان کا ذکر سنتے رہے مگر ملاقات لاہور ہی میں ہوئی۔ لاہور آ کر انہیں سب سے پہلے مجھ سے ملنا تھا، وہ فرضی نام پر لاہور آئے تھے اس لیے کہ پنجاب پولیس کے پاس ان کی گرفتاری کے وارنٹ پہلے سے موجود تھے، ان دنوں اس شہر لاہور میں میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، نیا نیا مہاجر بن کر یہاں وارد ہوا تھا، سبط حسن دو روز تک مجھے تلاش کرتے رہے۔ قیام فلیٹیز ہوٹل میں تھا۔ کراچی سے لاہور پہنچنے پر ریلوے اسٹیشن کے باہر ان کے شاندار لباس اور امیرانہ وضع قطع دیکھ کر ایک ایجنٹ انہیں فلیٹیز ہوٹل لے آیا تھا، دو روز بعد ملاقات ہوئی تو پہلی بات یہ کہی کہ 'بہت بڑے ہوٹل میں پھنس گیا ہوں، ہر طرف اندھیرا ہے، کمرے گندے ہیں اور بدبو سے دماغ پھٹا جاتا ہے، کسی

بہتر جگہ پر رہائش کا انتظام کر دیجئے'۔ میں نے کہا 'حضرت یہ تو راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے، شہر میں اس سے بہتر جگہ موجود ہی نہیں ہے' حقیقتاً ۱۹۴۸ء میں لاہور میں فلیٹیز سے بہتر کوئی ہوٹل موجود نہیں تھا مگر سید سبط حسن کی نفاست پسند طبعیت پر یہ بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ بہرحال اگلے روز کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے، غالباً کسی دوست کے گھر اور زیر زمین رہتے ہوئے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

سبط حسن اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی باتیں، ان کے اصول، ان کی انا، خودداری، روشن خیالی اور صاف گوئی کی عادت ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہے گی۔ اس شہر لاہور میں سبط حسن کو کیسی کیسی پریشانیوں سے گذرنا پڑا۔ مصیبتوں اور آزمائشوں کے کیسے کیسے دور آئے مگر ان کی زبان سے حرف شکایت کبھی نہیں نکلا ہاں البتہ خوباں لکھنؤ کو ضرور یاد کرتے مگر اپنی ذاتی تکلیف یا پریشانی کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا، اس دنیا کو بدلنے اور بہتر بنانے کا، استحصال ظلم اور جبر کے خاتمے کا، سبط حسن کو ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا، پھولوں سے، بچوں سے، حسین لوگوں سے خوبصورت چہروں سے، ان کی جمال پرستی کے بہت سے قصے مشہور ہیں اور بہت سوں کے ہم عینی گواہ بھی ہیں اور اسی پیمانے سے وہ اس دنیا کو بنانا اور سنوارنا چاہتے تھے، زندگی کے آخری دس بارہ برس میں انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بڑا ٹھوس کام کیا، جو کام جماعتوں اور اداروں کے کرنے کا تھا یعنی فکری لحاظ سے لوگوں کو اور معاشرے کو تبدیلی کے لیے تیار کرنے اور توہمات اور تعصبات سے بچانے کا وہ انہوں نے تن تنہا انجام دیا۔ مجھے یاد ہے غالباً ۱۹۷۴ء میں چند روز کے لیے کراچی میں ان کے گھر ٹھہرا تھا۔ ایک رات میں نے شکایت کی کہ آپ لوگوں سے ملتے نہیں، بہت سے لوگ شاکی ہیں کہ آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے ہیں کہنے لگے 'بھئی وقت بہت کم ہے اور کام بہت ہے، اس لیے میں ملاقاتیں کرنے کے بجائے کام کرتا ہوں' اس پر ہمارے درمیان میں کافی دیر بحث رہی میں نے کہا آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وقت کم ہے۔ ٹھیک ہے کرنے کے بہت کام باقی ہیں مگر زندگی کے بارے میں یہ سوچ مریضانہ ہے۔ اگلے روز میں نے بیٹی نوشابہ سے کہا اپنے ابو کے دماغ سے یہ بات نکالو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسی دس بارہ برس میں انہوں نے 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'ماضی کے مزار'، 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء'، 'انقلاب ایران' اور 'نوید فکر' جیسی معرکتہ الآرا تصانیف مکمل کیں۔ اس سے قبل

’شہر نگاراں‘ شاید مکمل کر چکے تھے، ان کی آخری کتاب Battle of Ideas بھی ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ یہ گذشتہ بارہ برس کی تخلیقات ہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ اپنی دھن میں کام کرتے رہے۔ اپنے مضامین میں تصانیف اور لیکچروں کے ذریعے انہوں نے رواداری، روشن خیالی، سائنسی سوچ اور فکر کے نئے اور بلند مینار تعمیر کیے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کی تقریبات کے دوران لندن (اگست ۱۹۸۵ء) اور کراچی (مارچ ۱۹۸۶ء) میں بار بار اس پریشانی کا اظہار کرتے تھے ہمارے ذرائع ابلاغ، ملا، پیران حرم اور ان کے گماشتے حکمرانوں کے ساتھ مل کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ عام انسانوں کو ان کے روزمرہ کے مسائل کا ادراک نہیں کرنے دیتے اور انہیں توہمات اور تعصبات کے کنویں میں دھکیل رہے ہیں، جس سائنسی سوچ اور روشن خیالی کی بنیاد سر سیّد احمد خان نے ڈالی تھی آج ہم اس سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ان کی آخری دونوں تصانیف اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دور میں ثقافتی، ادبی، تہذیبی اور فکری میدان میں کام کرنے والے نوجوان بہت عرصے تک سبطِ حسن کی نگارشات سے رہنمائی حاصل کرتے رہے گے۔

سبطِ حسن میرے دوست ہی نہیں استاد بھی تھے، لاہور آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ ’نیا زمانہ‘ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر چوں کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تھے اس لیے وہ ’زیرِ زمین‘ رہ کر پرچہ مرتب کرتے تھے۔ بظاہر میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ احمد راہی اور بشیر ظفر ایڈووکیٹ بھی اس اخبار میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے، حکومت نے ’نیا زمانہ‘ کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا تو ’اپنا وطن‘، ’سحر‘ اور دوسرے ناموں سے ہم لوگ یہ پرچہ شائع کرتے رہے۔ یہ ایک مکمل اخبار تھا، اس زمانے میں اس کی خوبیوں کی داد احمد راہی، بشیر ظفر اور میں سمیٹتے رہے اس لیے کہ بظاہر ہم ہی یہ اخبار نکالتے تھے، بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ اس معیاری ہفت روزہ اخبار کی تدوین و ترتیب اصل میں کس کی ذمہ داری ہے۔ میں صحافتی دنیا میں بالکل نووارد تھا، چند ادبی کہانیاں ضرور لکھ چکا تھا، اخبار نویسی سبطِ حسن سے سیکھی۔ ہر ہفتے مختلف موضوعات پر لکھنے کے لیے مختلف دوستوں کی ڈیوٹی لگتی، میرا کام ان تمام مسودات کو جمع کر کے سبطِ حسن کو پہنچانا اور پھر ان کی قطع و برید کے بعد کتابت کرا کے شائع کرانا تھا، ابتدا ہی میں مجھے کسی خاص موضوع پر لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ سبطِ حسن نے میرا آدھے سے زیادہ مضمون کاٹ کر پھینک

دیا۔ میں چونکہ ادب کا طالب علم تھا اس لیے لفاظی اور زبان کی چاشنی پر زیادہ توجہ دیتا، سبط حسن ایک بھی فالتو لفظ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے، بغیر دلیل کے کسی دعوے کو چھاپنے پر رضامند نہ ہوتے۔ اعداد وشمار کے بغیر کسی فیصلے کا اعلان کرنے کے حق میں نہ ہوتے۔ یہ سلوک میرے مضامین ہی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ سب ہی لکھنے والوں کے صفحے قلمزد ہو جاتے، ہمارے ایک دوست زور بیان میں کہیں کے کہیں نکل جانے کے عادی تھے، ان کا مضمون ہاتھ میں آتے ہی ہمیشہ کہتے 'معاذ اللہ آپ لوگوں نے کیسے کیسے ''سلطان القلم'' پال رکھے ہیں جو لکھنے پر آتے ہیں تو پلٹ کر دیکھتے ہی نہیں......' اکثر اوقات ان کے دس صفحے کے مضمون کو سبط حسن تین چار پیراگراف میں بدل دیتے اور اس طرح الجھی ہوئی تحریر کی وجہ سے جو بات قاری کی سمجھ میں شاید نہ آسکتی واضح اور دوٹوک شکل میں سامنے آجاتی۔

اس کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں یہ اخبار مؤثر اور بامعنی ہوتا، سبط حسن جس طرح زندگی بھر فالتو بات کرنے سے گریز کرتے رہے اسی طرح انہوں نے کبھی کوئی غیر ضروری فقرہ لکھا بھی نہیں، بغیر دلیل اور منطق کے کبھی کچھ نہیں لکھا۔

ذاتی زندگی میں وہ خوش پوش، نفاست پسند، مہذب اور انتہائی نرم گفتار تھے، معاشی طور پر بدترین حالات میں بھی ان کے لباس میں کسی نے کبھی شکن نہیں دیکھی، گرمیوں میں کرتہ شلوار پہن کر گھر سے نکلے تو واپس آکر دوبارہ باہر جانے کے لیے کبھی وہ جوڑا استعمال نہیں کیا، شام کو دوبارہ دھوبی کا دھلا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے تھے، ہم نے بہت دفعہ کہا 'سید صاحب آپ کے وارڈروب کا خرچ بہت ہے اسے کم نہیں کیا جاسکتا؟' جواب ہمیشہ یہی ہوتا 'بھئی ایک دفعہ پسینہ جذب ہونے کے بعد وہ کپڑا دوبارہ کیسے پہنا جاسکتا ہے؟' سبط حسن خواتین میں ہمیشہ بہت مقبول رہے اور یہ بات ہمارے جیسے دوستوں کے لیے اکثر رشک وحسد کا باعث بنتی رہی، ایک دفعہ میں نے ایک خاتون سے جو اصل میں میری دوست تھی اور جس سے میری ہی وجہ سے سبط حسن کا ربط تھا میں نے پوچھا کہ ان کی خواتین میں مقبولیت کی وجہ کیا ہے، ہمیں بھی تو کچھ پتہ چلے، اس نے کہا سبط جب اس سے بات کرتے ہیں تو اسے کچھ ایسا لگتا ہے 'جیسے اِدھر اُدھر، آس پاس بلکہ پوری دنیا میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے، ہم ہی ہم ہیں، اپنے سے جونیئر لوگوں سے بالخصوص اپنی بچی سے ہمیشہ یہ کہتے تھے، اپنے کسی فعل کسی کام کے بارے میں کسی کے سامنے کوئی وضاحت نہ کرو،

ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھو اور خود اپنے کو بتاؤ کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا، کسی دوسرے کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے، گھر میں ان کا کہنا تھا کہ کوئی بلند آواز سے نہ بولے کیوں کہ بک بک کرنا ہماری تہذیب میں معیوب ہے، روایات کی پاس داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۵۰ء میں مزدوروں کے ایک جلسے میں نصیر انور مرحوم اور میں نے اسٹیج پر کلاسیکل موسیقی پیروڈی کی شکل میں پیش کی، سبط حسن بھی اس جلسے میں کہیں چھپے بیٹھے تھے، شام کو میں ملا تو میری بہت کھنچائی کی، کہنے لگے 'جہالت کی اس سے بڑھ کر کوئی نمائش ہو سکتی ہے، کلاسیکی موسیقی ہماری تہذیب اور روایات کا حصہ ہے، آپ لوگوں کو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔' رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ ہم دونوں کے درمیان کسی قسم کا تکلف نہیں تھا اور وہ ابتدا ہی سے پہچان گئے تھے کہ عام دنیاوی معاملات میں میں خاصا احمق ہوں، ہر کسی پر اعتبار کر لیتا ہوں اپنے نفع نقصان کے بارے میں نہیں سوچتا مگر جب کبھی میری کسی حماقت کا ذکر ہوتا تو ہمیشہ یہی کہتے 'بھئی آپ بہت بھولے آدمی ہیں' گذشتہ برس جب میری کسی حماقت پر انہوں نے بہت غصے سے کہا 'بھائی آپ کی بے وقوفی کی کوئی حد بھی ہے' تو سب نے خوشی سے نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا 'یہ کلمہ حق کہنے کے لیے آپ نے چالیس برس انتظار کیا، چلیے صحیح بات آپ کی زبان پر آئی تو......'

سبط حسن کی زندگی بہت منظم تھی، رہنے سہنے کا انہوں نے ایک معیار قائم کر رکھا تھا جو بدترین حالات میں بھی قائم رہا۔ صفائی کے بہت پابند تھے اور ان کے کمرے میں ہر چیز قرینے سے رکھی رہتی تھی، عام طور سے غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے، ۱۹۵۰ء میں جب میں دوبارہ جیل گیا تو اتفاق سے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ ہم کچھ عرصے اکٹھے جیل میں رہے، ہر صبح ان کا بستر دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی، ہم لوگوں کے بستر صبح اس حالت میں ہوتے کہ دری کہیں ہے، تکیہ کہیں ہے اور چادر کہیں الگ پڑی ہے مگر رات بھر سو کر اٹھنے کے بعد سبط کے بستر پر شکن تک نہیں ہوتی تھی۔ اس پر سب لوگ ان کا مذاق اڑاتے۔ میں نے تو اعلان کر رکھا تھا کہ بستر کو صحیح حالت میں رکھنے کے لیے سبط اس پر نہیں سوتے بلکہ کرسی پر سوتے ہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کبھی کبھی ہمارے وارڈ میں آتے اور کرسی پر براجمان ہو کر پند و نصائح کا دفتر کھول دیتے، سبط حسن ایسے موقع پر ہمیشہ ادھر ادھر ہو جاتے، میں تکلفاً سپرنٹنڈنٹ صاحب کی باتیں سنتا اور ہوں ہاں کرتا رہتا۔ ایک روز سبط کہنے لگے 'یہ حمید اختر کمال کا آدمی ہے۔ یہ ہر بور آدمی کے ساتھ گھنٹوں گفتگو

کر سکتا ہے۔' ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی غیر پسندیدہ آدمی کے ساتھ بات بھی کر لیں۔ اپنی طبیعت اور ضمیر کے خلاف عمر بھر کوئی کام نہیں کیا، بات ضروری اور مختصر کرتے) انڈر گراؤنڈ زمانے میں ایک روز میں انہیں اپنے پرانے دوست فیض الحسن کے (جو گذشتہ ۳۲ برس سے لندن میں مقیم ہیں) گھر لے گیا۔ فیض الحسن سے فرضی نام سے سبط حسن کا تعارف کرایا۔ یہ دوست جنسی کتابوں کے بہت رسیا تھے اور ان کے اس کمرے میں جہاں ہم بیٹھے تھے جنسی انسائیکلوپیڈیا قسم کی بے شمار کتابیں رکھی تھیں۔ سب نے ان کتابوں پر نظر ڈالی اور فیض الحسن سے پوچھا۔

'یہ کتابیں کون پڑھتا ہے؟......'

فیض الحسن نے کہا 'میں پڑھتا ہوں، آپ بھی پڑھیے جو کتاب پسند ہو لے جایئے'

'میاں سیکس پڑھنے کی نہیں کرنے کی چیز ہے، ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے' فیض الحسن کے لیے یہ جواب کافی تھا۔ یہ غالباً ۱۹۵۳ء ستمبر کا ذکر ہے۔ سبط کو جیل سے رہا ہو کر آئے کچھ ہی دن گذرے تھے اور وہ مال روڈ کے پیچھے نقی بلڈنگس کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ ان ہی دنوں دریائے راوی کا پانی لاہور کے رہائشی علاقوں میں داخل ہو گیا تھا، میں ان دنوں سنت نگر میں رہتا تھا، دن کے وقت میں دفتر 'امروز' میں ڈیوٹی پر تھا کہ پتہ چلا سنت نگر اور کرشن نگر کے محلے زیر آب ہیں اور تمام راستے بند ہیں، گھر میں اس وقت میری بہن اور کم عمر بھتیجی تھی، بڑے بھائی لاہور سے باہر تھے۔ مجھے بہن بھتیجی کی فکر تھی۔ اور پانی یونیورسٹی کے باہر تک آ گیا تھا۔ ویدسماج روڈ پر جو میرا راستہ تھا چھ سات فٹ پانی تھا، اسی سڑک پر مرحوم صوفی تبسم صاحب کا گھر تھا، پتہ چلا وہ بھی رات سے چھت پر بیٹھے ہیں، سبط حسن اور میں ساری شام ادھر ادھر کا چکر لگاتے رہے مگر گھر تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا، رات ایک بجے تک تمام لوگ ٹی ہاؤس میں بیٹھے اور وقفے وقفے سے شاہدرہ کے پاس جا کر پانی کا زور دیکھتے رہے مگر پانی کم ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک بجے کے بعد وہاں سے اٹھ کر نقی بلڈنگ میں سبط حسن کے گھر آئے مگر پریشانی کی وجہ سے سو نہ سکے۔ صبح پتہ چلا کہ پانی کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے، میری پریشانی دیکھتے ہوئے سبط حسن نے اعلان کیا کہ وہ تیر کر میرے گھر جائیں گے اور بہن کی خیریت معلوم کر کے آئیں گے۔ میں نے انہیں بہت روکا اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی خطرہ تھا، وہ بہت اچھے تیراک تھے مگر ان کی نفاست طبع کی وجہ سے بھی مجھے معلوم تھا کہ اس گندے اور غلیظ پانی سے گذر کر جانا ان کے لیے کس قدر مشکل ہوگا،

دریا کے پانی کے ساتھ علاقے کی ساری غلاظت، حشرات الارض، سانپ، بچھو وغیرہ بھی بکثرت موجود تھے مگر سبط حسن اس پانی میں گذر کر نہ صرف میرے گھر گئے بلکہ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد اس سے آگے کرشن نگر میں عائشہ جمال (ہاجرہ مسرور کی بڑی بہن) کے ہاں بھی گئے اور دو گھنٹے بعد واپس آ کر ہم لوگوں کو گھر والوں کی خیریت سے آگاہ کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد وہ مسلسل کئی دن بار بار نہاتے اور پوڈر ملتے رہے، کہتے تھے ناک سے گندے پانی کی بدبو نہیں جاتی۔ اس شام میں گورنمنٹ کالج سے ہوتا ہوا گھوڑا ہسپتال جا کر وہاں سے کشتی میں سوار ہو کر گھر پہنچا تھا۔ ہمارے گھر میں خیریت تھی، مکان کی دوسری منزل پانی سے محفوظ رہی تھی، نچلی منزل میں البتہ چھ سات فٹ تک پانی ہی پانی تھا۔

۹ جولائی ۱۹۵۴ء سے ستمبر تک ہم بارہ چودہ آدمی لاہور سنٹرل جیل کے بم وارڈ میں رہے، ہمارے ساتھ مرحوم لال خاں، مرحوم دادا منصور، مرحوم محمد افضل، شمیم اشرف ملک، مرزا ابراہیم، رؤف ملک، کامریڈ غلام محمد، سی آر اسلم اور بہت سے دوسرے ساتھی تھے ہم لوگوں نے اپنے وارڈ میں والی بال کی ٹیم بنائی، روزانہ شام کو دو تین گھنٹے والی بال کھیلتے، میچ میں بھی سبط حسن بے قاعدگی برداشت نہ کرتے، ساتھیوں سے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا کہ جو بال ان کی طرف آ رہا تھا اسے دوسرے بھاگ کر کیوں اٹھاتے ہیں، آخر میں انہوں نے اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچنا شروع کر دیا، روزانہ اعلان 'یہ ہمارا علاقہ ہے، اگر یہاں کوئی آیا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا'

لاہور سنٹرل جیل کے یہ تین مہینے بہت اچھے گزرے، سبط حسن، سی آر اسلم اور افضل مرحوم دن بھر شطرنج کھیلتے، ہم لوگ تاش کی بازی لگاتے، اس کام کے لیے بم وارڈ میں جہاں ہم سب کی علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیاں تھیں وہاں ایک بڑا ہال بھی تھا جہاں کھیل بھی ہوتا، سیاسی بحثیں بھی جاری رہتیں اور لطیفہ بازی کے دور بھی ہوتے، جیل پہنچتے ہی میری تجویز پر ہم سب لوگوں نے احتجاج کے طور پر سر کے بال منڈوا دیے تھے، پورے کے پورے چودہ آدمیوں نے حجام کو بلا کر استرے سے سر صاف کرائے تھے۔ تیسرے دن اس زمانے کے آئی جی جیل خانہ جات کرنل بشیر سیّد آئے تو اتنے سارے سیاسی قیدیوں کے چٹیل سر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور کافی دیر تک پوچھتے رہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔ سبط حسن کا اس وقت میں کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔ باقی سب نظر بندوں کے گھر والے ہر پندرہ روز کے بعد آتے تھے، کھانے پینے کا سامان، سگریٹ، مٹھائی، پھل غرض کہ ہر ایک کے

گھر سے ملاقات پر حسب توفیق سامان آتا۔ سبط حسن واحد نظر بند تھے جس کا کوئی ملنے والا نہ تھا مگر انہوں نے اس پر کبھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا، جیل میں انہوں نے حقے کا دیسی تمباکو، جسے وہ 'کھبڑ' کا نام دیتے تھے صاف کر کے پائپ میں پینا شروع کر دیا تھا، چنانچہ دو تین ماہ کے لیے آٹھ دس روپے کا تین چار سیر دیسی تمباکو ان کی واحد ضرورت تھا۔ یہاں یہ تین مہینے بڑے مزے میں گذرے، حتیٰ کہ ہم لوگوں کو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں پنجاب کی مختلف جیلوں میں بھیجدیا گیا۔ لال خاں مرحوم، ڈاکٹر عبداللہ، مرزا محمد ابراہیم، کامریڈ، غلام محمد اور میں میانوالی جیل بھیجے گئے، سبط حسن اور دوسرے ساتھی کیمبل پور اور کچھ دوسری جیلوں میں۔ جانے سے پہلے ہم لوگوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں رٹ کی درخواست دائر کی، چنانچہ جنوری ۱۹۵۵ء میں اس کی سماعت کے لیے ہم سب لوگوں کو واپس لاہور لایا گیا اور ہائی کورٹ کے حکم سے اسی ماہ یہیں سے رہا کیا گیا، اسی روز اردو کے منفرد افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تھا۔

جیل کے نمبرداروں اور مشقتیوں کے لیے سبط حسن کا نام کچھ مشکل تھا، چنانچہ اس تمام عرصے میں سید صاحب کو سیفٹی حسن کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی تھا۔ وہ سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھے جیل کے عملے نے انہیں سیفٹی حسن کا نام دے دیا، یہاں تک تو خیریت تھی، ایک روز سبط حسن کے لیے ڈیوڑھی سے بلاوا آیا جو نمبردار انہیں لینے وارڈ میں آیا اس نے آتے ہی اعلان کیا، 'صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر سید سفل حسن کو یاد کر رہے ہیں' یاروں نے اس پر قہقہہ لگایا تو سبط حسن نے بڑی لجاجت سے کہا 'بھائیو اس بات کو یہیں تک رکھنا، باہر جا کے کسی سے نہ بتانا ورنہ بھائی لوگ اسی نام سے پکارنے لگیں گے۔'

گرفتاری سے ڈیڑھ برس قبل میں 'امروز' کے ادارتی عمل میں شامل ہو چکا تھا، رہائی کے بعد واپس 'امروز' میں کام شروع کر دیا۔ سبط حسن البتہ کچھ دنوں بیکار رہے مگر ان کے مشاغل، رہن سہن، معیار زندگی، صفائی ستھرائی، نفاست اور نزاکت میں کوئی فرق نہیں تھا، اس زمانے میں 'امروز' اور 'پاکستان ٹائمز' کے بانی مرحوم میاں افتخار الدین کو ہفت روزہ نکالنے کا خیال آیا اور 'لیل و نہار' کے نام سے ڈیکلریشن لے لیا گیا۔ تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایڈیٹر کی تلاش ہونے لگی۔ ایک روز میاں صاحب 'امروز' کے دفتر آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر اس ہفت روزہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے، کافی دیر بعد اٹھ کر جانے لگے تو اچانک مجھ سے پوچھا 'لیل و نہار' کا ایڈیٹر کسے

بتائیں؟'

میں نے فوراً کہا، 'سبط حسن' کو۔

'اس لیے کہ وہ تمہارا دوست ہے' میاں صاحب نے کہا۔

میں نے انہیں بتایا کہ سبط حسن میرے دوست ضرور ہیں مگر اس پیشے میں انہیں میں اپنا استاد مانتا ہوں اور یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں اردو یا انگریزی کی صحافت میں ان سے بڑا شاید کوئی دوسرا نام موجود ہو۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میاں صاحب نے سبط حسن کو میرے کہنے پر لیل و نہار کا ایڈیٹر مقرر کیا، ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے بعد بھی متعلقہ لوگوں سے بحث مباحثہ کرتے رہتے، دوسروں کی سنتے، اپنی رائے دیتے اور بالآخر اپنے فیصلے کو اجتماعی فیصلہ بنا کر لاگو کرتے، میری رائے اب بھی یہی ہے کہ انہوں نے سبط حسن کو ایڈیٹر مقرر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کرلیا تھا، محض ہماری رائے معلوم کرنے اور اپنے فیصلے کو مزید پختہ کرنے کے لیے ہم سے مشورہ کر رہے تھے۔

بہرحال 'لیل و نہار' سبط حسن کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے معیار اور محاسن کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ یہ رسالہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اس ملک کا کوئی ہفت روزہ اس کے معیار کو چھو تک نہیں سکا۔ میں یہاں اس زمانے میں سبط حسن کی ذاتی زندگی کا ذکر کرونگا۔ 'لیل و نہار' کی اشاعت کے دو تین برس میں سبط حسن کو پہلی بار سکون سے کام کرنے کا موقعہ ملا اور ان کے ذاتی اور قریبی دوستوں کے علاوہ دوسروں کو بھی پہلی بار ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلا۔

یہ تین برس ہم نے ایک ہی دفتر میں گذارے، دوپہر کا کھانا احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، ظہیر بابر در میں قاسمی صاحب کے کمرے میں کھاتے اور کھانے کا یہ سیشن تبادلۂ خیالات اور لطیفہ بازی کے لیے مخصوص ہوتا، فیض صاحب بھی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آ گئے اور 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور 'لیل و نہار' کے چیف ایڈیٹر کے طور پر ان کا نام آنے لگا مگر کچھ ہی عرصے بعد بوجوہ وہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں سبط حسن کی ذاتی زندگی میں ایک زبردست نقلاب آیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، سبط حسن برصغیر کی آزادی سے کئی برس قبل اپنا گاؤں، بیوی، بچی، غرض کہ رشتہ دار سب ہی کچھ چھوڑ کر، اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل کے لیے لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی اور نیویارک میں رہے، ایک دفعہ گھر چھوڑا پھر اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا، نیویارک سے ہی لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنے قریب ترین دوستوں سے بھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک میرا ان کا شب و روز کا ساتھ رہا مگر میرے ساتھ بھی انہوں نے اپنے اہل خاندان کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس دور میں وہ ایک طرح سے ہمارے خاندان کا حصہ تھے، ۱۹۵۶ء میں میری شادی ہوئی، میں بوجوہ اس وقت شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے بڑے بھائی مرحوم اور میری بہن نے سبط حسن کو درمیان میں ڈالا اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں بڑی بچیوں کی ولادت ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں ہوئی جب میرا اور سبط حسن کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ ان کے سامنے پلیں بڑھیں اور ان کو گھر کے فرد ہی کی طرح جانتی تھیں۔ ان کی ذات اور ان کے خیالات کے سوا ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور سنا تھا کہ اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ان کی جاگیر میں تھا جسے وہ بیوی اور بچی کے حوالے کر کے گھر سے نکل گئے تھے اور یہ اعلان کر گئے تھے کہ اب اس گھر یا جاگیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ برس ہا برس تک کسی سے ملے ہی نہیں۔

'لیل و نہار' کی ادارت کے زمانے میں انہیں کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانا تھا، روانگی کی تیاریوں کے وقت البتہ انہوں نے پہلی بار مجھ سے کہا کہ ان کی بیٹی ڈھاکہ میں ہے۔ وہاں وہ اسے ملیں گے۔

سبط حسن جب نوشابہ کو چھوڑ کر گھر سے نکلے تھے اس وقت وہ تین چار برس کی بچی تھی، اب وہ ڈھاکہ پہنچے تو بیٹی بی۔ اے میں پڑھتی تھی، ہم لوگ تاریخی ملاقات دیکھنے کے لیے وہاں موجود تو نہیں تھے مگر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ یہ کیسی ملاقات ہو گی۔ ڈھاکہ میں نوشابہ اپنے ایک خالو کے ہاں مقیم تھی جو ایک انتہائی مہذب، لائق اور اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ بظاہر ان ماں بیٹیوں کو وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن یہ بچی غالباً باپ کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ محسوس کرتی تھی۔ ایسی سہیلیوں سے مل کر جن کے ماں باپ ان کے ساتھ تھے وہ اور بھی اُداس اور دکھی ہو جاتی تھی چنانچہ سبط حسن ڈھاکہ پہنچے تو بچی نے ان کو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑا، وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر

کالج گئی، پرنسپل اور پروفیسروں سے ملایا۔ اپنی تمام سہیلیوں اوران کے اہل خاندان سے ملاقات کرائی اور سائے کی طرح ان کے قیام ڈھاکہ میں ان کے ساتھ چپکی رہی، خود سبط حسن بھی اس سے علیحدہ ہونے کو تیار نہیں تھے، سبط حسن اپنی واپسی کا پروگرام دو چار روز تک ٹالتے رہے لیکن جب بالآخر آنے لگے تو نوشابہ نے ان کے ساتھ لاہور جانے کا اعلان کر دیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ 'لیل ونہار' کی ادارت کے زمانے میں انہوں نے نقی بلڈنگ کا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور سمن آباد منتقل ہو گئے تھے، ہم سب دوستوں بالخصوص میرے گھر والوں کے لیے سبط حسن کے گھر پر ان کی بیٹی کی آمد ایک زبردست اور خوش گوار تبدیلی تھی، بچی کو چند روز بعد کینئرڈ کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان کا مارشل لاء پورے زوروں پر تھا۔ لیکن 'امروز'، 'پاکستان ٹائمز' اور 'لیل ونہار' چلانے والی کمپنی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر ابھی ایوب حکومت نے قبضہ نہیں کیا تھا، فیض صاحب دو تین برس باہر گذار کر دوستوں کے منع کرنے کے باوجود وطن واپس آنے والے تھے اور ہم سب کو ان کا شدت سے انتظار تھا لیکن ان کی آمد سے قبل ہی سبط حسن اور احمد ندیم قاسمی کو ایک دفعہ پھر گرفتار کر لیا گیا، چند روز بعد فیض صاحب لاہور آئے تو اگلے ہی دن انہیں بھی پکڑ لیا گیا۔

سبط حسن کی گرفتاری کے بعد نوشابہ اکیلی رہ گئی، سبط حسن کے لیے جیل کے یہ دن بہت سخت تھے، مجھے معلوم ہوا کہ وہ بچی کی وجہ سے پریشان ہیں ورنہ جیل ان کے لیے نئی بات نہ تھی، میں نے جیل میں ان سے چوری چھپے ملاقات کر کے بہت لعن طعن کی اور کہا کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو بچی کے بارے میں کیوں پریشانی ہے؟ بہرحال اس ملاقات کے بعد وہ مطمئن ہو گئے، بچی ہمارے ہاں آ گئی اور وہاں سے اسے کینئرڈ کالج کے ہوسٹل میں بھجوا دیا گیا۔

خوش قسمتی سے یہ سب لوگ دو ڈھائی ماہ بعد ہی رہا ہو گئے۔ اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ نوشابہ جو باپ کے ساتھ آ گئی تھی اپنی ماں کے لیے اُداس رہنے لگی۔

خاندان تو اکٹھا ہو گیا تھا مگر سبط کے امن وسکون کے یہ تین چار برس ختم ہو گئے۔ ایوب حکومت نے ۵۹۔۱۹۶۰ء میں 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور 'لیل ونہار' پر قبضہ کر لیا۔ جس حکم نامے کی رو سے ان اخبارات کو چلانے والے ادارے کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تھا اس میں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اسٹاف میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا اور یہ کہ اس ادارے میں کام کرنے والے سب ہی صحافی بدستور کام کرتے رہیں گے۔ سبط حسن کو البتہ اسی روز فارغ کر دیا گیا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میں

سینکڑوں صحافی کام کر رہے تھے، حکومت کی کوشش اور خواہش یہ تھی کہ سب لوگ کام کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ جب مظہر علی اور احمد ندیم قاسمی نے 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' کی ادارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو کئی روز تک ان کو واپس لانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ البتہ سبط حسن کی برطرفی غالباً نئے مقرر ہونے والے ایڈمنسٹریٹر مرحوم سرفراز کا پہلا تحریری حکم نامہ تھا جو انہوں نے چارج لینے کے بعد جاری کیا۔

مرحوم سرفراز احمد پرانے صحافی اور منجھے ہوئے بیوروکریٹ تھے، انہوں نے برطرفی کا حکم نامہ دینے کے لیے سبط حسن کو اپنے کمرے میں بلایا اور یہ پیش کش کی کہ حکومت انہیں زمین مکان اور کارخانہ تک الاٹ کرنے کو تیار ہے، کوئی دوسرا کام بھی جو ان کی معاش کے لیے موزوں ہو دیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہیں لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ملک کے اخبارات اور رسائل کے دروازے ان پر بند ہیں، اس کے سوا وہ جو مانگیں انہیں مل جائے گا۔ 'لیل و نہار' کے دو تین برس کے شماروں کے علاوہ غالباً حکومت کے پاس ان کی زوردار تحریروں کے کچھ اور بھی ثبوت موجود تھے۔ مثلاً 'انقلاب چین زندہ باد' انہوں نے لکھا تھا جس پر کسی کا نام نہ تھا اور جسے حکومت پنجاب نے ضبط کر لیا تھا اور اسی ضبطی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مہینوں مقدمہ چلتا رہا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں گرفتاری سے قبل وہ تین چار برس 'زیرزمین' رہے تھے اس لیے ان کی تحریروں پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے بعد سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر پر لاہور کے شاہی قلعہ میں تشدد کیا گیا اور اس طرح دیگر معلومات کے علاوہ تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہوئی ان تحریروں کے لکھنے والے کی بھی نشان دہی ہو گئی تھی چنانچہ حکومت کا فیصلہ تھا کہ اس آدمی کو لکھنے اور اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے ذرائع سے محروم کر دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو کوئی اور کام کرنے اور حکومت کی طرف سے ہر سہولت مہیا کرنے کی پیش کش کی گئی اور کہا گیا کہ جس دشت کی سیاحی میں انہوں نے اپنی عمر گزاری ہے اس سے کنارہ کش ہو جائیں، سبط حسن سرفراز صاحب کا شکریہ ادا کر کے پی پی ایل کی سیڑھیوں سے اتر گئے۔ اس پیش کش کا تذکرہ انہوں نے میرے سوا غالباً کسی سے نہیں کیا کیوں کہ ان کی وفات کے بعد جب میں نے یہ بات کی تو ان کے گھر والوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ سبط حسن نے اس سارے زمانے میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

سبط حسن کے لکھنے پڑھنے پر پابندی کے بارے میں سب سے اچھا تبصرہ مادام نور جہاں کا تھا۔

انہوں نے اسی زمانے میں ایک روز مجھ سے سبط حسن کی خیریت پوچھی تو میں نے بتایا کہ سرکار انہیں مال و دولت، زمین، مکان کارخانہ سب ہی کچھ دینے کو تیار ہے مگر انہیں لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مادام نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر دو منٹ بعد بڑی بلند آواز میں بولیں 'ہائے! یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی مجھ سے کہے تم گا نہیں سکتیں۔'

'لیل و نہار' سے برطرفی کے بعد سبط حسن کے لیے زندہ رہنے، مکان کا کرایہ دینے اور کچھ چلانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے دوست اور ہم سب کے محترم روشن علی بھیم جی نے انہیں کراچی آنے اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں اپنی مرضی کا کام کرنے کی پیش کش کی مگر سبط کسی قیمت لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، لاہور میں دو تین برس دھکے کھانے کے بعد بالآخر انہیں کراچی جانا پڑا اور میں سمجھتا ہوں کہ سبط حسن نے زندگی کے آخری دس بارہ برس میں جو ٹھوس علمی کام کیا ہے اس کا سہرا سبط حسن روشن علی بھیم جی اور مکتبہ دانیال کے ملک نورانی کے سر ہے۔ روشن علی بھیم جی نے انہیں جم کر کام کرنے کا موقع دیا اور ملک نورانی نے ان کی بظاہر خشک علمی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی، عام پبلشر ادبی کتابیں شائع کرنے سے ڈرتے ہیں مگر ملک نورانی جو خود ترقی پسند ذہن رکھتے ہیں سبط حسن کی تمام کتابوں کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ میری یہ ایماندارانہ رائے ہے کہ سبط حسن یہ فکری کام بھیم جی اور ملک نورانی کے تعاون کے بغیر اتنی خوبصورتی کے ساتھ شاید ہی کر سکتے۔

کراچی وہ بالکل مجبور ہو کر گئے تھے۔ 'لیل و نہار' سے برطرفی کے بعد انہوں نے لاہور میں تقریباً دو برس بہت برے حالات میں گذارے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں انہوں نے بہت سے کام اپنی طبیعت کے خلاف کیے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست اے۔ رحمٰن کی ایک فیکٹری میں وہ بطور لیبر ویلفیئر آفیسر کام کرتے رہے، رحمٰن امپریل الیکٹرک کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سبط حسن کے پرانے دوست ہیں۔ انہوں نے سبط حسن کو یہ پیش کش محض اس لیے کی تھی کہ وہ جانتے تھے سبط حسن بغیر کام کیے کسی سے بھی کسی قسم کی مالی اعانت حاصل نہیں کریں گے، ان کی یہ فیکٹری 'ایمکو' اس زمانے میں 'منٹ' لاہور کے پاس تھی اور ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھی، سبط حسن نے اس کے قیام میں بڑی محنت کی اور مزدوروں کے حقوق کے لیے اپنے اس دوست سے مسلسل دنگا فساد کرتے رہے۔ اس کے بعد کافی مدت تک انہوں نے فیروز سنز کے ساتھ کام

کیا، یہ کام اگر چہ نسبتاً بہتر تھا، مگر یہاں بھی وہ دوسروں کے مرضی کے تابع رہ کر کام کرنے کی وجہ سے خاصے پریشان رہے، پھر چند ماہ وہ ہمارے مشترکہ دوست نواب مظفر علی قزلباش مرحوم کے بھتیجے اور ہونے والے داماد کے اتالیق رہے۔ یہ سب کام انہوں نے اپنی معاشی ضروریات کے لیے کیے، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے جہاں بھی اور جو کام بھی کیا اس میں اپنی بھرپور اور بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہر کام محنت، نیک نیتی اور دیانت داری سے کیا اور ہر جگہ سے خود ہی کام چھوڑ کر علیحدہ ہوئے۔ کہیں ان کا خیال تھا کہ وہ جتنا معاوضہ پا رہے ہیں، کرنے کا کام اس سے کم ہے، کہیں وہ بور ہو کر تنگ آ کر علیحدہ ہوئے۔ یہ سارے کام وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے نہیں بلکہ محض پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کرتے رہے مگر ذہنی طور پر پریشان رہے۔ اس پریشانی کا ذکر انہوں نے کبھی کسی دوست سے نہیں کیا، بظاہر خوش باش اور اپنے حال میں مست نظر آتے تھے لیکن آہستہ آہستہ لاہور میں جسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے ان پر معاشی مشکلات کا بوجھ اتنا بڑھا دیا گیا کہ بالآخر انہیں کراچی جانا پڑا۔

کراچی میں ان کے ابتدائی دو تین برس ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے محکمہ تعلقات عامہ کے سربراہ کی حیثیت سے اس شعبے کو فعال اور مؤثر بنانے میں گذرے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہاں بھی انہوں نے متعدد کارنامے سرانجام دیے، تعلقات عامہ کے کام کو ایک نئی جہت عطا کی اور نئے نئے اور مؤثر سلوگن ایجاد کیے۔ جب یہ کام سیٹ ہو گیا تو تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی اور زندگی کے آخری دس بارہ برس میں متعدد معرکۃ الآرا تصانیف مکمل کیں۔

سبط حسن کے کراچی چلے جانے کے بعد ہمارا ان سے رابطہ ویسا نہ رہا جیسا کہ برسوں سے چلا آ رہا تھا، کبھی وہ اپنے کام سے لاہور آتے تو ان کی آمد ہوا کے تازہ اور ٹھنڈے جھونکے کی مانند محسوس ہوتی۔ دوست احباب جمع ہوتے، محفلیں جمتیں اور سبط حسن ہمیشہ اس شہر کو چھوڑنے پر افسردہ ہو جاتے۔ ان کا کہنا تھا وہ لاہور آنے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں اور یہاں آنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس زمانے میں، میں بھی کئی بار کراچی گیا اور جب تک وہ سوسائٹی میں رہائش پذیر رہے، ہمیشہ انہی کے ہاں ٹھہرا۔ اتفاق سے ساٹھ کے عشرے میں فیض صاحب بھی کراچی ہی میں تھے، چنانچہ ہم سب لوگ سرشام جمع ہو جاتے، مرحوم زیڈ اے بخاری، مرحوم مجید ملک اور بہت سے دوسرے احباب ان محفلوں میں علم و آگہی کے موتی بکھیرتے، شعر و

نغمہ کی گفتگو ہوتی۔ ملکی حالات پر تبصرہ ہوتا اور سب سے زیادہ ذکر لاہور اور یہاں کے دوستوں کا رہتا، آخری پانچ چھ برس کے دوران جب سبط حسن گلشن اقبال اپنے مکان میں منتقل ہو گئے ان کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا اس پر کہ یہ گھر شہر سے کافی دور تھا مگر اس زمانے میں بھی کراچی پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ان کے دفتر قمر ہاؤس جانا ہوتا۔ ہم نے کراچی جانے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، ہمیشہ یہ خیال ہوتا کہ وہاں ابن انشاء اور سبط حسن سے ملیں گے۔ انشا جی بہت پہلے چلے گئے۔ اب سبط حسن بھی گئے۔ میرے لیے کراچی اب ویران شہر ہے، وہاں جا کر پرانی یادیں ستاتی ہیں اور زخم تازہ ہو جاتے ہیں، اتنے ساتھی، دوست رفیق اور ہمدم چلے گئے ہیں کہ یہ دنیا اب سونی سونی سی نظر آتی ہے۔

گذشتہ برس یعنی ۱۹۸۵ء میں سبط حسن سے ملاقات کے نسبتاً زیادہ مواقع ملے، وہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہونے والی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں بہت سرگرم رہے۔ اس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور کراچی اور لندن میں ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں، پھر وہ کراچی کانفرنس کی تقریبات کے سلسلے میں دوبار لاہور آئے، دوستوں کو جمع کیا اور نوجوانوں کو خاص طور پر آگے بڑھنے اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کیا۔ کراچی کانفرنس کے دوران میں کچھ نوجوان خاص طور سے سندھ اور بلوچستان سے آنے والے مندوبین نے جب اپنی تقریروں میں ہم سب پرانے لوگوں بالخصوص سبط حسن کو میانہ روی اور مصلحت کیشی کے طعنے دیے اور میں نے ان کا جواب دینے کا ارادہ کیا تو سبط حسن نے مجھے منع کیا اور کہا 'بھائی ان لوگوں کو دل کا غبار نکال لینے دو، انہوں نے اس زمانے میں بہت اذیتیں برداشت کی ہیں۔ بہت مار کھائی ہے اس لیے وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔'

کراچی کانفرنس میں بعض نوجوانوں نے سبط حسن کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی لیکن گذشتہ دو تین برس سے وہ ایک ہی بات کہتے تھے 'ہم سب کا کام روشن خیال سائنسی فکر اور ترقی پسندانہ خیالات کو فروغ دینا ہے کیوں کہ رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں کی کوشش اس ملک کو دو چار سو سال پیچھے لے جانے کی ہے۔ یہ لوگوں کو روٹی روزگار کے مسائل سے الگ کر کے خیالی جنتوں کے تصور سے بہلا رہے ہیں۔ یہ موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہیں اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کو فکری اور ذہنی انقلاب کے لیے تیار کیا جائے' خود انہوں نے زندگی

کے آخری چند برسوں میں یہی کام کیا، وہ نہ کسی تحریک کے سربراہ تھے اور نہ نام نمود کی خواہش رکھتے تھے البتہ اس مشن کی تکمیل کے لیے جسے انہوں نے اوائل عمر میں اپنایا تھا زندگی کی آخری سانس تک کام کرتے رہے۔

کراچی میں انہوں نے احباب کا ایک بہت وسیع حلقہ پیدا کرلیا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا اس لیے کہ ان سے ملنے والے ان کی سحر انگیز شخصیت کے گرویدہ ہوجاتے، وہ ذہنی اور جسمانی ہر لحاظ سے سرتاپا جمال ہی جمال تھے، ان کی خوبصورت سوچ اور دلآویز شخصیت کا طلسم ایسا نہ تھا کہ وہ ملنے والوں کو متاثر نہ کرتا، وہ چاہتے تو دنیاوی مال و دولت کے ڈھیر لگا لیتے لیکن ان کی زندگی درویشانہ تھی، کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، کبھی اپنی افتاد طبع کے خلاف کوئی کام نہیں کیا اور مصلحت کوشی اور مفاد پرستی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کے چاہنے والوں اور نیازمندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، آخری دو تین برس میں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنہائی اور گوشہ نشینی ترک کررہے ہیں، جو نوجوان ان سے کچھ پوچھنے اور سمجھنے کے لیے آتے تھے ان سے وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ بہت مہذب، خلیق، نازک مزاج، نفاست پسند اور انتہائی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی رحلت نے ہم سے ہمارا بہت بڑا سرمایہ چھین لیا ہے، مگر اپنی تحریروں کی شکل میں جو سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہیں وہ برسوں تک آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

maablib.org

دانشور

فارغ بخاری

کچھ لوگ اپنی ذات میں ایک دبستان، ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک ہوتے ہیں، سچ پوچھیے تو گنتی کے ایسے حضرات ہی حقیقی معنوں میں دانشور کہلانے کے مستحق ہیں۔ سبط حسن صاحب ہمارے ادب کی وہ متاع عزیز ہیں جو انہی گنے چنے ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے سر پر کلاہ دانشوری سجتا ہے، زیب دیتا ہے، فخر محسوس کرتا ہے، ہمیں فیض احمد فیض اور سبط حسن کا تصور ہمیشہ انجمن کے طور پر آیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ فیض صاحب کی طرح سبط صاحب بھی ہمیشہ اپنی ذات میں انجمن رہے سدا اپنے جلوس علم و دانش کا کارواں لیے رواں دواں نظر آئے۔

سبط حسن سے ہمارا تعارف قیام پاکستان کے بعد ہوا۔ اس طویل عرصہ میں گرچہ ہماری ملاقاتیں مختصر رہیں لیکن ذہنی اور نظریاتی رشتے گہرے ہوتے گئے۔ ہم بار ہا ایک ساتھ گرفتار ہوئے۔ اگرچہ ایک جگہ سے گرفتاری نہیں ہوئی، ایک جیل میں نہیں رہے، لیکن ایک دن ایک وقت اور ایک ہی جرم میں ایک جیسی سزائیں اور وہ جرم صداقتِ اظہار تھا استحصال اور طبقاتی تفریق کے خلاف قلمی جدوجہد، غیر عادلانہ نظام حکومت کے ساتھ ساتھ تھا، محنت کشوں کی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھانا تھا۔ جو خدایانِ مملکت کو ناگوار گزرتا تھا اور وہ ہماری آواز کو دبانے کے لیے ہمیں آہنی سلاخوں کے پیچھے چھوڑ کر اپنا پنڈ چھڑانا چاہتے تھے لیکن آواز کو کون قید کر سکتا ہے، یہ غنیمت ہے کہ کچھ کام انسانی بس کے نہیں ورنہ ظالم و جابر طبقہ شاید ہوا، پانی اور روشنی سے بھی غریبوں کو محروم

یہ مضمون 'طلوعِ افکار' کے اپریل ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا (مرتب)۔

کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ خدا اور انسان کے مکالمے میں علامہ اقبال خدا کی طرف سے انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

تبر آفریدی نہالِ چمن را　　　قفس ساختی طائر نغمہ زن را

یہ تو درختوں اور پرندوں کی بات ہے خود مٹھی بھر انسانوں کے برہمن طبقے نے جو عام انسانوں کی اکثریت کا حشر نشر کیا ہے اور اب تک کر رہا ہے اس کا اقبال کو بھی شاید خیال نہ رہا کہ خدا کو متوجہ کرتا۔ البتہ علامہ اقبال نے خدا کے جواب میں انسان کے 'در مدحِ خود' جو کچھ کہلوایا ہے مثلاً:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و زاغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

سائنسی ترقی کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے، لیکن اس سائنسی ترقی و عروج کے دور میں بھی انسان کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال کا پہلے سے کہیں زیادہ چلن دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ آخر انسانوں نے ایسی کیا ترقی کی ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔ سوائے اس کے کہ چند بڑی طاقتیں (Nuclear) اور (Star War) کی جوہری توانائی تخلیق کر کے ساری دنیا کو اپنے گھٹنے کے نیچے دبا کر بیٹھ گئی ہیں۔

معاف کیجئے گا میں خیالات کی رو میں کہیں سے کہیں نکل گیا لیکن موضوع سے نہیں بھٹکا، سبط صاحب نے جو عالمانہ کتابیں لکھی ہیں ان کا بنیادی موضوع یہی ہے، انہوں نے تخلیقی کام کی طرف توجہ دینے میں بہت تاخیر کر دی لیکن 'دیر آید درست آید' پر عمل کر کے دکھایا یعنی اس تاخیر کی خاطر خواہ تلافی کر دی۔ انہوں نے جو فیلڈ اپنے لیے چنا وہ تحقیق و تنقید کا میدان ہے جو شاید سب سے مشکل کام ہے لیکن اب محسوس ہوتا ہے جیسے شاید صرف سبط صاحب ہی کر سکتے تھے۔ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے رجحان کے مطابق موضوعات کا انتخاب کیا اور یہ کچھ ایسا وقتِ نظر کا کام تھا، جسے شاید صرف سبط صاحب ہی کر سکتے تھے ویسے اردو ادب میں مشرقی تہذیبوں پر تحقیق کا خانہ بھی اب تک بالکل خالی پڑا تھا۔ حالانکہ ہم مشرقی تہذیب کے گن گاتے نہیں تھکتے لیکن کسی کو اس طرف توجہ دینے کی توفیق نہیں ہوئی اور یا اس جان جوکھوں کے کام میں کسی کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بہر حال سبط صاحب کی یہ تخلیقات ہمارا اتنا قیمتی قومی اور تہذیبی ورثہ ہیں جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔

کہتے ہیں کہ بڑے دانشوروں کو دیکھنا ہو تو کتابوں میں دیکھئے کہ ان کا قد و قامت تحریروں سے ہی کھلتا ہے۔ اور عموماً بالمشافہ ملاقات میں مایوسی ہوتی ہے۔ اس کا ہمیں بڑا تلخ تجربہ ہے۔ کئی

بزرگوں کو پڑھ کر ان کی جو ہمالہ صفت شخصیت ذہن وفکر میں ابھری، ملنے پر سارا تاثر غارت ہو گیا۔ اور پچھتاتے رہے کہ نہ ملتے تو اچھا تھا۔ لیکن فیض صاحب کی طرح سبط صاحب میں یہ عجیب بات دیکھی کہ وہ اپنی گرانمایہ تصانیف میں جتنے لحیم وشحیم لگتے ہیں، ان کی شخصیت بھی کسی طرح اس سے کم قد آور نہیں بلکہ ہمارے ساتھ تو یہ ہوا کہ بلا مبالغہ کتابوں سے شخصیت میں اور شخصیت سے زیادہ کتابوں سے ان کی عظمت کا احساس ہوا۔

فیض صاحب سے جب کبھی ان کا ذکر ہوا انہوں نے ہمیشہ سبط صاحب کے علم و دانش کی تعریف کی اور ان کی نظریاتی پختگی اور قربانیوں کو سراہا۔

سبط صاحب نہایت سنجیدہ، فہمیدہ، معاملہ فہم اور مرنجانِ مرنج انسان ہیں ہم اُن کے علم وفضل کا شہرہ سن چکے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان آئے تو خوشی ہوئی لیکن ایک عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی اور کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے سامنا کرنے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا تھا، فیض صاحب کے متعلق بھی ایسا ہی تھا۔

ابتداء میں دو مرتبہ انہوں نے بلایا اور میں نہیں جا سکا لیکن انہوں نے ہمارا حجاب خود ہی دور کر دیا۔ ایک دن تار ملا کہ صبح کی گاڑی سے آ رہے ہیں اور انہیں وصول کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اسٹیشن جانا پڑا وہ پوسٹ مین ٹریڈ یونین کے صدر تھے اور ان کے اجلاس میں آ رہے تھے۔ انہیں گھر لایا ایک شب و روز رہے پھر گاڑی میں بٹھا کر رخصت کر آیا۔ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شروع میں میرے ہاں ٹھہرتے تھے پر ان کی ہدایت پر گرین ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا۔ لیکن وہ ایک شب و روز سے زیادہ کبھی نہیں ٹھہرے، اس لیے کہ وہ اُن دنوں 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر تھے اور دفتر سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ اخبار کا کام ہی ایسا ہے خصوصاً ہمارے یہاں تو ہر دور میں اخبار کے ایڈیٹر کو ہمیشہ کسی وقت بھی کوئی بری خبر سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا پڑتا ہے۔ پھر فیض صاحب تو دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد فوجی ہیڈ کوارٹر سے سیدھا اخبار کے دفتر میں پہنچے تھے (بلکہ انہوں نے فوجی وردی بھی وہیں آ کر اتاری تھی) اور اخبار بھی اتنا اہم جو پاکستان کی آبرو تھا اس لیے انہیں خاصا چوکس رہنا پڑتا تھا۔

سبط صاحب سے بھی جلد ہی ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ جب وہ ہفت روزہ 'لیل و نہار' کے ایڈیٹر تھے تو ان سے خط و کتابت بھی رہی۔ ہم اس پرچے میں مسلسل لکھتے بھی رہے۔ لیکن اپنا پہلا

مضمون ہم نے ڈرتے ڈرتے انہیں دیا حالانکہ ہم اس سے پہلے روز نامہ 'امروز' کے ادبی ایڈیشن میں نہایت باقاعدگی سے چھپ رہے تھے، جس میں فیض صاحب بھی خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی توجہ اور مولانا چراغ حسن حسرت کی مدیرانہ صلاحیتوں نے صحافت کی تاریخ میں پہلی دفعہ صحافت سے ادب کا تعارف کرایا اور 'امروز' کے ادبی ایڈیشن کو ایسی معیاری سطح پر پیش کیا کہ اب تک ادب دوست حضرات ان کا ذکر بڑے ارمانوں سے کرتے ہیں۔ ان ادبی ایڈیشنوں کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ ان کی وجہ سے پاکستان کے تمام روز ناموں میں ادبی ایڈیشنوں نے رواج پایا۔

لیکن سبط حسن صاحب کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی تحریروں اور ان کے تجربۂ علمی سے ہم اسقدر مرعوب تھے کہ جب تک وہ مضمون 'لیل و نہار' میں شائع نہ ہوا یہی کھٹکا رہا کہ وہ ردی کی نذر ہو چکا ہوگا۔ اور جب وہ چھپ کر آیا تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا یوں لگا جیسے ہمیں کسی یونیورسٹی سے نثر لکھنے کی ڈگری مل گئی ہو۔ لیکن لاہور میں 'لیل و نہار' بند ہونے کے بعد جب کراچی سے سبط حسن صاحب نے فیض صاحب کی معیت میں 'لیل و نہار' کا اجراء کیا اور انہوں نے ہمیں کالم لکھنے کے لیے خط لکھا تو یقین کریں یہ ہمارے لیے بہت بڑی سعادت تھی جس کا ہمیں یقین نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ ہم اس سے پہلے گزشتہ تین سال سے روز نامہ جنگ، راولپنڈی میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے تھے اور ابتدا ہی سے کئی روز ناموں اور ہفت روزہ اخباروں میں کام کرتے رہے تھے۔ لیکن 'لیل و نہار' کراچی جو سبط صاحب کی ادارت اور فیض صاحب کی سرپرستی میں شائع ہو رہا تھا ایسے پرچے میں سبط صاحب کا کالم لکھنے کے لیے ہمیں کہنا ہما۔ ے لیے اتنا بڑا اعزاز تھا جس کا ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے اور سچ پوچھئے تو اس کے بعد ہی ہم نے باقاعدہ نثر نگاری کو اپنانے کا ڈول ڈالا۔

اس کے علاوہ بھی ہم نے فیض صاحب اور سبط صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ اپنے سوشلسٹ نظریات سے وفاداری، انسان دوستی، حق گوئی و بے باکی، اپنے اصولوں کے لیے ایثار و قربانی کے پل صراط سے ثابت قدمی کے ساتھ گزرنا، پرورشِ لوح و قلم، اپنی ذات کی بجائے اپنے ملک کی آزادی و خودمختاری، اپنے آدرش کے تحفظ اور بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے زندہ رہنا اور مرنا، پرچے تو خیر جاری اور بند ہوتے رہتے ہیں لیکن 'لیل و نہار' لاہور...... کو سبط صاب نے جس جدت طرازی اور نئے اسلوب سے آراستہ کر کے نکالا اس سے ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ پھر جب کراچی سے 'لیل و نہار' جاری کیا تو اس میں مزید اضافے اور کچھ نئے رنگ

اپنا جادو جگاتے دکھائی دیے۔ اس کے بعد محترمہ سعیدہ گزدر نے کراچی سے 'پاکستانی ادب' کا اجرا کیا تو اس ادبی ماہنامے کو بھی سبط حسن صاحب کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ پرچہ بھی سال دو سال کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا لیکن ادبی پرچوں کے ہجوم میں 'پاکستانی ادب' کی بھی اپنی شناخت تھی۔ ان پرچوں کے بند ہونے سے واقعی ادب دوست حلقوں کو بڑا اشاق ہوا اور اب تک ان پرچوں کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔

سبط صاحب کا ایڈیٹوریل ان پرچوں میں ایسے خاصے کی چیز تھی، جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا۔ کیا خوبصورت نثر لکھتے ہیں، چھوٹے چھوٹے فقرے جن میں، جیسے لفظوں کی جگہ موتی پروئے ہوں، گہری معنویت لیے ہوئے، جیسے طلسمی مٹھائی بانٹ رہے ہوں، جیسے کوئی حکایت لذیذ بیان کر رہے ہوں...... جیسے...... جیسے لفظوں میں شہد گھول رہے ہوں۔

سبط صاحب ایک مشفق دوست اور مہربان ساتھی ہیں۔ ان کی شخصیت فیض صاحب کی طرح دھلی دھلائی، پاک و صاف، محبوب اور دلدار ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ فیض صاحب سے تھوڑا بہت فری ہو سکتے ہیں، ان سے ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ویسے انہوں نے ایسا کوئی آرڈی نینس نہیں لگا رکھا تھا وہ تو اتنے اچھے ہیں کہ جب کبھی کسی آفیشل کام سے مختصر وقت کے لیے بھی پشاور آئیں فون کر کے ضرور ہوٹل میں بلا لیتے ہیں یعنی ملے بغیر نہیں جاتے۔

سبط صاحب کی کم آمیزی سے بعض احباب کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ وہ دوستوں سے گھل مل جانے کے قائل نہیں بلکہ کچھ فاصلہ رکھ کر ملنا پسند کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا بالکل نہیں ہے وہ تو اپنے ساتھیوں کو اپنا فیملی ممبر سمجھتے ہیں اور ہمیشہ عزت و احترام دینے میں فراخدل رہے ہیں۔ ویسے وہ ایسے زاہد خشک بھی نہیں، بڑے زندہ دل اور رنگین مزاج ہیں، لیکن ان کے یہ جوہر بقول غالب 'رکھ دے کوئی پیمانہ صہبا میرے آگے'...... کے بعد ہی کھلتے ہیں۔

سبط صاحب کو ہم نے قریب سے دیکھا تو انہیں بلاشبہ ایک بے بہا انسان پایا۔ ان کی شائستگی نے پہلی ملاقات ہی میں سچ مچ بے دام خرید لیا۔ ان کی دلنواز شخصیت میں بیک وقت کئی اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ انہیں ملتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے ان سے باتیں کرتے ہوئے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم سے ایک محبت و عظمت کا پیکر انسان مخاطب ہے، ان کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ ان میں منافقت کا ڈھونگ نہیں، خودنمائی کا سوانگ نہیں، ان کی

شرافت میں خودغرضی کی ملاوٹ نہیں۔ جھوٹ کا کھوٹ نہیں......وہ سیدھا صاف اور کھرا انسان ہے صرف ایک چہرے والا انسان......

فیض صاحب کی وفات کے بعد ترقی پسند ادبی حلقوں اور علم دوست احباب کے لیے فقط ایک سبط صاحب کی ذات ہی ان کا نعم البدل ہوسکتی ہے اور انہی سے سب کی توقعات وابستہ ہیں۔ ہم بار بار فیض صاحب سے انہیں اس لیے بریکٹ کرتے رہے ہیں کہ یہ علم و دانش، عقل و شعور، اعتدال پسندی، معقولیت، عوام دوستی، انسان دوستی، فکر و نظر اور رہنمایانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ترقی پسند حلقوں میں ان کا قائم مقام ہونے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔

maablib.org

سیّد سبطِ حسن بہت اچھے آدمی تھے، بہت بڑے آدمی تھے

شوکت صدیقی

سبطِ حسن سے میرا پہلا رابطہ اس وقت ہوا جب انہوں نے لاہور سے 'لیل و نہار' نکالا اس سلسلے میں ان سے خط و کتابت رہی۔ وہ 'لیل و نہار' کے سلسلے میں کراچی آئے تو ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ادارہ 'لیل و نہار' میں شمولیت اختیار کروں مگر میں کراچی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے معذرت کر لی۔ میں ان دنوں 'ٹائمز آف کراچی' میں کام کرتا تھا۔ ان سے میرا غائبانہ تعارف بہت پہلے کا تھا۔ میں انہیں ایک مارکسسٹ دانشور، ایک کمیونسٹ لیڈر اور ایک ٹریڈ یونینسٹ کے طور پر پہلے سے جانتا تھا۔

سبطِ حسن کا سب سے بڑا وصف جس نے انہیں عظمت اور عزت عطا کی وہ اپنے نظریۂ حیات پر ان کا کمٹ منٹ تھا۔ اس کے لیے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ پاکستان میں پہلی بار راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ اور سخت گرمی کے موسم میں انہیں لاہور سے ملتان جیل منتقل کیا گیا۔ جہاں انہیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء لگا تو انہیں گرفتار کر کے پھر جیل بھیج دیا گیا۔ حکومت نے مارشل لاء کے ایک ضابطے کے تحت فوج کے پہرے میں 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور 'لیل و نہار' پر قبضہ کر لیا۔ 'امروز' کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی اور 'پاکستان ٹائمز' کے مظہر علی خان مستعفی ہو گئے جبکہ سید سبطِ حسن کو برطرف کر دیا گیا بلکہ ان کے قریبی رفیق حمید اختر کے مطابق ان اخبارات کے سرکاری ایڈمنسٹریٹر

سبط حسن صاحب کے انتقال کے بعد شوکت صدیقی صاحب کا یہ اظہاریہ ہفت روزہ 'اخبار جہاں' (کراچی) کے ۵ تا ۱۱ رمئی ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا (مرتب)۔

سرفراز صاحب نے سبطِ حسن سے کہا کہ آپ الاٹمنٹ لے لیں، فیکٹری لے لیں، آپ جو کام چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کر سکتے۔ ان پر دو سال تک لکھنے پڑھنے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ انہوں نے ایک فیکٹری میں سپروائزر کے عہدے پر ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن جب حکومت کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو وہ کراچی آ گئے اور یہاں ایسٹرن فیڈرل یونین میں نشرواشاعت اور تعلقاتِ عامہ کے مشیر مقرر ہو گئے۔ یہاں ملازمت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہیں دلجمعی سے پڑھنے اور لکھنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا چار پانچ کتب تصنیف کیں۔

سبطِ مرحوم نے قیامِ پاکستان سے قبل 'نیشنل ہیرالڈ' اور 'پائنیر' لکھنؤ میں کام کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جریدے میں کام کیا۔ جوش ملیح آبادی اس جریدے کے مدیر تھے۔ جبکہ مجاز، علی سردار جعفری اور سبطِ حسن اس کی مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔ یہ جریدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا باقاعدہ ترجمان تھا۔ مگر یہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ ان کے طرزِ تحریر میں جو شگفتگی اور انفرادیت تھی وہ 'لیل ونہار' کی ادارت کے زمانے میں سامنے آئی۔ 'لیل ونہار' کی ترتیب و تزئین، مضامین کا انتخاب، سیاسی تجزیے اور منفرد طرزِ تحریر سے انہوں نے ہفت روزہ صحافت میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور اس کا مزاج بدل دیا تھا۔

سبطِ حسن کم آمیز تھے۔ اگر انہیں کسی سے اختلافِ رائے بھی ہوتا تو وہ نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے اور دلائل سے گفتگو کرتے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنا نقطۂ نظر دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ شدید اختلافِ رائے کے باوجود جھنجھلاہٹ یا تلخی کا اظہار کرتا تب بھی خفگی کا اظہار نہیں کرتے تھے ان کے دشمن کم اور دوست زیادہ تھے۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھے۔ نوجوان ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جو ان سے ملتا تھا وہ ان سے کچھ سیکھ کر ہی اٹھتا تھا۔ ان کی گفتگو کے عالمانہ طرزِ اظہار سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے پاس بہت اچھی لائبریری تھی۔

میرے ذاتی علم کے مطابق ان کی پہلی تصنیف 'شہرِ نگاراں' تھی۔ یہ کتاب حیدرآباد میں ان کی زندگی کی یادوں اور یادداشتوں پر مشتمل تھی اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک ادبی کتاب تھی۔ جس میں انہوں نے شگفتہ انشاء پردازی کا مظاہرہ کیا۔ پھر 'ماضی کے مزار' منظرِ عام پر آئی۔ یہ ایک

تحقیقی کتاب تھی، جس میں انہوں نے قدیم تہذیب اور خاص طور پر بابل اور نینوا کی تہذیب کے گمشدہ گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایران، عراق اور لندن کا دورہ کیا۔ برٹش میوزیم لائبریری میں اس موضوع پر ملنے والی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کئی سال کی روز و شب کی محنت کے بعد اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے 'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' تصنیف کی۔ لیکن ان کی جس کتاب نے زبردست شہرت حاصل کی۔ وہ 'موسیٰ سے مارکس تک' نامی کتاب ہے یہ خالص نظریاتی کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے سائنٹفک سوشلزم کی تشریح اور توضیح کی۔ ان کتب سے ترقی پسند تحریک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔ نوجوانوں پر اس کتاب نے گہرے اثرات مرتب کیے۔

پھر اس سلسلے کی ان کی اہم کتاب 'نویدِ فکر' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مارکسی فلسفہ اور انقلابی نقطۂ نظر پیش کیا۔ انہوں نے 'انقلابِ ایران' نامی ایک زبردست کتاب بھی لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ایران کے مستقبل کے بارے میں جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئیں۔

کراچی میں ترقی پسند ادبی گولڈن جوبلی کانفرنس ہوئی تو ان دنوں مجھے سیّد سبطِ حسن کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ اور ان سے ہر دوسرے تیسرے روز ملاقات ہوتی تھی۔ میں نے انہی کے اصرار پر مرکزی کمیٹی کی صدارت قبول کی تھی۔ انہوں نے ہر مرحلے پر ہماری رہنمائی کی اور کانفرنس کے دوران انہوں نے زبردست دلچسپی اور سرگرمی سے کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لیا اور اپنی علالت اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود رات کے پچھلے پہر تک کانفرنس کے لیے کام کرتے تھے۔

وہ مرکزی کمیٹی کے ہر اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور اختلافِ رائے کی صورت میں حالات کو بگڑنے سے سنبھالنے کے لیے بہت کارگر ثابت ہوتے تھے۔

زندگی کے آخری سفر پر ان کے روانہ ہونے سے قبل میری ملاقات اسلم اظہر صاحب کے گھر ہوئی جہاں ایک اجلاس تھا اور جس میں ہم شریک تھے۔ سبطِ حسن صاحب نے اس موقع پر اصرار کیا کہ میں بھی لکھنؤ میں ترقی پسند ادبی گولڈن جوبلی کانفرنس میں شرکت کے لیے چلوں میں نے انہیں بتایا کہ میرا آپ کے ساتھ چلنا مشکل ہے۔ کیونکہ میرے پاسپورٹ میں بھارت کا اندراج نہیں ہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نہیں جا رہا ہوں تو انہوں نے بھی بھارت جانے سے انکار کر دیا وہ

کچھ کام کرنا چاہتے تھے وہ اکثر کہتے رہتے تھے کہ انہیں بعض مسودات کو مکمل کرنا ہے۔

اچانک ۶ / اپریل کو انہوں نے بھارت جانے کا فیصلہ کرلیا اور ۸ / اپریل کو مسلم شمیم، محمد علی صدیقی اور شاہد نقوی کے ہمراہ روانہ ہوگئے اور پھر جس حالت میں گئے تھے اس حالت میں واپس نہ آئے۔ جس وقت یہ اطلاع آئی میں سو رہا تھا مظہر جمیل کا فون آیا اور 'جنگ' سمیت تمام اخبارات سے فون آئے جب میں سو کر اٹھا تو مجھے فوری طور پر کچھ نہیں بتایا گیا۔ کیونکہ میں دل کا مریض ہوں۔ اس لیے میری بیوی نے کہا کہ دہلی سے اطلاع ملی ہے کہ سبطِ حسن کی طبیعت سخت خراب ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ خدانخواستہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رحلت فرما گئے۔

میں نے صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے اصرار کیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ منجھلی بیٹی نے فون ریسیو کیے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ انتقال کی خبر کی تصدیق نہیں ہوئی۔ میں نے نوشابہ کو فون کیا تو انہوں نے بھی تصدیق نہیں کی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ سیّد سبطِ حسن انتقال کر گئے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو سے ان کے انتقال کی خبر نشر ہو چکی ہے۔ میں یہ خبر سن کر نڈھال ہو گیا اور اپنے کمرے میں ایک طرف آ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ سبطِ حسن بہت اچھے آدمی تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔

ایک دیا اور بجھا...

شمیم فیضی

ہفتے کے دن وہ اجے بھون میں تھے۔ ان کی واپسی کا ٹکٹ کھو گیا تھا اور اب تک پی آئی اے نے دوسرا ٹکٹ جاری نہیں کیا تھا۔ وہ کسی حد تک پریشان تھے، پھر بھی ان کے چہرے پر وہ سدابہار مسکراہٹ موجود تھی جو ان کی شناخت بن گئی ہے۔ میں نے انہیں 'سیکولرازم' کی چند جلدیں دیں جسے حال ہی میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس نے شایع کیا ہے۔ یہ دراصل ان کی کتاب 'نوید فکر' کا ایک باب ہے۔ سبطے بھائی کا خیال تھا کہ ہمیں اس کتاب کے ابتدائی دو باب 'تھیوکریسی' اور 'اسلامی ریاست' کو بھی شائع کرنا چاہیے۔ کچھ دیر اسی مسئلے پر بات چیت ہوتی رہی اور پھر بات چیت کا رخ ان کے سلسلہ وار انگریزی مضامین Battle Of Ideas In Urdu Literature کی طرف مڑ گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ۵۰ویں سالگرہ کے موقع پر یہ مضامین لاہور کے ہفتہ وار 'ویو پوائنٹ' میں شائع ہوئے تھے۔ سبطے بھائی کا خیال تھا کہ ان مضامین کا ترجمہ یہاں ہو اور اس کی نقل انہیں کراچی بھیج دی جائے۔ میں نے ان مضامین کے حوالے سے بعض سوالات کیے تو انہوں نے کہا 'چلو پیر کے دن میں گیارہ بجے آجاؤں گا۔ تم سلسلہ وار یہ سوال کرنا میں جواب دوں گا۔ اس پوری گفتگو کا ٹیپ کر لینا اچھا ہوگا۔' وقت مقرر ہو گیا۔ اسی دن فاروقی صاحب سے ملاقات بھی طے تھی۔

میں نے تیاریاں مکمل کر لیں۔ مگر پھر وہ پیر نہیں آیا۔ اتوار (۲۱ر اپریل) کو ہی سبطِ حسن ہم سب سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور غالب اکیڈمی میں اسی دن ان

سبطِ حسن صاحب کے انتقال پر شمیم فیضی صاحب کا یہ مضمون ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ 'حیات' (نئی دہلی) کے ۲۷ر اپریل ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا (مرتب)۔

کے لیے استقبالیہ جلسہ طے تھا جسے تعزیتی جلسے میں تبدیل کرنا پڑا۔ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو بھی پہلی اطلاع پر یقین ہی نہیں آیا۔ مگر یہ سچ تھا، ایک کڑوا سچ۔

سبطے بھائی جنھوں نے کم سے کم دو نسلوں کی تربیت کی اور روشن خیالی کے راستے پر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا، ہمارے درمیان نہیں رہے تھے۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں تو سبطِ حسن کو مارکسی تحریک کے مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی ان کی تحریریں اردو دنیا میں نئی خیالات اور نظریات کے متلاشی نوجوانوں کے لیے ایک سمندر تھیں، جس سے جتنا اکتساب کیا جائے وہ اتنا ہی وسیع نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سبطے بھائی نے صرف تخلیقات چھوڑی ہیں، مگر ان کے تراجم اور مضامین کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر ان سب کو شایع کر دیا جائے تو حیرت ہوگی کہ اس شخص نے محض ۷۲ سال کی عمر میں کیسے اتنا کام کرلیا۔

سبطِ حسن کی زندگی کافی تہہ دار تھی۔ ۱۹۷۹ء میں جب وہ دہلی آئے تو ڈاکٹر ادھیکاری نے مجھے ہدایت کی کہ سبطے کو میرے پاس ضرور لانا مگر لانے سے پہلے مجھے اطلاع کر دینا۔ جب وہ اجے بھون آئے تو میں نے انہیں 'ڈاکٹر' کی خواہش سے باخبر کیا، وہ فوراً ان کی طرف چلنے کو تیار ہو گئے مگر میں نے ان کو روک دیا۔ وہ کامریڈ راجیشور راؤ سے ملنے چلے گئے۔ اس دوران میں نے 'ڈاکٹر' کو خبر کر دی کہ سبطے بھائی آ گئے ہیں۔ 'ڈاکٹر' نے کہا کہ دس منٹ بعد لے آؤ۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم 'ڈاکٹر' کے کمرے میں پہنچے تو وہ سبطے بھائی کو کھینچ کر ایک ٹیبل کی طرف لے گئے، وہاں کوئی کپڑا رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا سبطے اسے پہچانتے ہو۔'

'بہت اچھی طرح سے، یہ میری شیروانی ہے جو انڈر گراؤنڈ پریڈ میں، میں نے آپ کو اس دن دی جب آپ کو چھپ کر ایک میٹنگ میں جانا تھا۔'

'بالکل ٹھیک' یہ کہہ کر 'ڈاکٹر' نے سبطِ حسن کو لپٹا لیا۔ پھر باتوں کا سلسلہ پڑا۔ پتہ چلا کہ پارٹی پر پابندی کے دور میں سبطِ حسن، ڈاکٹر ادھیکاری کے 'پیام رساں' کے فرائض انجام دیتے تھے۔ پارٹی قیادت اور ڈاکٹر ادھیکاری کے بیچ وہی رابطہ تھے۔ (اتفاق کی بات ہے کہ ڈاکٹر ادھیکاری نے اپنی موت سے ایک ہفتہ پہلے مجھے بلا کر وہی شیروانی دی تھی اور کہا تھا اسے اب تم بطور یادگار اور کبھی کبھی ہماری اور سبطے کی یاد میں پہن لیا کرنا۔ میرے پاس وہ شیروانی آج بھی محفوظ ہے۔)

علی گڑھ، الٰہ آباد اور لکھنؤ میں انہوں نے تعلیم پائی۔ صحافتی زندگی کا آغاز قاضی عبدالغفار کے اخبار 'پیام' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا۔ نظام کے حیدرآباد میں 'پیام' آزاد خیالی کی علامت مانا جاتا

تھا۔ حیدرآباد میں چند ہفتے گزارنے کے بعد وہ لکھنؤ لوٹ آئے۔ یہاں سے انہوں نے 'پرچم' نکالا اور نوتشکیل شدہ انجمن ترقی مصنفین کے ترجمان 'نیا ادب' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سردار جعفری، اسرارالحق مجاز اور اے۔ جے۔ زاہدی بھی اس کی مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔ اس دور میں جب جواہر لال نہرو نے 'نیشنل ہیرالڈ' کا اردو ایڈیشن 'قومی آواز' شروع کیا تو سبطے بھائی نے اسے بھی جمانے میں مدد دی۔

۱۹۴۰ء میں انہوں نے نظموں کا ایک مجموعہ 'آزادی کی نظمیں' کے عنوان سے شایع کیا اس میں وہ نظمیں اکٹھا کردی گئی تھیں جن پر نوآبادیاتی برطانوی حکمرانوں نے پابندی عائد کردی تھی۔ برطانوی حاکموں نے فوراً اس کتاب کو بھی ضبط کرلیا۔

اس دوران سبطِ حسن نے کمیونسٹ مینی فیسٹو اور رالف فاکس کی سوشلزم پر کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی مارکسی کلاسک کو اردو قالب میں ڈھالا۔

۱۹۴۲ء میں پارٹی سے پابندی ہٹنے کے بعد جب پارٹی نے پہلا قانونی اردو ہفتہ وار 'قومی جنگ' شروع کیا تو سبطِ حسن اس سے وابستہ ہوگئے۔

تقسیمِ وطن کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں جب میاں افتخارالدین نے 'پروگریسیو پیپلز لمیٹڈ' کے تحت 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور دوسرے اخبارات اور رسالے جاری کیے تو انہیں ہفتہ وار 'لیل و نہار' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ 'پیام' سے لے کر 'لیل و نہار' تک کی صحافتی زندگی میں سبطِ حسن نے صحافت کا وہ معیار قائم کیا جس پر اردو زبان بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

سبطِ حسن کو بھی ایوب شاہی دور میں چلائے گئے جھوٹے مقدمے 'راولپنڈی سازش کیس' کے سلسلے میں سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ مگر جلد ہی انہیں رہا کردیا گیا۔ اس دوران کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ کراچی میں رہنے لگے۔ وہاں سے انہوں نے 'پاکستانی ادب' نکالا جو ترقی پسند تحریک کے خلاف سرکاری عتاب کے باوجود پاکستان کا سب سے مقبول رسالہ تھا۔ انہوں نے ترقی پسند اور روشن خیالی کی مدافعت کرنے کے ساتھ ساتھ، ہر رنگ کی فرقہ پرستی، قدامت پسندی اور بنیاد پرستی سے مورچہ لیا۔ اس سلسلے میں اکثر و بیشتر ان کے مضامین نہ صرف پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبارات میں بلکہ ہندوستانی جریدوں میں بھی چھپتے رہے۔

سماج کے ارتقا پر ان کی تصنیف 'موسیٰ سے مارکس تک' نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان میں

بھی بہت مقبول ہے۔ پاکستان میں ضیاء شاہی کی طرف سے قانونی پابندی کے باوجود اس کے ۱۳ ایڈیشن شایع ہوئے۔ ہندوستان میں یہ ضخیم کتاب پیپلز پبلشنگ ہاؤس نے شایع کی ہے۔ یہ کتاب ان تمام لوگوں کے لیے قائد کا کام دے گی جو تاریخی مادیت کے اصولوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سبطِ حسن کی تحریروں کی یہ خوبی اس کتاب میں بھی نمایاں ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو بھی انتہائی سلیس اور سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں جسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

'ماضی کے مزار' پاکستانی معاشرے کے ارتقا پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، حال میں شایع ہوئی 'نویدِ فکر' میں انہوں نے مذہبی ریاست کے تصور اور سیکولرازم کے سائنسی نظریے کا نہ صرف تقابلی جائزہ پیش کیا ہے بلکہ سیکولرازم اور سیکولر ریاست کا تاریخی پس منظر پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ آج کے دور میں کوئی بھی ریاست سیکولر ہی ہوگی۔ ریاست کے موجودہ تصور اور حقیقت کو مذہبی تصور سے جوڑنا اجتماع ضدین ہوگا۔

ہندوستان آنے سے قبل سبطِ حسن نے Battle Of Ideas In Pakistan پر کام بھی کر لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے کہ ایک اہم اور بنیادی کام ہوا۔ واپسی پر اس کتاب کی رسمِ اجراء انجام دی جاتی۔

فوجی راج کے بوجھ تلے دبے پاکستانی معاشرے میں سبطِ حسن ترقی پسندی اور روشن خیالی کی علامت بن گئے تھے۔ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ اسی لیے دو سال قبل ان کی ۷۰ ویں سالگرہ پر پاکستان کے نوجوان ترقی پسند دانشوروں نے 'روشن خیالی' پر سیمینار کر کے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا نقطۂ عروج مارچ ۱۹۸۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی جشن تھا جس پاکستان کی سب زبانوں کے تقریباً پانچ سو ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے حصہ لے کر ثابت کر دیا کہ ترقی پسند ادبی تحریک نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ مضبوط ہوئی ہے۔ اس گولڈن جوبلی جشن کے روحِ رواں بھی سیّد سبطِ حسن ہی تھے اور بجا طور پر پاکستان میں ۲۴ سال کے وقفے کے بعد انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کامیابی میں ان کی زندگی کی ایک اہم کامیابی تھی۔

غالب اکیڈمی کے تعزیتی جلسے میں مسلم شمیم نے کہا کہ سبطے بھائی پر زیادہ خوشی کی وجہ سے دل کا دورہ پڑا۔ ہوسکتا ہے، بات درست ہو۔ لکھنؤ سے لوٹ کر آنے کے بعد ٹکٹ کی گمشدگی سے پیدا ہونے والی پریشانی کے باوجود وہ ہر کسی سے مذاق کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا 'تم نہیں جانتے لکھنؤ نہ آ کر تم نے کتنا سنہری موقع کھو دیا۔' واقعی سبطے بھائی نے کتنی سچی بات کہی تھی۔!!

سیّد سبطِ حسن۔ ایک نادرِ روزگار ادیب

میر بشیر

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

آج سے کچھ اوپر چالیس پینتالیس برس کی بات ہوگی۔ حیدر آباد دکن میں کام کے سلسلے میں مقامی اخبارات و ذرائع ابلاغ سے ایک نوع کا رابطہ استوار کرنے میں فنی مضامین کی اشاعت ایک عنصر ضروری خیال کیا جاتا تھا چنانچہ روزنامہ 'رہبر' دکن، روزنامہ 'صبح' دکن میں مسلسل دست شناسی پر سلسلہ ہائے مضامین چھپتے رہے۔ غالباً مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم سے مراسم آپ سے آپ اس راہ میں خاموش معاونت کر رہے تھے اور اس میں شک نہیں کہ مملکت آصفیہ کے سربرآوردہ خاندانوں میں میری اچھی خاصی رسائی ہوگئی تھی اور ایک نوع کا استحکامِ کار کا احساس ہونے لگا تھا۔

بلاشبہ میرے کام اور سلسلہ ہائے مضامین کی اشاعت سے اربابِ ذوق اور پڑھے لکھے طبقے میں فنِ دست شناسی سے خاصی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر یوسف حسین، خلیفہ عبدالحکیم، مخدوم محی الدین ایسے افراد سے اچھا خاصا میل ملاپ تھا اس لیے جب سبطِ حسن میری قیام گاہ جان ہوٹل میں یہ پیام لے کر آئے کہ قاضی عبدالغفار مدیر و مالک روزنامہ 'پیام' چاہتے ہیں کہ مجھے چائے پر مدعو کیا جائے اور ہاں ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہاتھ دیکھ کر اپنے مشاہدات سے انہیں مستفید کروں، ایسی دعوت بلاشبہ دلکش بھی تھی اور اپنے اندر امید افزا امکانات پنہاں کیے ہوئے تھی۔

یہ مضمون روزنامہ 'جنگ' کی ۱۹ رمئی ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا (مرتب)۔

سطے سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ رسمی سی، مگر وہ کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے اور فن کے مختلف پہلوؤں پر بحث وسوالات کرتے رہے۔ ذہین، فطین، بلند نگاہ سطے کے انداز میں تحقیق و تفتیش کے بنیادی عناصر کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنی شخصیت کا دیرپا اثر چھوڑ گئے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے کار لے کر آئے اور میرے یہاں نہایت اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ رسمی ماحول نہ تھا۔ مخدوم کی باتیں فیض کا تذکرہ ڈاکٹر جیسور یہ غرض کہ بہت سے باہمہ دگر ملنے والوں کا ذکرِ خیر رہا۔ جب قاضی صاحب سے تعین وقت اور چائے نوشی کا وقت قریب آن پہنچا تو مجھے سواری میں بٹھا کر قاضی صاحب کے دولت کدہ تک پہنچا دیا اور خود غالباً کسی جگہ انتظار میں بیٹھ گئے ہوں گے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے ہاتھوں کے نقوش میرے لیے بہت ہی انمول دلکشی کے حامل تھے۔ شام کے سائے طویل ہو رہے تھے کہ جب یہ دست شناسی کا سیشن، بادل نخواستہ اختتام پذیر ہوا۔ سطے مجھے کار میں سوار کرا کے ہوٹل پہنچانے آئے مگر کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اس نشست میں ہم آپس میں گھل مل گئے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی ٹیلی فون پاگل ہو گیا۔ جنگ بہادروں، عہدیداروں اور امرائے سلطنت کی ڈیوڑھیوں (محلات) سے اس قدر فون آنے شروع ہو گئے کہ ایک ہلڑ مچ گیا۔ میں صبح کی چائے پینے اور فون کے لگا تار کالوں کے جواب میں الجھا ہوا ہی تھا کہ سطے 'پیام' کا اس دن کا شمارہ لیے آ گئے۔ میری بدحواس حالت دیکھ کر مسکرائے بیٹھ گئے، اور قاضی صاحب کا ادارتی نوٹ پڑھنے کے لیے دیا اور مجھے ایک مرعوب تعجب سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے، قاضی صاحب نے کبھی اس نوع کا اداریہ نہیں لکھا۔ وہ بالضرور بہت متاثر ہوئے ہوں گے۔ فون کا پریشان کن مسلسل آنا سمجھ میں آنے لگا۔ 'پیام' بے حد متانت، سلیقہ اور اعتدال کا نقیب تھا۔ قاضی صاحب بڑے صاحب نگاہ اور محتاط عظیم صحافی تھے۔ ان کا ایسا ادارتی نوٹ لامحالہ اثر انگیز ثابت ہونا یقینی تھا۔

سطے سے اس سے قبل کوئی راہ رسم نہ تھی سرسری سر راہ ملاقات وہ بھی کسی محفل میں یا ممکن ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو کے شاندار آستانہ زرّین کی کسی دعوت میں، وہ ایک بڑے ہی قبول صورت جوان رعنا تھے، لوگ ان کی طرف آپ سے آپ کھنچ جاتے تھے۔ ان کی مرغوب طبیعت، سلیقہ

مندانہ انداز گفتار صنفِ نازک ہی کے لیے جاذبِ نظر نہ تھا بلکہ وہ ہم جنسوں میں بھی بڑے مقبول تھے۔ مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر بابا نائیڈو کے تو بہت ہی منظورِ نظر تھے، قاضی صاحب کے ہاتھ دکھائے اور اس قدر اثر انگیز ادارتی نوٹ کے پیچھے ممکن ہے سبطے ہی کا ایمائے خوشگوار ہو، بہرکیف یہ بات برسوں کے بعد معلوم ہو سکی کہ درحقیقت یہ سبطے ہی کا 'پسِ پردہ' خوش معاملہ ہاتھ تھا کہ ایسا حوصلہ افزا اور ناموارانہ متن دیکھنے میں آیا۔ اس کے بعد حیدرآباد میں جب تک قیام رہا ذرائع ابلاغ نے بہت نوازا اور زندگی میں ایک خاص آسائش کار کے سے انداز پیدا ہو گئے۔

میں بمبئی چلا گیا۔ یہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا مگر حیدرآباد میں چند ماہ بالضرور ہر سال گزرتے۔ سبطے بھی وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک آدھ بار بمبئی میں بھی ملاقات ہوئی۔ اربابِ صحافت سے ملاتے اور اس قدر چابکدستی سے ایمائے حسین سے تعریف کرتے کہ اربابِ قلم ملتے رہتے اور کچھ نہ کچھ اپنے متعلقہ اخبارات و رسائل میں میرے کام اور فنی مضامین کے بارے میں لکھتے۔ بیشتر مجھ سے مضامین حاصل کرتے اور انہیں نہایت جلی اور دلکش عنوانات کے تحت چھاپتے۔ سبطے کا یہ پہلو جسے دوست پروری ہی کہا جا سکتا ہے، خاموش مگر پسِ پردہ نفسیاتی نفاست سے کارفرما تھا۔

۱۹۴۷ء میں میری لندن روانگی کے بعد ان سے ملنے ملانے کے امکانات مفقود ہو گئے۔ وہ اپنے کاموں میں منہمک رہے ہوں گے۔ گاہے گاہے ان کے جیل اور قید خانے سے آمدورفت کی خبریں سنتا رہا مگر مدتوں ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے ۱۹۵۲ء۔ ۱۹۵۶ء کے دوران کئی بار کاروباری سلسلے میں پاکستان کے دورے کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ فیض سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ سبطے سے غالباً ۱۹۵۵ء میں تجدیدِ ملاقات ہوئی ہوگی۔ 'لیل و نہار' میں فیض کے ایما پر کچھ لکھا۔ مگر میرے اعتقادات و خیالات ترقی پسندانہ نہ تھے اور اس کے باوجود میرے تعلقات فیض اور سبطے سے خوشگوار رہے۔ یہ سلسلہ کم و بیش عمر بھر جاری رہا۔

سبطے میری طبیعت، کام کی نوعیت اور تصوف سے گہرے ربط سے واقف تھے، ہم متنازع معتقدات سے بحث نہ کرتے تھے۔ ایک تفہیم صریح تھی۔ وہ اپنے اعتقاد و کام میں منہمک رہتے میں اپنی مصروفیتوں میں گھرا رہتا۔ ملتے اور خوش گپی اور ادبی باتیں ہوتیں یا کچھ نجی سیر و سفر کے تجربات۔ وہ میرے قیامِ لندن کے بارے میں کبھی پوچھ لیتے۔ انہیں حیرت تھی کہ میں نے عمر کا کام کاج کا سارا زمانہ لندن میں گزار دیا۔ غالباً وہ سمجھتے ہوں گے کہ مجھے پاکستان میں اچھا رزق مل

سکتا ہوگا۔ بہر کیف وہ نہایت محبت سے پیش آتے رہے۔ دوسری بار 'لیل ونہار' نکلا تو اس کے لیے بھی فیض کے ایما پر برطانیہ کی مزدور تحریکات کے بارے میں کچھ لکھا ہوگا۔ پھر پرچہ بند ہوگیا۔ افسوس ہوا کہ ایسا معیاری اور قابلِ قدر رسالہ چل نہ سکا۔

یہ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہوگی۔ میں کراچی میں کام کے سلسلے میں پہنچا سبطے ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں مجھے ایک دعوت کے لیے راضی کرلیا۔ میرا خیال تھا کہ نجی سی بات ہوگی۔ ان کے دولت کدہ پر پہنچا تو کم وبیش پچاس ساٹھ لوگ شاملِ عصرانہ تھے۔ ادیب، صحافی، صنعت کار، زعمائے شہر غرض یہ کہ ایک شاندار ہنگامہ پرور اجتماع تھا۔ مہمانوں سے ملاتے رہے اور تعریف کے پل باندھتے رہے۔ ان کی ایک عزیزہ میرے کام سے شغف رکھتی تھیں۔ انہیں بلایا اور کہا کہ انکل کو فرصت ہوگی تو ہاتھ دیکھ دیں گے۔ اور وہ دوسرے دن ہی ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ بہت ہی اچھی لڑکی تھی۔ غالباً ان کی بیٹی ہوگی۔

دعوت کے دوران انہوں نے سرِراہ مجھے بتایا کہ ٹی وی والوں نے ایک پروگرام 'گوشۂ عافیت' میں مجھے Appear ہونے کے لیے کہا ہے۔ فیض ہفتہ عشرہ اسی پروگرام میں حصہ لے چکے ہیں۔ اور کہنے لگے کہ میں نے آپ کی طرف سے ہاں تو کردی ہے میرے خیال میں مناسب ہی رہے گا۔ ان کا یہ مفیدِ احباب پہلو کئی بار سامنے آتا رہا۔ اور وہ معاملہ یوں طے کرلیتے کہ گویا ان پر احسان کیا جارہا ہو۔ حالانکہ فائدہ دوسرے کا ہوتا۔ معلوم نہیں ان کے دوسرے احباب کا تجربہ اس سلسلے میں کس نوعیت کا ہوگا۔

اس کے بعد میں یورپ اور امریکہ کے دوروں میں یوں پھنسا رہا کہ گیارہ بارہ برس تک پاکستان جا ہی نہ سکا۔ وہ لندن آتے تو مل لیتے۔ نہ کبھی کسی کام کے لیے کہا اور نہ ہی نفسیاتی اور مادّی لحاظ سے کوئی بوجھ ڈالا۔

مجھ سے ایک دفعہ بڑی خفت آمیز حرکت سرزد ہوگئی۔ یہ لندن کی بات ہے ایک ادبی مجلس کے خاص مشاعرے میں مجھے صدارت کے لیے آمادہ کرلیا گیا۔ سبطے مہمانِ خصوصی تھے۔

ان دنوں میری قوتِ شنید کمزور ہوگئی تھی اور Hearing aid کے بغیر کم سنائی دیتا تھا۔ مشاعرہ گاہ میں پہنچ کر سبطے کا پتہ کیا۔ وہ کہیں پاس ہی بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا ہوگا کہ یہیں تشریف فرما ہیں۔ میں نے غلط سنا اور صدارت کی کرسی پر منتظمین کے اشارے پر بیٹھ گیا۔ جب وہ اسٹیج پر

آ ئے تو احساسِ ندامت سے نجانے مجھ پہ کیا گزری ہوگی۔ مشاعرے کے بعد انہیں ڈھونڈا وہ جا چکے تھے۔ پچھلی دفعہ دسمبر ۱۹۸۵ء کراچی میں تھا ان کے ایک ملنے والے آئے انہیں قصہ سنایا۔ ہوسکتا ہے سبطے نے اپنی طبعی رواداری اور کشادہ دلی سے معاف کر دیا ہو۔ انہیں دکھ تو ہوا ہوگا کہ میں نے انہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ میرا فرض تھا کہ انہیں تلاش کرتا۔

'شہرِ نگاراں' میں سبطے نے کچھ ایسی حکایتیں بیان کی ہیں کہ جو سچی بھی ہیں اور حیدر آباد کے اس دورِ عثمانی کی دلکش و حسین تصویریں بھی ہیں۔ سبطے کا ادبی مقام ان کے ترقی پسند مصنفین سے والہانہ ایفاء کا ممنون منت نہیں۔ وہ ایک نادرروزگار ادیب تھے۔ علم و دانش پر پوری دسترس تھی۔ طبیعت متانت اور استدلال پسند تھی۔ یوں ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ دوستی نبھاتے تھے۔ لوگوں کے کام آتے تھے۔ اگرچہ صاحبِ اعتقاد تھے اور اپنے معتقدات پر جاں نثارانہ کردار و نقطۂ نظر رکھتے تھے مگر یہ بارہا دیکھا گیا کہ وہ ہر نوع کے افراد سے ملتے تھے اور اپنے مراسم استوار رکھتے تھے۔

ان کے محبت کرنے والوں میں مجھے فیض، مخدوم محی الدین ایسے لوگ تھے جو ان کی قسم نہ کھاتے تھے۔ ایسے ہی عظیم افرادِ زمانہ کے لیے کہا گیا ہے کہ۔

'خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'

سبطِ حسن پارٹی ورک سے علمی تحقیق تک

انتظار حسین

سر پر سفید گھنے بال، منہ میں پائپ۔ ان دو چیزوں کے امتزاج سے سبطِ حسن پہچانے جاتے تھے اور ہاں اپنی شائستگی سے بھی۔ تھے تو ترقی پسند مگر بات کرتے ہوئے ان کی گردن کی رگیں کبھی نہیں پھولتی تھیں اور آواز کبھی اونچی نہیں ہوتی تھی۔ کیا نرم گفتار آدمی تھے۔ کہتے ہیں کہ سبطِ حسن جوانی میں بہت خوب صورت آدمی تھے۔ راویوں کے بقول انہیں لیڈی کلر سمجھو مگر خوب صورت آدمی تو وہ اس بڑھاپے میں بھی نظر آتے تھے۔ سر کے سفید بالوں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ان سے تو ان کی شخصیت میں ایک وقار اور ایک نئی جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔

سبطِ صاحب کا نام تو ہم نے ترقی پسند تحریک کی نسبت سے بہت پہلے سے سن رکھا تھا، دیکھا بہت بعد میں۔ لاہور میں وہ ۴۸ء میں آ گئے تھے۔ مگر اہلِ شہر نے ان کے وجود کو اس وقت محسوس کیا جب 'لیل و نہار' نکلنا شروع ہوا۔ اس سے پہلے تو وہ اپنی پارٹی کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔ 'لیل و نہار' بھی کیا خوب پرچہ تھا۔ اس معیار کا اور اس کینڈے کا ہفت روزہ اردو میں نہ اس سے پہلے نکلا تھا اور نہ اس کے بعد نکلا۔ اس سے پتا چلا کہ سبطِ صاحب واقعی کانٹے کے صحافی تھے۔ ہونا ہی تھا۔ آخر سیّد عبداللہ بریلوی اور قاضی عبدالغفار کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ 'لیل و نہار' کو ایوب خان کے مارشل لاء کی نظر کھا گئی۔ جب پروگریسو پیپرز کو حکومت نے ٹیک اوور کیا تو سبطِ صاحب نے 'لیل و نہار' کو سلام کیا اور باہر نکل آئے۔

یہ کالم انتظار حسین صاحب کے کالموں کے مجموعے 'بوند بوند' (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۴ء) میں شامل ہے (مرتب)۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

'لیل ونہار' ڈوبتا چلا گیا۔ آخر کے تئیں بالکل ہی ڈوب گیا اور سبطِ صاحب کو گردشِ لیل ونہار فیروز سنز لے گئی جہاں وہ ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھے قلم چلاتے صبح سے شام کر دیتے۔

سبطِ صاحب نے اس عالم میں تھوڑا عرصہ اس شہر میں گذارا، پھر کرچی کی راہ لی جہاں اچھے دن ان کے منتظر تھے۔ اچھے دن اس اعتبار سے بھی کہ اب ان کا قلم رواں ہو چلا تھا۔ ایک کتاب پھر دوسری کتاب پھر تیسری کتاب۔ ان کے یہاں تصنیف وتالیف کا دور صحیح معنوں میں اب شروع ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے سبطِ صاحب کا نام بہت تھا کام اب شروع ہوا اور اس کام کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے کہ اچھا اس شخص نے اتنی عمر پارٹی کے کاموں اور صحافت کی مصروفیتوں میں نکال دی، کرنے کا کام اس عمر میں آ کر شروع کیا۔ سبطِ صاحب کو ہم اب جن تصانیف کے حوالے سے جانتے ہیں وہ سب 'لیل ونہار' کے بعد کے زمانے کی چیزیں ہیں۔ 'ماضی کے مزار'، 'موسیٰ سے مارکس تک'، 'پاکستانی تہذیب کا ارتقا'، 'نویدِ فکر'، 'انقلابِ ایران' یہ سب کتابیں 'لیل ونہار' سے رخصتی کے بعد تصنیف ہوئیں۔

خیر یوں بھی ہوتا ہے۔ ایک وہ ذہن ہوتے ہیں جو آغازِ جوانی کے ساتھ تیزی سے چمک دکھاتے ہیں اور شتابی سے بجھ جاتے ہیں۔ پھر قلم یا تو تھک کر تھم جاتا ہے یا اپنے آپ کو دہرانے پر لگ جاتا ہے اور ایک وہ ذہن ہوتے ہیں جہاں فصل دیر سے پکتی ہے مگر جب پک جاتی ہے تو موسم کے آخر تک پھل دیتی رہتی ہے۔ بس سبطِ حسن اسی طرح کا ذہن تھے۔ ان کی فکر بڑھاپے کے ساتھ ساتھ جوان ہوئی۔ جتنی عمر گذرتی جا رہی تھی سوچنے کا عمل تیز ہوتا جا رہا تھا۔ 'نویدِ فکر' ان کی بعد کی تصنیف ہے مگر اس کتاب میں ان کی فکر زیادہ منجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ایسے زمانے میں شایع ہوئی جب یوں لگتا تھا کہ سوچنے کا عمل ہمارے یہاں موقوف ہو چکا ہے۔ بس ہم اپنی کٹھ ملائیت میں مگن ہیں۔ ایسی فضا میں اس کتاب کی اشاعت سوچنے کے عمل کو پھر سے شروع کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

اصل بات یہ نہیں ہے کہ سبطِ حسن جو فکری تعبیریں کرتے ہیں اور جو تجزیے پیش کرتے ہیں وہ کس حد تک صحیح ہیں۔ اس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک نظریے میں ایمان رکھتے ہیں اور اس کی مدد سے جو مسائل کا تجزیہ اور تعبیر کرتے ہیں اس سے قدم قدم پر اختلاف کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اصل

بات یہ ہے کہ وہ ہمیں ذہنی اعتبار سے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ وہ اتنی سنجیدگی سے سوچتے نظر آتے ہیں کہ اختلاف کی صورت میں ہم ان کی تعبیر و تجزیے کو بیک قلم رد کر کے نہیں گزر سکتے۔ سوچنا پڑتا ہے، سوچنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہمارے معاشرے کا گزارہ خالی نعروں پر ہے اور جذباتی ردِّعمل پر اور چبے چبائے خیالات کو دہرائے جانے پر کسی مصنف کا اس طرح سوچنا اور لکھنا کہ وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرے، بہت غنیمت بات ہے۔

سبطِ حسن ستر سے اوپر جا چکے تھے مگر ان کی فکر ابھی ستری بہتری نہیں ہوئی تھی۔ فکری سفر ان کے یہاں ابھی جاری تھا۔ کتنے موضوعات پر قلم اٹھا چکے تھے، کتنے موضوعات پر لکھنے کے لیے پر تول رہے تھے مگر بیچ سفر میں اجل کے قزاق نے ان پر چھاپا مارا۔ تصنیف و تالیف کے کتنے عزائم کتنے منصوبوں پر ان کی موت نے پانی پھیر دیا۔

بہر حال وہ ایک بھرپور آدمی کی زندگی تھی جس نے میدانِ عمل میں مراحل طے کر کے قید و بند سے گزر کر فکر و خیال کے میدان میں منزلیں طے کیں اور ایک متحرک ذہن کے ساتھ ہمارے درمیان سے رخصت ہوا۔

سبطِ حسن ___ دانش کی قلمرو میں روشن خیالی کا سفیر

حسن عابدی

۱۹۳۶ء برصغیر پاک و ہند میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کا سال تھا۔ سبطِ حسن اس انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا اور پھر پچاس سال بعد وہ لندن، کراچی اور آخر میں لکھنؤ کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان مواقع پر اور خاص طور پر لکھنؤ کانفرنس میں سبطِ حسن کی شرکت، ان کے لیے یقیناً ایک یادگار اور ولولہ انگیز تجربہ رہی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں یہ ترقی پسند انجمن کی ہی نہیں، سبطِ حسن کی اپنی گولڈن جوبلی بھی تھی اور وہ بجا طور پر اس اعزاز کے مستحق تھے۔ پچاس سال کا تخلیقی سفر بے پایاں امنگوں، لازوال امیدوں، وقتی ناکامیوں، شبانہ روز کی جاں فشانیوں، جسمانی کاہشوں اور جذباتی صدموں کے ساتھ کچھ کم نہیں ہوتا۔ سبطِ حسن نے یہ سفر کمال پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ طے کیا اور اپنے نظریے کے ساتھ وفاداری، ایثار پیشگی اور جوان ہمتی کی ایسی مثال قائم کر گئے جو انسانی تہذیب کے مختلف ادوار میں عہد ساز شخصیتوں نے ہی پیش کی ہوگی۔

سبطِ حسن کی رحلت کو ابھی تھوڑے ہی دن گزرے ہیں، ذہن کو یہ باور کرانے میں کچھ وقت لگے گا کہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں، ابھی تو وہ ہماری بزمِ خیال میں اپنے نورانی چہرے، اجلے لباس اور پیشانی پر جھولتے ہوئے سفید بالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ ان کا ٹھہر ٹھہر کر متین لہجے میں گفتگو کرنا، پائپ کے دھوئیں کے پیچھے ان کی سوچتی ہوئی روشن آنکھیں، پیشانی پر تدبر کی شکنیں،

یہ مضمون 'افکار' کراچی کے جون ۱۹۸۶ء کے شمارے میں اداریہ کے طور پر شائع ہوا (مرتب)۔

شفقت آمیز خفگی اور حسین وارفتگی، بولنا کم اور سننا زیادہ، تحمل کے ساتھ، توجہ کے ساتھ۔ 'ہاں، میرا خیال ہے۔' اور پھر ان کی باتیں مدلل، متوازن، دل میں اتر جانے والی باتیں۔ مختصر یہ کہ کچھ وقت چاہیے ان کو بھول جانے میں، تا کہ انہیں یاد کیا جا سکے، اپنی تاریخ کے حوالے سے، علمی سطح پر، یوں جیسے ہم اپنی عہد ساز شخصیتوں کو ان کے سیاق وسباق میں رکھ کر پڑھتے اور یاد رکھتے ہیں۔ سبطِ حسن اب ہمارے عہد کی تاریخ کا ایک بڑا کردار ہیں۔ ان مختصر سطور میں ان کی علمی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، صرف چند معروضات پیش کی جا سکتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں، معاشرت میں اور ادب میں صدیوں سے پوچ جذباتیت، سستی نعرے بازی، بے دانشی اور مردم بیزاری اور مختلف انداز کی عصبیتوں کا چلن عام رہا ہے، حد تو یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ بھی حسبِ دل خواہ رقم کرتے آئے ہیں۔ تاریخی حقائق کو افسانے کے پلاٹ کی طرح موڑ دینے میں ہم کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ سماجی اور تہذیبی مسائل کی تفہیم میں بھی ہمارا یہی رویہ رہا ہے۔ سبطِ حسن نے کہ غالب اور سرسیّد کے کے شیدائی تھے۔ ان ہی کی طرح بے تعصبی، آزاد خیالی، تفکر اور استدلال کو اپنی تحریر کی اساس بنایا۔ انہوں نے مارکسزم اور اپنے عہد کی سائنسی فکر اور فلسفیانہ بصیرت سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ان کی تصانیف عام ہیں اور جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سبطِ حسن حقائق کی تلاش میں نہ صرف تاریخ کے سارے مواد کو اچھی طرح کھنگالتے، بلکہ ضرورت محسوس ہوتی تو طویل سفر بھی اختیار کرتے تھے۔ عراق کے سفر میں انہوں نے بابل و نینوا کے آثار کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا۔ یہ علمی کاوش اور حکیمانہ تجسس فی زمانہ کم یاب ہے۔ سبطِ حسن کی شخصیت کا عکس ان کی تحریر میں ملتا ہے۔ ان کی نثر انہی کی طرح سہل، رواں دواں، طولِ کلام اور حشو و زاید سے پاک ہے۔ ان ہی کی طرح نفیس اور نستعلیق ہے۔ ان کی متانت میں بڑی حلاوت ہے اور اختلاف میں بھی اپنائیت کا انداز ملتا ہے۔ ان کی طنزیہ عبارت میں زہرناکی نہیں بلکہ زیرِ لب تبسم کی کیفیت ہوتی ہے۔ استدلال کی ایک رو شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ انہیں اپنے بیان اور مؤقف کی صداقت پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو بھی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں اور پڑھنے والا اسے اس طرح پڑھتا ہے جیسے کسی رفیقِ دیرینہ سے سرگوشی میں باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ نثر قصے کہانیوں کی، شخصی کامرانیوں اور محرومیوں کی یا انشائے لطیف کی نثر نہیں، یہ وہ نثر ہے، جو تاریخ، تہذیب، اور سماجی انقلاب جیسے

ثقیل اور بوجھل حقائق کا بار اٹھائے ہوئے ہے، لیکن معلم اور طالب علم، کلرک اور دکان دار اور کسان اور مزدور، سب ان کی کتابیں پڑھتے ہیں، ذوق وشوق سے اور بڑے لطف کے ساتھ پڑھتے ہیں اور مزید پڑھنے کی آرزو کرتے ہیں۔ سبطِ حسن نے 'سستے ادب' کی گرم بازاری کے اس دور میں لاکھوں نوجوانوں اور محنت کشوں کو سنجیدہ مطالعے کی چاٹ لگا دی۔ یہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے اور اعجاز ہے ان کے شریف، دیانت دار مشفق و مہربان قلم کا۔

سبطِ حسن کی وہ خوبی جس کا اعتراف ان کے سیاسی مخالفوں نے بھی کیا، ان کی دیانت اور ثابت قدمی تھی۔ وہ سچے اور کھرے مارکسسٹ تھے جس کا نہ انہوں نے کبھی ڈھنڈورا پیٹا اور نہ جسے انہوں نے کبھی چھپایا۔ وہ نفع ضرر کے تمام امکانات اور اندیشوں سے بلند تھے۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا اور نہ عقوبت کا ڈر۔ انہوں نے صعوبتیں برداشت کیں، جسمانی اور جذباتی صدمے جھیلے، لیکن نہ اس کا کبھی تذکرہ کیا، نہ ان کی شخصیت اور مزاج میں اس کا خفیف سا بھی شائبہ ملتا ہے۔ اذیت کا ہر لمحہ ان کی روشن پیشانی پر ایک سائے کی طرح آتا تھا اور گزر جاتا تھا۔ طمانیت اور مسرت کی ساعتیں بھی ابرِ بہار کی طرح بہت جلد اپنا گلابی سایہ سمیٹ کر رخصت ہو جاتی تھیں۔ بس ذرا ہنس بول لیے پھر مطالعے میں محو ہو گئے۔ اپنی ذات کا تذکرہ انہیں سخت ناپسند تھا۔ اپنی خودنوشت لکھنے کا کئی بار ارادہ کیا، پھر یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ مجھے 'میں' کی تکرار بری لگتی ہے۔ اس سے خودستائی کی بو آتی ہے۔ گزشتہ سال جب جشنِ سبطِ حسن منانے کا اہتمام کیا گیا تو انہوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی، چنانچہ ان کی خواہش پر اسے 'روشن خیالی' کے مذاکرے میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ پاکستان میں ایک روشن خیال معاشرہ چاہتے تھے۔ ایسا معاشرہ جس میں انسان دوستی کا چلن عام ہو، جس مین انسانیت کا احترام ہو، لوگ ایک دوسرے کو اس کے دبدبے اور دولت کی بنا پر نہیں، بلکہ انسانی خوبیوں کی بنا پر معاشرے کے لیے اس کی خدمات کی بنا پر قبول کریں۔ اس معاشرے میں دلیل کا جواب دلیل سے دیا جائے، پتھر سے نہیں۔ اس معاشرے میں ذہن آزاد ہوں، نفرت، عناد، مذہبی جنون اور ہر طرح کے تعصّبات سے آزاد۔ محبت ہو، محنت ہو، علم وفن کی قدر ہو، کسی نے سبطِ حسن کو 'سوشلسٹ صوفی' کہا تو کچھ ایسا غلط نہیں کیا۔

سبطِ حسن محنت کشوں کے دوست تھے، انہیں بچوں سے، پھولوں سے اور نوجوانوں سے والہانہ محبت تھی۔ نوجوان ان کی باتیں دھیان سے سنتے تھے، کسان اور مزدور دور دور سے آتے اور ان

کی کتابیں خرید کر لے جاتے تھے۔ وہ سب سبطِ حسن پر بھروسہ کرتے تھے۔ اس دانش ور کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس کی زبان محبت کی زبان ہے، اس کا لہجہ لگاوٹ کا لہجہ ہے، اس کی دلیل جذبات سے پاک ہے، وہ دیانت دار، سچا اور کھرا ہے۔ سبطِ حسن ان کے دلوں میں اور آنے والی نسلوں کے درمیان ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

سبطِ حسن نوجوانوں میں اتنے مقبول، اتنے محبوب کیوں تھے؟ اس سوال کا جواب تو نوجوان ہی دے سکتے ہیں، لیکن ایک بات واضح ہے کہ ہمارے نوجوان زندگی کے دورُخے پن سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ گھر میں، درس گاہ میں، دفاتر میں، تہذیبی اداروں میں، محفلوں میں، ہر جگہ اخلاق کے دو دو معیار قائم ہیں۔ 'صداقت اپنی جگہ، لیکن زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔'' اخلاق اپنی جگہ، لیکن اس طرح تو گزارا نہیں ہوتا۔' جی ہاں، آپ درست کہتے ہیں، لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔' سبطِ حسن نے اس منافقت کو زندگی کے اس دہرے رویے کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ نوجوانوں سے معذرت آمیز گفتگو کی، نہ انہیں یہ مشورہ دیا کہ سچ میں جھوٹ ملا کر اپنا مطلب نکالو اور دوسروں کو دھوکا دو۔ دعوت دی اور ان کے ذہنوں کو ایک ایسے انقلاب کے لیے تیار کیا، جس انقلاب کے بعد استحصال، نفرت، ظلم، خوف، خوشامد اور منافقت، یہ تمام لعنتیں ختم ہو جائیں گی، سبطِ حسن کا پیغام، دانش اور روشن خیالی اور محبت کا پیغام ہے۔

ہمارے زمانے کے نہایت قدآور ادیب، معلم اور نقاد جناب مجنوں گورکھپوری نے سبطِ حسن کے تعزیتی جلسے میں مختصر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ 'وہ ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک نظامِ فکر ہیں۔' اس خراجِ تحسین کے بعد کچھ اور کہنا جسارت ہوگی، سوائے اس گزارش کے کہ ہماری دانش گاہوں میں سبطِ حسن کے افکار اور ان کی علمی اور ادبی خدمات پر باقاعدہ مطالعہ اور ریسرچ کا آغاز کیا جانا چاہیے۔

کچھ سیّد سبطِ حسن کے بارے میں

منو بھائی

سیّد سبطِ حسن کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ 'لیل و نہار' کے دو شمارے بہت عرصے تک یادگار رہیں گے۔ ایک وہ شمارہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادیٔ ہند کی یاد میں نکلا تھا اور دوسرا 'لیل و نہار' کا حج نمبر۔

سیّد سبطِ حسن کی عالمانہ، صحافیانہ اور مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے لیے محض یہ دو شمارے ہی کافی تھے مگر سیّد صاحب تو اپنی صلاحیتوں کے ثبوت کے طور پر چھ تصانیف بھی چھوڑ گئے ہیں جو شاید آج کے مقابلے میں کل زیادہ اہمیت حاصل کرلیں اور معتبر ٹھہریں۔

جن دنوں 'لیل و نہار' کا 'حج نمبر' تیار ہو رہا تھا اور اس کی بیشتر کاپیاں تیار ہوکر چھپنے کے لیے پریس چلی گئی تھیں۔ سبطے صاحب سے کہا گیا کہ ابھی اداریہ نہیں آیا۔ انہوں نے اداریہ لکھ کر بھیج دیا تو اسٹاف کے کسی ممبر نے کہا سبطے صاحب 'حج نمبر' کا اداریہ بھی حج کے موضوع پر ہونا چاہیے تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ 'اگر اداریہ ہی لکھنا تھا تو نمبر نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔'

ان کی یہ بات اس وقت تو سمجھ میں آ گئی تھی کہ مدیر نے جو کچھ کہنا تھا نمبر میں کہہ دیا ہے چنانچہ الگ سے اداریہ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی مگر آج یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ آج ایسے نمبر نہیں نکلتے اور اگر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ اداریہ لکھنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے جیسے کچھ لوگ مضمون لکھنے کے بعد اس پر یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہ مزاحیہ مضمون ہے یا طنزیہ کے طور پر پڑھا جائے۔

یہ تحریر روزنامہ 'جنگ' (لاہور) میں ۲۳ر اپریل ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں منو بھائی کے کالم 'گریبان' میں شائع ہوئی (مرتب)۔

میں سیّد سبطِ حسن کی تحریروں اور مدیرانہ صلاحیتوں کا نیاز مند تو ضرور ہوں مگر ان سے میری کچھ زیادہ نیاز مندی نہیں رہی۔ مجھے جب لاہور آنا نصیب ہوا تو وہ لاہور بدر ہو چکے تھے بلکہ دربدر ہوکر کراچی پہنچ چکے تھے اور انہیں اپنی صحافیانہ اور مدیرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور صحافت کی خدمت کرنے سے منع کر دیا گیا تھا کیونکہ ہمارے معاشرے میں اعلیٰ معیاروں کو بعض لوگوں کے ذاتی مفادات پر قربان کر دیا جاتا ہے اور اس قربانی پر کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کی جاتی۔

میں نے سبطِ حسن کو ان کی تحریروں میں ہی پڑھا ہے فیض صاحب کی طرح ان کی محفلوں میں بیٹھ کر ان کی باتیں نہیں سنیں۔ ان کی باتیں دوسرے لوگوں سے ہی سنی ہیں۔ ان کی موت کے المیے کو بھی ان کے نامور ہم عصروں کے تاثرات سے ہی اخذ کرتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی نے انہیں ثقافت اور علم کے میدان کی عظیم شخصیت قرار دیا ہے اور 'لیل ونہار' کو ان کے صحافتی کارناموں کی کتاب کا قابلِ فخر باب سمجھا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے کہا ہے کہ سبطِ حسن ان پُراعتماد علماء میں شمار ہوتے ہیں جو دوسروں کے خیالات اور نظریات پر حملے نہیں کیا کرتے۔

سیّد غلام مصطفیٰ شاہ کا کہنا ہے کہ سیّد سبطِ حسن ایک بہادر اور جرأت مند عالم تھے انہوں نے پوری دیانتداری اور مکمل خلوص کے ساتھ اپنی معاشرتی ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور سماج کی عملی خدمت کی ہے۔

پروفیسر احمد علی کے مطابق وہ بہت نفیس انسان تھے، ان کی موت ایسے وقت ہوئی جب وہ ذہنی طور پر بھرپور جوانی کے دور سے گزر رہے تھے اور بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے اور بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ پروفیسر صفدر میر نے کہا ہے کہ سیّد سبطِ حسن ترقی پسند نظریات کے ایسے مبلغ تھے جنہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ ادب، سوشیالوجی، سیاست اور تاریخ کے مضمون میں ان کا علم بہت وسیع تھا۔ انہوں نے بڑی جرأت اور جوانمردی کے ساتھ سیاسی بلوغت اور آزادی کی حرمت کے مفاد میں انتھک کام کیا ہے اور ماحول کو روشن دماغی دی ہے۔

انتظار حسین کا کہنا ہے کہ ایک ایسے دور میں جب کہ ہم میں سے بیشتر محض نعرہ بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے سیّد سبطِ حسن نے زندگی کے حقائق اور نظریات کی ٹھوس بنیادوں سے اپنا تعلق استوار رکھا اور ایسی کتابیں لکھیں جو بہترین انسانی سوچوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور کہتی ہیں کہ دانشوری کا دعویٰ کرنا آسان ہے مگر دانشوری کا ثبوت مہیا کرنا ہر کسی کا کام نہیں، سیّد سبطِ حسن کی تصانیف یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ ہمارے عہد کے عظیم دانشور تھے جنہوں نے آزادیٔ اظہار کے دشمن ماحول میں روشن نظریات کی شمع روشن رکھی جو کہ بہت ہی مشکل کام ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی نے انہیں ایک نستعلیق، نفیس، شریف اور نیک انسان کہا ہے جو زندگی بھر ترقی پسند نظریات کی آبیاری کرتے رہے اور ترقی پسند مصنّفین کے حوصلے کا سبب بنے رہے۔

مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا کوئی وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب اس ملک کے سوچنے اور لکھنے والوں کو سوچنے اور لکھنے کی اجازت، سہولت، آسودگی اور یک سوئی نصیب ہوگی اور وہ جو کچھ سوچتے ہیں وہ لکھ بھی سکیں گے اور ان کی موت پر یہ کہنا نہیں پڑے گا کہ وہ جو کچھ کہنا اور لکھنا چاہتے تھے نہیں کہہ سکے نہیں لکھ سکے؟

سید سبط حسن، ایک ملتانی کی یادداشت میں

ڈاکٹر انوار احمد

۱۹۶۳ء تک میں جس سکول میں میٹرک تک کا طالب علم رہا، وہ شہر کا سب سے اچھا سکول تھا۔ تقریری مقابلے، مباحثے، ادبی محفلیں، ڈرامے، کھیل، بینڈ اور کتاب خانہ اس سکول کی بنیادی زینت میں اضافہ کرتے تھے مگر اس پر ایک مذہبی فضا چھائی ہوئی تھی۔ نجی ملکیت کے سکول ہونے کی وجہ سے بعض بہت اچھے اساتذہ تنقیدی انداز میں خود کلامی کرتے تھے مگر وہ باتیں سرعام نہیں کرسکتے تھے۔ ایسے استادوں میں شبیر حسن اختر تھے، لیاقت علی تھے، قمر الدین تھے، سید اسماعیل رُشدی اور مفتی نور محمد تھے یا پھر شہر میں پہلی آنہ لائبریریاں تھیں۔ پبلک لائبریری باغ لانگے خاں تھی مگر ہمارے لیے سب سے بڑی کشش کراچی کے دو اخبار تھے 'جنگ' اور 'انجام'، جس میں ابراہیم جلیس لکھتے تھے، شوکت تھانوی، اِبن انشاء اور کبھی کبھار سید سبط حسن بھی۔ کراچی کے یہ اخبار ٹرین کے ذریعے ڈیڑھ دن کے بعد ملتان پہنچتے تھے اس لیے ان پر دو دن بعد کی تاریخ لکھی ہوتی تھی۔ وہ دور جنرل محمد ایوب خان کی ہیبت کا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اہل پنجاب لمبے قد کاٹھ کے اس جرنیل کے اقتدار کے عادی ہو گئے۔ ملتان میں ایک مجاہد اسلام نسیم حجازی نے اپنا اخبار 'کوہستان' جاری کیا تھا جن کے ناولوں کے ہم سب حافظ تھے اور اُن کے مصنوعی اسلوب کے شیدائی، مگر اس کے مقابل چوک ڈیرہ اڈا پر ایک اخبار 'امروز' نکلتا تھا جس کے ادبی ایڈیشن میں کبھی کبھار فیض احمد فیض کی شاعری سے زیادہ پنڈی سازش کیس کے بارے میں کوئی حوالہ مل جاتا تھا یا پروگریسو پیپرز پر ایوب خان کے قبضے 'امروز'، 'پاکستان ٹائمز' اور ہفت روزہ 'لیل ونہار' کی ادارت میں تبدیلی کا بھی کوئی حوالہ آ جاتا تھا، یہی وہ اخبار ہے جس میں مسعود اشعر کی ادارت کے زمانے

میں کئی برس طالب علموں کے صفحے پر میں لکھتا رہا اور ایم اے کا نتیجہ آنے سے پہلے (فروری ۱۹۷۰ء) میں اس اخبار کے ڈیسک پر چھ ہفتے باقاعدہ کام بھی کرتا رہا اور غالباً یہ وہ حوالہ ہے جو سیّد سبط حسن سے پہلی ملاقات میں مؤثر حوالہ بنا۔ دوسری طرف ہمارے اسکول کے زمانے میں ہی ڈھاکہ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کی طالب علم قیادت کی کوئی تحریک یا نعرہ یا موقف ایک رومانوی خواب کی طرح لہراتا ہوا آتا تھا اور سکول میں ڈپٹی کمشنر، انسپکٹر آف سکولز، کمشنر ملتان، مخادیم ملتان اور مخیّر افراد کے رُو برو مؤدب یا سربجود فضا میں ایک تبدیلی سی آجاتی۔ بنیادی جمہوریت کے تحت الیکشن ہوئے تو 'امروز' ملتان میں بھی دبے دبے انداز میں آمرانہ دستور پر تنقید شروع ہوئی۔ چنانچہ ہمارے جیسے طالب علم ایف اے کے دوران ہی حبیب جالب اور فیض احمد فیض کے شیدائی ہونا شروع ہوئے پھر ایوب خان کے صدارتی انتخاب کا موقع آیا تو یک لخت درس گاہوں کی فضا تبدیل ہوگئی اور اس طرح محسوس ہونے لگا کہ اہلِ قلم، وکلا، اساتذہ اور طالب علم مل کر آمریت کے تیار کردہ ناقابل شکست بت کو پاش پاش کردیں گے۔ فاطمہ جناح سے عقیدت رکھنے والوں میں چند مذہبی لوگ بھی تھے اور دائیں بازو کے سیاسی کارکن بھی، مگر ملتان میں سید قسور حسین گردیزی، حبیب پاسلوی اور ٹریڈ یونین آرگنائزیشن کی سوشلسٹ قیادتوں کے ساتھ ساتھ 'امروز' اور 'نوائے وقت' بھی اپنے مزاج کے اختلاف کے باوجود ان کی موافقت میں ہم آہنگ ہوگئے، سو اسی فضا میں وہ انقلابی تحریکیں پروان چڑھیں جنہوں نے سٹڈی سرکل قائم کیے جن کی بدولت نئے سرے سے ترقی پسند تنظیم، منشور، امریکہ اور ان کے اتحادیوں کی طرف سے پاکستان کے روشن خیال اساتذہ اور طالب علموں کے لیے تنگ کیا گیا عرصہ اور سب سے بڑھ کر ایشیا سبز ہے اور ایشیا سرخ ہے کی کشمکش نے ایک عجیب رزم گاہ تیار کردی۔ یہی وجہ ہے کہ اعلانِ تاشقند سے لے کر سقوط ڈھاکہ تک کے قیامت خیز واقعات میں ایسی نسل پروان چڑھی جس کا تاریخی اور سیاسی شعور رجعت پسندی کی ہر قوت کا سامنا کرنے کیلئے تیار تھا اور یہی وہ وقت ہے جب علی عباس جلالپوری کے ساتھ سید سبط حسن بھی کھل کر اپنے موقف کا اظہار کرنے لگے۔

پاکستان کے مہاجرین وادیٔ سندھ کے بارے میں کچھ لکھنے سے ہمیشہ خوف زدہ رہے مگر سبط حسن نے اس ملک میں جہاں سرکار، مُلا اور بعض مہاجر، سرزمین کو پاکستان کی ایک ارضی حقیقت ننے سے خوف زدہ تھے وہ اپنے استدلال سے انہیں مسحور کرنے لگے اور پاکستانی ثقافت اور

تہذیب کے بارے میں بعض بنیادی تضادات رفع ہونے لگے، اسی ضمن میں 'ماضی کے مزار' کے حوالے سے جب انہوں نے قدیم مصری اور عراقی تہذیبوں کا مارکسی نقطہ نظر سے جائزہ لینا شروع کیا تو ہمارے ملتان کے ایک بزرگ مرزا ابن حنیف سے ان کی قلمی جنگ شروع ہوئی۔ یہ اور بات ہے۔ جب ۱۹۸۵ء میں شیزان ہوٹل ملتان میں میری سید سبط حسن سے پہلی ملاقات ہوئی (یہ ملاقات ہمارے دوست محمد نعیم چوہدری نے کرائی تھی، جو ایسٹرن فیڈرل یونین سے وابستہ تھے اور اُدھر اس انشورنس کمپنی کے مالک روشن علی بھیم جی نے سید سبط حسن کے فکری مشاغل کیلئے شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا)۔ اس ملاقات میں سید سبط حسن نے مرزا ابن حنیف کیلئے بہت اچھے الفاظ استعمال کر کے ہم ملتانیوں کے دل پر سے ایک بوجھ ہٹا دیا اور ساتھ ہی بتایا کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپریل ۱۹۸۶ء میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تقریبات منعقد کی جائیں۔ اس سلسلے میں وہ جاننا چاہتے تھے کہ ملتان یونیورسٹی اور شہر سے کتنے اہلِ قلم اس میں شرکت کر سکیں گے۔ سرائیکی لکھنے، بولنے اور پڑھنے کے حوالے سے یہاں کے مقامی لوگوں کا کیا خیال ہے اور ضیاء الحق دور میں ملتان کے اساتذہ، صحافیوں اور دانشوروں نے جو تکلیفیں برداشت کیں، ان سے رابطے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ مارچ ۱۹۸۱ء سے پہلے ایک جھکڑ ملتان کے روشن خیال اساتذہ کے یکلخت تبادلوں کا آیا جس میں اصغر ندیم سید کو ایمرسن کالج ملتان سے گورنمنٹ کالج شکر گڑھ بھیجا گیا، صلاح الدین حیدر، عابد عمیق، خالد سعید اور ایک درجن سے زائد دوسرے اساتذہ بھی پہلے تبادلوں کی زد میں آئے اور پھر انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں دیکھیں۔ میرے اپنے وارنٹ گرفتاری نکلے حالانکہ دوست مجھے محتاط اور سمجھدار خیال کرتے تھے۔ مجھے اپنے نام کی عمومیت کا فائدہ ملا اور شہر میں محمد انوار اور انوار الحق اور یونیورسٹی میں انوار الحسن پکڑے گئے جو پکڑنے والوں کو بتاتے رہے کہ ہمارا تعلق تو جماعت اسلامی سے ہے اصل بندہ تو شعبہ اُردو میں ہے۔ بہرطور ایک آدھ شاگرد کے گھر میں محسن نقوی اور میں چھپے رہے اور یوں ہمیں تہہ زمین جانے کا رومانوی تجربہ ہوا، بہرطور اس طرح کی کچھ باتیں سید سبط حسن سے ہوئیں اور ساتھ ہی ہم نے اُن سے کہا کہ ہمارے بعض لاہوری اور فیصل آبادی ترقی پسند دوست شد و مد سے سرائیکی زبان کو پنجابی کا ایک لہجہ قرار دے کر اس خطے کے ادیبوں اور اپنے درمیان ایک خلیج قائم کر رہے ہیں، اس لئے ہم لوگ مظہر عارف کی سرائیکی لوک سانجھ سے جذباتی اور فکری وابستگی رکھتے ہیں، حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک سے اختلاف

کرنے والے اُردو سپیکنگ ، مرزا ابن حنیف بھی سرائیکی لوک سانجھ کے ہمنوا ہیں۔ اس سے ذرا پہلے سید سبط حسن کا رسالہ 'پاکستانی ادب' کراچی سے شائع ہونے لگا تھا جس کی مدیر سعیدہ گزدر تھیں اور جس میں اصغر ندیم سید کی نظمیں باقاعدگی سے چھپ رہی تھیں۔ ہر مہینے اس رسالے کی کچھ کاپیاں کامریڈ ملک عطاء اللہ کی کتابوں کی اُس دکان سے برائے نام قیمت پر مل جاتی تھیں جو اصل دکان (نیا مکتبہ) کے جلائے جانے کے بعد اب فٹ پاتھ پر آ گئی تھی۔ ہمارے شہر اور شعبے کے بعض طالب علم تواتر سے جیل جاتے تھے اور اس دور میں بعض اچھے ڈپٹی کمشنروں (طارق محمود) اور پولیس افسروں کی مدد سے ہم سنٹرل جیل ملتان میں موجود، بعض سیاسی اسیروں کو کتابیں، روح افزا اور چینی وغیرہ بھجوایا کرتے تھے، اسی زمانے میں صفدر عباسی، فخر زمان اور جمیل عمر سے دوستی ہوئی۔

ہم کوئی تیس سے زائد لوگ پروگرام کے مطابق ایک ایسی ٹرین میں ملتان سے سوار ہوئے جس کے بیشتر ڈبے پنڈی اور لاہور کے پُر جوش ترقی پسندوں سے بھرے پڑے تھے۔ لاہوریوں اور ملتانیوں کی محبوب کشور ناہید عجیب مخمور انداز میں قیادت کررہی تھی۔ ہم سب کو یوں لگتا تھا کہ یہ سینکڑوں ادیب اگر کراچی میں پہنچ گئے اور وہاں تین روزہ کانفرنس ہوگئی تو ضیاء الحق کا تختہ اُلٹ جائے گا۔ ماجرا یہ تھا کہ ایک عرصے سے سنسر شپ، قید وبند، کوڑے، سر سے بڑی ٹوپیاں پہننے والوں کی مخبریوں کی بدولت ترقی پسند ادیبوں کو یوں لگتا تھا کہ وہ جنگل میں ہیں اور وہاں ایک لمبی رات اُتری ہوئی ہے۔ پہلی دفعہ اس کانفرنس کی بدولت لگتا تھا کہ کم وبیش پاکستان کے تمام بڑے لکھنے والے ضیاء الحق کی آمریت اور اسلام کے نام کے استحصال کے مخالف ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں ریاکاری کو فروغ دے کر اجتماعی وجود کو کھوکھلا کیا جارہا ہے۔ بہرطور اس سارے دھوم دھڑکے اور غلغلہ ہائے انقلاب کو فیض رساں بنانے کے عمل کے پیچھے سید سبط حسن کا مرکزی کردار تھا مگر وہ اپنے انکسار کی بدولت کوشش کرتے تھے کہ نوجوان قیادتیں مختلف شہروں میں اُبھاری جائیں۔ بعض ایسے سیشن بھی آئے جہاں ہمارے سینئر ادیبوں جیسے ظہیر کاشمیری اور حبیب جالب نے گرمی صہبا کے نتیجے میں سید سبط حسن کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا یا سرائیکی پنجابی کے سوال پر فخر زمان کو سرائیکی والوں کی موافقت کرتے دیکھ کر افضل احسن رندھاوا مار دھاڑ پر آمادہ ہو گئے یا بعض مبصرین مندوبین بن کر ووٹنگ کے حق کا مطالبہ بڑے اشتعال سے کرنے لگے مگر ایسے موقعوں پر

سید سبطِ حسن کی باوقار سنجیدگی، عالمانہ انکسار اور غیر معمولی رواداری ہمیں اُن کا اور زیادہ گرویدہ کرتی چلی گئی۔ اسی کانفرنس میں ہم نے بریخت کا وہ ڈرامہ دیکھا جسے منصور سعید نے گلیلیو کی داستان کے نام سے ترجمہ کیا اور اسلم اظہر کی ہدایات کے ساتھ سٹیج پر پیش ہوا۔ اس ڈرامے کو افتخار عارف نے ۲۰۱۰ء میں مقتدرہ قومی زبان سے شائع بھی کیا جو اب زکریا یونیورسٹی کے ایم فل اردو کے نصاب میں شامل ہے۔ اسی کانفرنس میں ایک طرف اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، محمد علی صدیقی اور دیگر بزرگوں کی فکر انگیز باتیں سننے کا موقع ملا، تراجم، شعری نشستیں اور افسانے کی محفلیں بھی ہوئیں جس میں ایک افسانہ میں نے بھی پیش کیا تھا۔ ہماری فکری زندگی میں یہ کانفرنس ایک بہت بڑا سہارا بن کر آئی جس کے نتیجے میں ہمیں زکریا یونیورسٹی میں کچھ کرنے کا موقع ملا، نئے فکری رفیقوں سے رابطے بحال ہوئے اور لگا کہ اب واقعی ظلم کے دن تھوڑے ہیں۔

سیّد سبطِ حسن کی بہت سی فکر انگیز کتب اور تحریریں ہیں، جن میں گراں قدر اضافہ بھی ہو رہا ہے کہ جو کچھ انہوں نے قلمی اور فرضی ناموں سے لکھا، وہ بھی ان سے اور پاکستان کی فکری تاریخ کے گم شدہ ابواب کی بازیابی کے عمل سے محبت کرنے والے مرتب کر رہے ہیں، مگر مجھے ان کی ایک کتاب 'شہرِ نگاراں' بہت پسند ہے، جس میں رفقا کو معروضیت کی خاطر چوکس رہنے کی تلقین کرنے والے بہت سی جگہوں پر بے خود ہو جاتے ہیں، اس میں سے دو اقتباس دیکھیے:

۱) 'ہوائی جہاز فراٹے بھرتا شہرِ نگاراں کی جانب بڑھتا جا رہا تھا اور میرے دل میں طوفان برپا تھا۔ یادوں کے شب چراغ کبھی جلتے کبھی مدہم ہوتے، یہ اخبار 'پیام' کا دفتر ہے۔ یہ قاضی عبدالغفار ہیں، یہ میرا پیارا دوست مخدوم ہے، دل فگاروں اور دل نوازوں کا چہیتا، نازنینوں اور ناز برداروں کا منظورِ نظر اور دکن کی بے چین روح کی شاعرانہ علامت، یہ بلبلِ ہند کا آستانہ زریں ہے، جہاں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل پڑی۔'[1]

۲) 'بعض اوقات جوالا مکھی پہاڑ کی چوٹی پر برف جم جاتی ہے اور سادہ لوح سمجھتے ہیں کہ پہاڑ کا دل بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے، ان کو کیا خبر کہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور جب پھوٹتا ہے تو اس کی ہیبت ناک آتش فشانی سے موت بھی لرز اٹھتی ہے'[2]

یہ انہی کا فیض ہے کہ زکریا یونیورسٹی ملتان سے اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک دن پہلے، ۹ جون

۲۰۰۷ء کو میں اپنے شاگردوں، دوستوں اور ترقی پسند موقف سے فکری وابستگی رکھنے والے احباب کے تعاون سے ترقی پسند مصنفین کا ایک ایسا نمائندہ اجتماع بھی کرانے میں کامیاب ہوا، جس میں اتفاق رائے سے جناب حمید اختر کو سیکرٹری جنرل منتخب کرلیا گیا، انہوں نے سید سبطِ حسن کی طرح ملتان کے دانشوروں اور محنت کشوں کی یک سوئی کا جس طرح ذکر کیا، اس سے اقتدار کے مراکز سے دور اس شہر میں خرد افروزی کی شمع تھامے دوستوں کے حوصلے پھر سے جواں ہو گئے۔ زکریا یونیورسٹی ملتان کی ڈاکٹر روبینہ ترین اور قاضی عبدالرحمٰن عابد نے اعلان کیا کہ وہ سید سبطِ حسن کی فکری خدمات پر پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ لکھوائیں گے، سو گذشتہ برس شعبے کے ریسرچ سکالر حماد رسول نے یہ اہم کام مکمل کیا، وہ اب ڈاکٹر حماد رسول ہو کر اس شعبے سے وابستہ ہیں، جو اپنی فکری پیش رفت کے لیے سید سبطِ حسن، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ارتقا گروپ اور ڈاکٹر سید جعفر احمد کو فیض رساں خیال کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد سبطِ حسن، 'شہر نگاراں'، کراچی: مکتبہ سوانیال، ۲۰۱۶، ص ۱۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۰

سبط حسن ___ ایک تاثر

ڈاکٹر فاخر حسین

۱۹۳۰ء کی آخری دہائی میں سید سبط حسن لکھنؤ میں روزنامہ 'نیشنل ہیرلڈ' میں صحافی تھے۔ اسے پنڈت جواہر لال نہرو نے قائم کیا تھا اور اس میں آزادی کے بعض نوجوان متوالے قلیل تنخواہ پر کام کرتے تھے، چنانچہ اس اخبار سے انہیں کبھی ستر روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہ مل سکی۔ اس سے قبل وہ اسی شہر سے رسالہ 'منزل' نکالتے تھے۔ بعد میں اس کا نام 'نیا ادب' ہوگیا۔ اس میں ان کے شریک کار سردار جعفری، مجاز اور مولوی محمد رضا فرنگی محلی تھے۔ اس رسالہ کا دفتر فرنگی محل میں بھائی رضا کے گھر پر تھا۔ اسی محلّہ میں میرا آبائی مکان بھی تھا۔ انسانوں کو زندگی کے راستے کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ وہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر بمبئی، امریکہ اور پھر پاکستان چلے گئے جہاں انہوں نے مستقل اقامت اختیار کرلی۔ لکھنؤ آنے سے قبل وہ حیدرآباد دکن میں ایک اردو اخبار میں کام کرتے تھے۔ راقم حروف کو اس کی زندگی کے نشیب و فراز ایک دوسری سمت لے گئے۔ ایک طویل مدت بعد یعنی تقریباً پینتیس برس بعد مجھے ان کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے اپنے لندن آنے سے مطلع کیا تھا۔ کوئی اس خط کا جواب اس کے علاوہ اور کیا دے سکتا تھا۔

چہ خوش است، زدو یک دل سرِ حرف باز کردن
سخنِ گذشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

سبط حسن کو لندن میں جب یہاں کی ادبی صبحوں اور شاموں سے مہلت ہوئی تو میری ان کی ایک تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس میں انہوں نے سب سے پہلے میرے بعض نجی امور پر براہ راست سوالات کیے جن کا تعلق میری ذات کے ساتھ ان کے تپاک اور سروکار سے تھا۔ یہ امر میرے لیے اس لیے قابل

توجہ بن گیا کہ ایسے بیشتر انسان اپنی ذات کے حصار میں کچھ اس طرح گرفتار ہوتے ہیں کہ دوسروں سے ان کا تعلق زیادہ تر اپنے مفاد کے معاملات تک محدود ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ 'کیا مضمون باندھا ہے' اور انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کے سامنے کا شخص یا بہت سے لوگ کیا کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں اور اپنی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔

سبط حسن کی مکمل زندگی اپنے معاشرے کے افراد اور مجموعی طور پر خود معاشرے کو بہتر بنانے کی سعی سے عبارت ہے۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ جب ہندوستان میں اشتراکیت کی کونپلیں پھوٹیں اور اشتمالی جماعت نے اپنی تشکیل کی تو اس کا مرکزی دفتر بمبئی میں قرار پایا وہ اس کے اردو اخبار 'قومی جنگ' کی ادارت میں سجاد ظہیر وغیرہ کے ہمراہ وہاں چلے گئے۔ اسی زمانے میں ان لوگوں نے مل جل کر اپنے دیگر کاموں کے ساتھ انجمن ترقی مصنفین کی باقاعدہ تشکیل بھی کی تھی۔ اس وقت جماعت کی طرف سے ان حضرات کی تنخواہ تقریباً پچیس روپیہ ماہانہ تھی جو بعد میں غالباً چالیس روپیہ اور پھر کچھ اس سے زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ لوگ مشترکہ طور پر جماعت کے 'کمیون' میں رہتے تھے اور اس رقم سے اپنے طعام و قیام کا خرچ ادا کرتے تھے۔ اپنے مقصد کے لیے اتنے ایثار اور ایسی قربانی کے مداح اس وقت بعض ایسے لوگ بھی تھے جو نظریاتی اعتبار سے اشتمالی جماعت کے مخالف تھے، اُسی زمانے میں شوکت تھانوی نے سبط حسن کے لیے لکھا تھا کہ جتنا چھوٹا قد، منہ میں اتنا ہی بڑا سگار لگانے والا یہ شخص سختیاں اٹھانے میں آہن ہے لگے ہاتھ یہ بات صاف کر دی جائے کہ وہ سگار لکھنؤ میں پیتے تھے اور انہوں نے یہ عادت تنگ دستی کے باعث بمبئی میں ترک کر دی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اشتمالی جماعت کے انگریزی اخبار (غالباً اس وقت 'پیپلز ایج') کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ گئے جہاں سے وہ ملک بدر کر دیے گئے۔ اس کے بعد پاکستان آئے اور پھر یہاں مقیم ہو گئے۔ یہاں ایک طویل عرصہ تک انہوں نے بڑی عسرت کی زندگی بسر کی اور پھر 'راولپنڈی سازش' کے تعلق سے قید و بند کا مقابلہ بڑی جوانمردی سے کیا۔ ہمارے لیے یہ یاد رکھنا اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ اس طرز کی بعض مثالیں آج تک ہمارے درمیان موجود ہیں جن میں کسی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان معاشروں میں افسرانِ حکومت عام طور پر اور پولیس اور جیل کے افسران خاص طور پر لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں کہ گویا شاعر ان سے یہ کہہ گیا ہے کہ 'سرِ عاشقاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی'۔ اس کے ساتھ اگر انہیں یہ علم ہو جائے کہ ان کے شکار کو پناہ دینے والے افراد موجود نہیں ہیں تو پھر انہیں کسی پس و پیش

کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا آزاد اکثر کہتے تھے'اب میں بے پناہ ہو چکا ہوں۔' سبط حسن پاکستان میں بے پناہ تھے۔ وہ جیل سے رہائی کے بعد بھی کافی عرصہ تک سخت مالی مشکلات کا شکار رہے۔ پھر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ نے اپنے ہفت روزہ 'لیل و نہار' کی ادارت ان کے سپرد کی۔ انہوں نے اس ہفت روزے کو خوب بنایا سنوارا مگر پھر ۱۹۵۹ء میں ایوب خاں کے مارشل لاء نے ان اخباروں پر قبضہ کر کے سبط حسن کو چلتا کیا اور وہ کچھ عرصہ تک اِدھر اُدھر بھٹک کر آخر بھیم جی کے انشورنس ادارے سے منسلک ہو گئے اور یوں انہیں معاشی آسودگی حاصل ہوئی۔ یہ سلسلہ آخر تک برقرار رہا اور وہ اس پر قانع رہے۔

ان کے مطالعے اور ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع عمر سے قائم تھا اور ان امور میں ان کی دلچسپی بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی نشاندہی کے لیے ان کی کتابیں موجود ہیں۔ سبط حسن مارکسی نظریہ کے قائل تھے مگر اس پر ان کی نظر اپنے جوش و خروش کے باوجود صائب اور معقول تھی۔ میرے خیال میں اردو نثر میں مارکسی نقطۂ نظر پیش کرنے میں جتنی کامیابی انہیں حاصل ہوئی اتنی کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی ہے کبھی کبھی بعض جوشیلے مارکسی اور اس سے کہیں زیادہ اس نظریہ کے مصنوعی اور جھوٹے طرفدار مختلف امور میں مارکس کے نام کا ایک انجکشن دے کر خود کو ترقی پسند قرار دینے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ ان کے برخلاف مارکسی تعلیمات پر سبط حسن کی فکر علم پر مبنی تھی اور وہ اسے تخلیقی اعتبار سے کام میں لاتے تھے۔ وہ سارتر کے جانباز کے مانند اس بات کے قائل ہیں (ترجمہ) 'تم اپنی زندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو۔' ان کی تصنیف 'ایران میں انقلاب' اس کی ایک مثال ہے جس میں مصنف نے اپنے موضوع کا جائزہ جدلیاتی فکر کے مطابق کیا ہے۔ اس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ انقلاب ایران کے بعد اس ملک کی دولت لوٹنے کے لیے غیر اسلامی سرمایہ داروں نے جو جال پھیلائے تھے اس میں ایرانی حکمراں کیوں اور کس طرح پھنس گئے۔ ان سرمایہ داروں کے ساتھ ان کے کارندوں کی حیثیت سے اور ان کے علاوہ چند لوگ مذہب کے نام پر یہ دولت جمع کرنے والے بھی ہیں۔ اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ان حضرات نے خمینی صاحب کو امام کا مرتبہ کیوں عطا کر دیا۔ جبکہ شرعی اعتبار سے امام صرف بارہ ہوتے ہیں اور ان میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مزید یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انقلاب کے بعد نئی حکومت کے عہدہ داروں نے اپنے ملک کے انقلابی کارکنان یعنی اشتراکیوں اور اشتمالیوں کی پینتیس ہزار سے زیادہ تعداد کو جیل

میں محبوس کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ یعنی اس تصنیف میں اس مجموعی صورتِ حال کا جائزہ ملتا ہے کہ آج ایران کی وہ صورت حال کیوں ہے جیسی کہ ہے۔ یہ جائزہ لینے والا اس پر قلم اٹھاتے وقت اپنے قلم کے فن سے بھی آگاہ ہے۔ اس کی سادہ نثر کا اسلوب تھامس پین کے اس اسلوب کے مانند ہے، جس پر تونیو کروگے کہتا ہے (اردو ترجمہ) 'وہ (تھامس پین) امور کے باطن کو اُلٹ دیتا ہے۔'

سبط حسن کی میراث کیا ہے؟ سب سے قبل یہ کہ ہمیں مجہول باتوں اور رائج وقت امور میں پناہ ڈھونڈنے کے بجائے اپنے معاشرے کے حقائق سے واقعی آنکھیں ملا کر اسے بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر اس سعی میں ہر شخص اپنے حسبِ مقدرت اپنی ذاتی خواہشات اور تن پروری کو خیرباد کہہ سکے اور اسے ایسا کرنا چاہیے۔ وہ اس کی ایک اعلیٰ مثال اپنی زندگی میں پیش کر چکے ہیں۔ فرانس کی مدافعتی تحریک کے سربراہ ژان پولان کے قتل کے بعد جب ان کی بہن سے پوچھا گیا کہ ان کے نزدیک اس مجاہد کی زندگی کس اعتبار سے اہم ہے، تو وہ یہ جواب دیتی ہیں 'اپنے مقصد کے لیے زندگی میں اس حد تک کرب اور تشدد برداشت کرنا جو عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔' دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں جب جرمنی میں ہٹلر کو جسمانی طور پر ختم کر دینے کے لیے بم کی سازش ناکام ہوگئی تو ہٹلر کے حکم خاص کے مطابق اس سازش کے سربراہ کاؤنٹ اسٹافن برگ کو گولی مار کر ہلاک کرنے کے بجائے اس کے گلے میں قصائی کا کانٹا لگا کر اس کا کام تمام کیا گیا تھا۔ اس خدمت کو انجام دینے والے نے اس سے سوال کیا 'تم نے ایسا کیوں کیا۔ تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ اگر ہٹلر کے خلاف تمہاری سازش ناکام ہوگئی تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟' اسٹافن برگ جواب دیتے ہیں 'تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ ایک اور جرمنی بھی تھا۔' سبط حسن دانشوری، اخلاق اور اخلاقیات کے اعتبار سے بھی ایک غریب معاشرے میں ژان پولان اور اسٹافن برگ کی طرز کے انسان ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے معاشرے کو اعلیٰ اور بہتر بنانے کی سعی کرتے ہیں اور ایسا کرنے کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ ان کے بعد کی نسل اگر اس پر توجہ نہ دے اور اس اثاثہ پر اپنے جرأت مند کارناموں کا اضافہ نہ کر سکے تو یہ اس کی کوتاہی ہوگی اس طرح اس کا بدقسمت معاشرہ مزید زبوں حالی کی طرف بڑھتا رہے گا۔

میرے لیے اس صورتِ حال میں ایک ذاتی غم بھی شامل ہے۔ سبط حسن اور اس زمرہ کے بعض دیگر حضرات میرے ماضی سے متعلق ہیں جن سے میرا تعلق اوائل عمری میں قائم ہوا تھا۔ میری عمر کی درازی کے ساتھ ان حضرات کا رفتہ رفتہ اٹھتے جانا مجھے اپنے ماضی سے دور کرتا جارہا ہے لیکن یہ تو زندگی کی شرط ٹھہری۔

سبطِ حسن ___ یادوں کے جھلملاتے چراغ

زاہدہ حنا

خالی ہوا جہاں، جو گئے ہم جہان سے

وہ صدیوں بھی رات تھی۔ اس رات سے پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تنہائی اور بے بسی کی وہی ایسی گھڑی دِلّی میں بھی آسکتی ہے۔ میرے اجداد دِلّی کے وفادار تھے۔ بادشاہ وقت کو نذر نیاز گزارتے تھے اور لال قلعے کی طرف پیر کر کے نہیں سوتے تھے۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ قلعہ کے زوال کے ڈیڑھ صدی بعد دیالو، مہربان اور مہابلی دِلّی ترقی پسندوں کے قلب لشکر سے ان کے سب سے بانکے اور سجیلے ادیب کو یوں چشمِ زدن میں اڑا کر لے جائے گی۔

اس رات یادوں کے برے دل کے چیتھڑے کرتے رہے۔ میں نے سبطے بھائی کی سناؤنی پٹنہ میں سنی تھی اور اسی روز کی فلائٹ سے دِلّی پہنچی تھی۔ میرے میزبان محمد علی حیدر نقوی سبطے بھائی کی باتیں کرتے رہے پھر جب وہ سونے چلے گئے تو میں بستر چھوڑ کر سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی گیلری کے فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے مرشد، میرے باپ، میرے دوست کا چہرہ کس طرف ہے پھر اس رات میں اپنے پیر کیسے پھیلاتی؟

فضا پر شدید حبس طاری تھا اور رات بہت گرم تھی۔ سبطے بھائی کو گرمی سے اور حبس سے نفرت تھی، شاید اسی گرمی اور حبس سے اکتا کر وہ ہم سب سے روٹھ گئے تھے اور مورگ کے خنک یخ بستہ ماحول میں ابدی نیند سو رہے تھے۔ خاک پریاں کی درویشانہ ہم نے بچھایا بستر آج۔

سبطِ حسن صاحب کے حوالے سے زاہدہ حنا کے زیرِ نظر دو کالم روزنامہ 'جنگ' (کراچی) میں شائع ہوئے۔ پہلا کالم 'خالی ہوا جہاں، جو گئے ہم جہان سے' ۱۰ راپریل ۱۹۸۷ء اور دوسرا 'سبطِ حسن کا پیمانِ وفا' ۱۶ رمئی ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا (مرتب)۔

وہ شخص جس نے گزشتہ برسوں میں سینکڑوں ہزاروں کو زندگی بسر کرنے کا شعور دیا تھا، جس نے نوجوانوں کو اپنی تحریروں سے بتایا تھا کہ فکری سطح پر کیا صحیح ہے اور کیا غلط، جس کی کج کلاہی جینے کا حوصلہ دیتی تھی اور جس کا ایمان تھا کہ مشتعل ہونا قوتِ استدلال کی کمی کی علامت ہے اور کہتا تھا کہ خیالات کو بہتر خیالات ہی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ وہی شخص سارے قصے ختم کر گیا تھا۔ علم و دانش کے دفتر لپیٹ کر رکھ گیا تھا۔ بادشاہِ وقت تھا میں، تخت تھا میرا دماغ۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا۔ کسی نے مجھ سے سرگوشی کی۔ ہاں وہ روشن دماغ واقعی نہیں رہا جس کی تحریروں کی روشنی سے علم کے جویا اپنے ذہن منور کرتے تھے۔ جسے اپنے کام سے، اچھی کتابوں سے اور روشن خیالی سے عشق تھا۔

اور عشق تو سبطے بھائی کو لکھنؤ سے بھی تھا۔ یہی عشق انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں انہیں ۴۰ برس بعد لکھنؤ کھینچ لایا تھا۔ دو برس پہلے جب وہ دلّی لوٹ کر آئے تو میں نے لکھنو نہ جانے کا سبب پوچھا، کہنے لگے ’بی بی، ہم وہاں جا کر زندہ تو نہیں پھریں گے بس مر جائیں گے۔‘ لکھنؤ نہ جانے کا یہ اچھا بہانہ تراشا ہے آپ نے۔ بھلا یوں شہروں کے عشق میں کوئی جان سے جاتا ہے؟

’تم چونکہ بالکل اکارت ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکتیں‘، انہوں نے ہنس کر کہا اور خاموش ہو گئے۔

اس رات جب مجھے دو برس پہلے کی یہ بات یاد آئی تو دل پر بھالا سا لگا۔ ہاں سبطے بھائی آپ ہی سچے تھے۔ چالیس برس پرانی یادوں کی یورش یوں جان لیوا ہوگی۔ یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔
میری آنکھوں کے سامنے نو دن پہلے کا منظر کھنچ گیا۔ ۱۱/اپریل ۱۹۸۶ء ہے، لکھنؤ کی مدھ ماتی رات ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے اور اب ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں کے جلوس کی تیاریاں ہیں۔ حبیب تنویر کا آدی باسی رقاصوں کا طائفہ اپنے روایتی لباس میں موجود ہے، گولڈن جوبلی تقریبات چار باغ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ریوندرالے میں ہوئی ہیں۔ یہاں سے جلوس تقریباً آٹھ کلومیٹر دور رفاہِ عام کلب تک جائے گا۔ اسی کلب میں آج سے پچاس برس پہلے منشی پریم چند کی صدارت میں چند سر پھرے ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا سالانہ جلسہ منعقد کیا تھا۔ جانے ان لوگوں کو اندازہ بھی

تھا یا نہیں کہ ان کی انجمن برصغیر کے ادبی منظر نامے میں کیسی انقلابی تبدیلیاں لانے والی ہے، کیسے کرشمے دکھانے والی ہے۔

اس وقت بھی نعرے لگ رہے ہیں، صف بندیاں ہو رہی ہیں۔ آگے آگے ایک ٹرک ہے اور اس کے پیچھے کیفی بھائی کی گاڑی۔ ٹرک میں انڈین پیپلز تھیٹر کے نوجوان بھرے ہوئے ہیں۔ شوکت اعظمی زور زور سے نعرے لگا رہی ہیں۔ پھر ایک نوجوان بہت دلکش آواز میں مجازؔ کی نظم پڑھنے لگتا ہے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھروں
اے غمِ دل کیا کروں
اے وحشتِ دل کیا کروں

سبطے بھائی یہ آواز سن کر بے تاب ہو گئے ہیں، سیّد محمد مہدی ان کے پہلو میں ہیں، وہ ان کا شانہ تھپکنے لگتے ہیں پھر گھوم کر کیفی بھائی کو دیکھتے ہیں مجھے دیکھتے ہیں، اس وقت ظالم کو مجازؔ بے طرح یاد آ رہا ہے کیسی کیسی دھومیں مچائی ہیں ان گلیوں میں اس کے ساتھ، وہ ایک گہری سانس لیتے ہیں اور پلٹ کر اپنا پائپ سلگانے لگتے ہیں۔

اسی لمحے ہم میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ پھولوں اور یادوں کی خوشبو سے معطر لکھنؤ کی ہوائیں اپنے چاہنے والے کے بدن کو آخری مرتبہ چوم رہی ہیں اپنے عاشق کی پیشانی پر رخصتی بوسہ ثبت کر رہی ہیں۔ اس سے چپکے چپکے کہہ رہی ہیں، میاں بس یہاں سے چلو نکلو، تم ہم سے عشق کرتے ہو اور ہم بھی تمہیں بہت عزیز رکھتے ہیں۔ تمہاری آخری ہچکی ہم سے سہی نہیں جائے گی۔ دِلّی جاؤ......اسی غارت گر شہر میں اتنا حوصلہ ہے کہ تمہارے نصف وجود کو اپنی مٹی میں سمیٹ لے اور بکھو کھلے بدن کو کراچی بھیج دے۔

ہم تو اس لمحے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ عالم تنہائی کی وہ رات بھی عجیب تھی۔ اس رات بیزاری جب حد سے بڑھی تو جانے کہاں سے سبطے بھائی سایہ سے پاس آ بیٹھے سمجھاتے رہے۔

'یہ سوچو تو سہی کتنا خوش بخت ہوں میں کہ آخری لمحے تک اپنے کام سے اور اپنی زندگی کے مقصد سے جڑا ہوا رہا، کیسی بھرپور زندگی تھی، کیسی قابلِ رشک موت ہے کمال ہے تم میری اس خوش

نصیبی پر روتی ہو۔

پھر وہ حسبِ معمول ڈانٹنے لگے۔ زندگی میں بھی ان کی عادت تھی کہ جب بہت ناراض ہوتے تو نہایت تکلف سے گفتگو کرتے۔ اس وقت بھی ان کا سایہ 'تم' سے 'آپ' پر اتر آیا اور میں جو ان کی ناراضی کے سامنے فوراً ہی سپر ڈال دیتی تھی، بے چون و چرا ان کی ہر بات مان لیتی تھی، اس رات شدتِ غم میں گستاخ ہوگئی اس رات میں نے ان کی کوئی بات نہ مانی انہوں نے بھلا کب میرا انتظار کیا تھا کہ اب میں ان کی بات مانوں۔

چند ہی گھنٹوں پہلے نور ظہیر نے روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ باجی صرف دو دن پہلے ہی تو سبطے چچا میرے ساتھ پی آئی اے آفس آئے تھے۔ نقوی صاحب سے ملے تھے۔ ان سے آپ کی واپسی کی تاریخ معلوم کی تھی اور جب حتمی طور پر یہ معلوم ہوگیا تھا کہ آپ ۲۱ کو دِلّی پہنچ رہی ہیں تو کہا تھا نقوی میاں ہمارا جی تاج دیکھنے کو چاہ رہا ہے۔ وہ آجائے گی تو آگرہ چلیں گے۔ آپ تاج ایکسپریس میں سیٹیں ریزرو کرالیں، تو زاہدہ باجی، نقوی صاحب نے اسی وقت ۲۲ تاریخ کے لیے سیٹیں ریزرو کرائیں پھر فون پر آگرے میں مغل شیرٹن کی مینیجر مکی بروچہ سے بات کی اور تین کمرے بک کروائے۔ سبطے چچا بچوں کی طرح خوش ہوگئے تھے، بہت لطف آئے گا، تاج کو چاندنی میں دیکھیں گے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ دولت کا سہارا لے کر ایک شہنشاہ نے ہم غریبوں کی محبت کا مذاق آخر کیوں کر اڑایا ہے۔ صاحب اس کی مجال کیسے ہوئی۔ اسے ذرا ڈانٹ کر آئیں گے۔ اور زاہدہ باجی کیسا ستم ہے کہ جس روز وہ آپ لوگوں کے ساتھ آگرہ جانا چاہتے تھے اسی روز ہمیشہ کے لیے کراچی جارہے ہیں ایک شہنشاہ کو ڈانٹے بغیر۔

نور ظہیر کی رندھی ہوئی آواز چاندنی کے دھندلکے میں کہیں کھوگئی تو مجھے غصہ آنے لگا۔ سبطے بھائی سے جھگڑنے لگی، آپ تو وقت کے بہت پابند ہیں، کوئی ذرا بھی دیر سے پہنچے تو آپ کو جلال آجاتا ہے۔ تاج ایکسپریس آپ کے بغیر چلی جائے گی، آپ اٹھتے کیوں نہیں چلتے کیوں نہیں......؟

سبطے بھائی میرے ہذیان پر مسکراتے رہے پھر پو پھٹی تو یوں چلے گئے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ جیسے کام کے کچھ وعدے ہی نہ تھے، جیسے نئی کتابوں کے منصوبے ہی نہ تھے۔ 'وعدے کر دہو برسوں کے تم، دم کا بھروسا ہم کو نہیں' کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے یہاں اِک آن کے بیچ۔

اس رات یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ نہیں ہیں تو زندگی کا سنہری پن چھن گیا ہے اتنا زندگی پر ور

اور زندگی دوست شخص ختم بھی ہوسکتا ہے؟ اس کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ گزشتہ پانچ برسوں میں انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا اور ہر حال میں دیکھ کر یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ زندگی کے رنگ و آہنگ سے چھلکتے ہوئے انسان ہیں۔ حسن، توازن، تناسب، تہذیبِ نفس، دل گیری و دلبری ان کی شخصیت کا بنیادی جزو تھی۔ دنیائے ادب کی بڑی شاعری انہوں نے اپنے وجود میں اس طور جذب کی تھی کہ شخصیت میں اس کا رچاؤ اور گداز صاف نظر آتا تھا۔ برصغیر کی زبانوں سے انہیں محبت تھی، اردو فارسی کے تو وہ عاشق تھے۔ حافظؔ انہیں حفظ تھا اور میرؔ از بر۔

دِلّی میں آدھی رات گئے ان کے عزیز اور قدیم دوست پریم ساگر گپتا جب انہیں ایمبولینس میں لے کر روانہ ہوئے تو حالت خاصی بگڑ چکی تھی ان سے کہنے لگے میاں بس اب گلے مل لو جی کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا، پریم جی نے انہیں گھُر کا تو ہنس دیئے۔

میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے انٹینسیو کیئر یونٹ میں اپنے چہیتے دوست اور ساتھی سجاد ظہیر کی بیٹی نور ظہیر کے ہاتھوں میں جب دم توڑ رہے تھے تب بھی ہنس ہنس کر ڈاکٹروں کو شعر سناتے رہے۔ میرؔ اور غالبؔ کے، مجاز، مخدوم اور فیضؔ کے شعر، پھر انہوں نے جوشؔ کی ایک رباعی سنائی۔ آخری مصرعہ زبان سے ادا ہوا تو چہرہ اچانک سرخ ہو گیا، بدن پر تشنج کی کیفیت طاری ہوئی، ڈاکٹروں نے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے دل کو سنبھالنا چاہا تو سبطے بھائی نے اس لا حاصل کاوش پر مسکرانے کی کوشش کی۔ انہیں زندگی سے عشق تھا لیکن زندگی اب دامن چھڑا رہی تھی۔ تابِ عشق نہیں ہے دل کو، جی بہت بے طاقت ہے اب، یعنی سفر ہے دور کا آگے اور اپنی رخصت ہے اب اور بس۔ پھر وہ رخصت ہو گئے...... پیس میکر لگانے کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں انہیں کسی انسان کا احسان اٹھانا گوارا نہ تھا پھر کسی آلے کے ممنونِ کرم کیوں ہوتے۔

اسی تنہا ماتم داری میں وہ صدیوں لمبی رات گزر گئی۔ دن نکلا۔ گیارہ بجے پھر بارہ بجنے لگے سبطے بھائی کو لے کر آنے والی ایمبولینس اور میری سواری ساتھ ساتھ پہنچی۔ ان گناہ گار آنکھوں نے کھلی ہوئی ایمبولینس میں ان کا تابوت دیکھا تابوت آڑا رکھا ہوا تھا غسال کے حواریوں میں سے تین تو ادھڑی ہوئی سیٹ پر بیٹھے تھے جبکہ خشونت زدہ چہرے اور ننگے پاجامے والا غسال تابوت کے ایک کونے پر چڑھا بیٹھا تھا۔

میرے سینے پر گھونسا لگا۔ سبطے بھائی چلتے تھے تو میں احترام میں ان سے دو قدم پیچھے چلتی تھی۔

بھئی تمہیں لیڈیز فرسٹ والا اصول کیوں یاد نہیں رہتا؟ وہ عموماً رُک کر پوچھتے۔
'آپ کے ساتھ یہ اصول نہیں چلے گا آپ عالم ہیں اس لیے محترم ہیں اور اسی لیے آگے چلیں گے ہم تو بس آپ کی پیروی کریں گے۔ شریعت میں بھی طریقت میں بھی،' وہ مسکرا کر گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔
ان آنکھوں نے اس دن اور بھی بہت کچھ دیکھا۔ وہ پہلا دن تھا جب دِلّی کچھ غیر سی لگی، کچھ پرانی سی، گزشتہ شام غالب اکیڈمی کے تعزیتی جلسے میں اعلان تو ہوا تھا کہ تابوت کتنے بجے سفارت خانے پہنچے گا اور کتنے بجے وہاں سے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوگا لیکن اس دوپہر جو چہرے سبطے بھائی کو آخری سفر پر رخصت کرنے کے لیے آئے وہ اتنے گنے چنے تھے کہ مجھے آج بھی یقین نہیں آتا۔ ترقی پسندوں کے سب سے تیکھے سب سے طناز ادیب کی برات جب دِلّی سے اُٹھی تو اتنی خاموشی سے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، جیسے کسی کو شامِ غریباں کا علم ہی نہ ہو۔ اے صبحِ وطن تو مجھے بے وطنی ہے۔
ضبط کے پیرہن کی ایک ایک سیون ادھڑ رہی ہے۔ سارے بخیے کھل رہے ہیں ہم پاکستانی سفارت خانے کے ایک ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہیں اور سبطے بھائی چند کھردرے اور اجنبی ہاتھوں میں تنہا ہیں اور جانے سفارت خانے کے کس حصے میں چھپے ہوئے ہیں۔
پھر ہمیں بلایا جاتا ہے ہم ٹھنڈے کمرے، ہال اور راہداریاں طے کرتے چلے جاتے ہیں اور آخرکار سفارت خانے کی عمارت سے باہر جھلستی ہوئی دوپہر میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ تابوت سفارت خانے کی عمارت کے باہر عقبی حصے میں رکھا ہے۔ ہندوستانی مسلمان، پاکستانی ویزے کے لیے اسی جگہ قطاریں لگاتے ہیں۔ چھٹی کا دن ہے پاکستانی سفارت خانے کا نچلا اسٹاف اس کی عورتیں اور اس کے بچے سبطے بھائی کے آخری دیدار کے لیے دھوپ میں کھڑے ہیں وہ جن کے لیے درد رکھتے تھے۔ جنہیں ایک لاطبقاتی سماج میں زندگی بسر کروانے کی خواہش انہیں بے آرام رکھتی تھی، وہی میلے کچیلے کپڑوں والے ادھڑے ہوئے جوتوں اور آنکھوں میں کسی خوب صورت آئندہ کے خوابوں والے انہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔
سبطے بھائی گرم دوپہر میں ٹھنڈی میٹھی نیند سوتے ہیں مجھے یقین آ جاتا ہے کہ سبطے بھائی نہیں رہے تب ہی تو وہ خاموش راضی برضا لیٹے ہیں۔ وہ کہ جن کی ٹھوکروں میں عہدے اور عہدیدار رہتے تھے۔ منتظر ہیں چند افراد کے کہ وہ آئیں اور نمازِ جنازہ کی رسم ادا کریں۔ صدرِ مملکت کا پیغام

نشر ہو چکا۔ یہ تزک واحتشام یہ انتظام وانصرام اس نشریے کے بعد کا ہے۔
ابھی تک مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے سب کچھ خواب ہے آنکھ ابھی کھل جائے گی۔ لیکن جب نماز کے لیے صف کھڑی ہوتی ہے تو مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہتا۔ شارب میرا عالم دیکھتے ہیں تو فوراً میرے پاس آتے ہیں اور اپنے نرم اور میٹھے لہجے میں مجھے دلاسہ دیتے ہیں۔ قمر رئیس لپکے ہوئے آتے ہیں 'آپ تو بہت بہادر ہیں، بہادر کہیں اس طرح روتے ہیں؟ عاشور کاظمی مجھے بہلا رہے ہیں 'بی بی، سبطے بھائی ختم کہاں ہوئے وہ تو اپنی کتابوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہمت سے کام لو۔'
'یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں میں تو وہ بچی ہوں جس کا ہاتھ زندگی کے میلے میں اس کے باپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے میں کیسے چپ رہوں کہ یہ شخص تو ہم سب کے سروں پر آسمان کی طرح قائم تھا۔ اب وہ نہیں رہا تو زمین آسمان' اپنے نہیں لگ رہے۔
نماز ختم ہوتی ہے گہوارہ اٹھا کر قدرے سائے میں لایا جاتا ہے کوئی ان کے چہرے سے کفن سرکا رہا ہے 'حضرات آخری دیدار کر لیجیے' ایک آواز آتی ہے اور میں تڑپ کر پیٹھ پھیر لیتی ہوں، سبطے بھائی سے دور چلی جاتی ہوں، پھر میں قریبی دیوار سے لپٹنے لگتی ہوں میں انہیں اس عالم میں بھلا کیسے دیکھوں گی۔ نہیں انہیں میری آنکھوں میں زندہ رہنے دو۔ عاشور کاظمی مجھے سمجھاتے ہیں لیکن جب میں ان کی نہیں سنتی تو وہ مجھے کھینچتے ہوئے گہوارے تک لے جاتے ہیں انہیں یوں دیکھے بغیر تمہیں اعتبار نہیں آئے گا۔ یہ آخری قرض ہے اسے اتار دو، وہ مجھے سمجھا رہے ہیں، پھر عورتوں اور بچوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے مجھے سبطے بھائی کے روبرو کر دیتے ہیں۔
شہد سے گندھے ہوئے، دودھ سے دھلے ہوئے اور علم سے اجالے ہوئے سبطے بھائی سو رہے ہیں رنگت زرد ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ چہرہ ایک طرف کو قدرے جھکا ہوا ہے میں نے زندگی میں انہیں کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نوشابہ نے بار بار دیکھا ہوگا لیکن آخری نیند میں نے دیکھی۔
میں ان کی طرف جھک جاتی ہوں سبطے بھائی ہمیں معاف کر دیجیے کہ ہم نے کام آپ کے حکم اور آپ کی خواہش سے بہت کم کیا۔ ہم نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا کچھ بھی نہیں جانا۔ ہم تو بس یہ سمجھتے رہے کہ آپ ہمارے سر پر آسمان کی طرح ہمیشہ قائم رہیں گے۔
میں گہوارے میں سوئے ہوئے آسمان کو دیکھتی ہوں اور بے قرار ہو کر پیشانی چوم لیتی ہوں۔
'میت کی بے ادبی نہ کیجیے' کوئی مجھے بے طرح جھڑکتا ہے۔

سبطے بھائی سے بے ادبی اور میں؟ نوشابہ کیا تمہیں یقین آ سکتا ہے اس بات پر؟
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے اور سجدہ ہر ہر گام کیا

سبطِ حسن کا پیمانِ وفا

چند دنوں پہلے کراچی پریس کلب میں جب سیّد سبطِ حسن کی چوتھی برسی منائی گئی تو میں ان کے چاہنے والوں کی باتیں سن کر سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا دل گیر و دل پذیر شخص تھا کہ جسے یاد کرتے ہوئے پروفیسر کرار حسین جذباتی ہو جاتے ہیں اور تاج بلوچ کی آواز رندھ جاتی ہے۔

اس روز قبلہ پروفیسر کرار حسین اپنی ناسازیٔ طبع کے سبب جلسے میں شریک نہ ہو سکے تھے لیکن انہوں نے اپنا مختصر پیغام بھجوایا تھا جس میں انہوں نے کہا کہ سبطے میرے روحانی بھائی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی انسان دوستی تھی۔ ہمارا ان کا رشتہ بھی انسان دوستی اور وسیع المشربی کا تھا، کچھ لوگوں کا مسلک ایسا ہوتا ہے جو انسانوں کو خانوں میں بانٹ دیتا ہے لیکن سبطے بھائی کا مسلک، ان کا نظریہ انسانوں کو خانوں میں نہیں بانٹتا تھا اور یہی ان کی ذات کا سب سے بڑا وصف، سب سے بڑا حسن تھا۔'

اور تاج بلوچ جب بولنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے اپنی خوب صورت تحریر کا اختتام یوں کیا کہ 'آج سے چار برس پہلے جب میں نے آل انڈیا ریڈیو کی سندھی سروس سے سبطِ حسن کی موت کی خبر سنی تو دل پر گھونسا لگا۔ مولانا گرامی 'مولوی عبیداللہ سندھی اور کامریڈ حیدر بخش جتوئی کی موت کے بعد ہم سندھی نوجوانوں نے اپنے آپ کو یتیم محسوس کیا تھا، اس رات سبطے بھائی کے چلے جانے کی خبر سن کر مجھے یوں لگا جیسے ہم سندھی نوجوان ایک بار پھر یتیم ہو گئے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم اب کس کی طرف دیکھیں گے اور کون ہمیں درست راستہ دکھائے گا۔'

اس روز کراچی پریس کلب میں ان کی یادوں کے چراغ جھلملاتے رہے اور میں یہی سوچتی رہی کہ انسانوں کو خانوں میں نہ بانٹنے والا اور نوجوانوں میں علم و تحقیق کا شوق پیدا کرنے والا کیسا من موہنا انسان ہمارے درمیان سے چلا گیا ہے کہ اس کی رخصت کے اتنے دنوں بعد بھی اس کی یاد نہیں دھندلاتی اور اس کا وجود سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

میں نے انہیں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ 'ماضی کے مزار' پر کام کر رہے تھے۔ اس سے بہت پہلے اس کتاب کا ایک باب 'گل گامش کی داستان' کے عنوان سے 'نقوش' میں چھپ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گرہ میں بس کا کرایہ بھی مشکل ہی سے ہوتا تھا اکثر کالج یا کام پر جانے کے لیے میلوں پیدل چلنا پڑتا تھا چنانچہ میں نے کسی سے 'نقوش' میں چھپ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گرہ میں بس کا کرایہ بھی مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ اکثر کالج یا کام پر جانے کے لیے میلوں پیدل چلنا پڑتا تھا، چنانچہ میں نے کسی سے 'نقوش' کا وہ شمارہ مستعار لے کر پڑھا تھا اور سبطِ حسن کا نام بھی اپنے محبوب مصنّفین کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔

'لیل و نہار' کی بندش کے بعد قید و بند کی صعوبتیں اٹھا کر اور زمانے کا سرد و گرم چکھ کر وہ نئے نئے کراچی آئے تھے اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسے مستحکم کاروباری ادارے سے وابستہ ہوئے تھے جس نے انہیں فکرِ معاش سے نہ صرف آزاد کر دیا تھا بلکہ ان کے علمی اور تحقیقی کاموں میں بھی وہ ان کی معاونت کر رہا تھا۔

انہیں ہجوم سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ وہ اس وضع کے مجلسی آدمی نہ تھے جو اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہجوم تو انہیں بس کتابوں کا پسند تھا۔ پہلی مرتبہ جب ان کے نیاز حاصل ہوئے تو وہ کتابوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا پائپ، دوسرے میں قلم اور نگاہیں اس کاغذ پر جس پر وہ کچھ لکھ رہے تھے۔

اس کے بعد سالہا سال ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی کتابیں پڑھتی رہی اور خوش ہوتی رہی کہ ایک شخص اپنے معاشرے کو ان موضوعات سے روشناس کر رہا ہے جن پر ہمارے یہاں کتابیں موجود نہیں اور جن معاملات کے بارے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔

اس دوران انہیں جلسوں اور محفلوں میں دور سے دیکھا، حالانکہ وہ زمانہ بھی گزرا جب ان کی بیٹی نوشابہ اور میں 'اخبارِ خواتین' میں ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان سے قریب ہونے کے اور بھی کئی بہانے تھے لیکن میں نے کبھی بھی ان سے براہِ راست تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہ کی کیونکہ اکثر ہوتا کچھ یوں ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں آپ کا بہت اچھا تاثر ہو، قریب جانے کے بعد اس کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے۔

آج سے تقریباً نو دس برس پہلے کی بات ہے، علی سردار جعفری کراچی آئے، شہر کے ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ سادات امروہہ کا مشاعرہ وہ پڑھ چکے تھے اور اب شہر میں ان کی دعوتیں چل رہی تھیں۔ ان ہی دنوں بے سان وگمان سبطے بھائی کا فون آیا۔ کہنے لگے 'بی بی ...... یوں تو آپ اور ہم برسوں سے ہم محلہ ہیں لیکن نہ کبھی آپ آئیں اور نہ ہم آپ کی طرف نکلے، اس وقت بھی آپ کا فون نمبر سبطین میاں سے ملا ہے۔ کل رات سردار ہمارے گھر آرہے ہیں، آپ اور جون میاں ضرور آئیں۔ آخر ملاقات کا کوئی بہانہ تو ہو۔'

میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ سبطے بھائی نے اتنی اپنائیت سے یاد کیا ہے۔ ہم اس محفل میں شریک ہوئے اور وہ شرکت اس طویل رفاقت کا بہانہ بن گئی جسے ان کی موت بھی ختم نہ کرسکی۔ اس رات کے بعد پانچ برس کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ان سے سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، ذاتی اور غیر ذاتی زندگی کے بارے میں ان کے مشورے میرے لیے انمول تھے اور ہیں، وہ میرے لیے استاد کی، بڑے بھائی، باپ اور ایک راز دار دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے مل کر میں نے ہمیشہ نوشابہ کے مقدر پر رشک کیا، جسے سبطِ حسن کی بیٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، اس سے زیادہ خوش نصیب بھلا اور کون ہوسکتا ہے۔

سبطے بھائی نے بہ ظاہر بہت بھری پُری اور بارونق لیکن بہ باطن نہایت تنہا اور سنگلاخ زندگی گزاری۔ انہوں نے اپنے نظریے سے وابستگی کی بہت بھاری ذاتی اور جذباتی قیمت ادا کی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ان کی آنکھوں کو پُرآب ہوتے دیکھا ہے لیکن وہ ایک ایسے مستحکم انسان تھے جو زندگی کی سب سے گہری جذباتی وابستگی کو یاد کرتے ہوئے گلوگیر تو ہوسکتے تھے لیکن اس وابستگی کی خاطر اپنے نظریے سے کیا ہوا پیمانِ وفا نہیں توڑ سکتے تھے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ سبطے حسن کا عشقِ مجازی، ان کے عشقِ حقیقی سے ہار گیا۔

تقسیم کے زمانے میں جب وہ امریکا میں مقیم تھے تو دنیا ان کے لیے کھلی ہوئی تھی، ایک شاندار مستقبل ان کے سامنے تھا اور ان کی زندگی کی شاید سب سے زیادہ قریبی شخصیت اپنی تمام سحر انگیزیوں کے ساتھ انہیں اس مستقبل کو اپنانے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ وہ شخصیت جو خود بھی برصغیر سے ہی تعلق رکھتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ اب جبکہ ملک تقسیم ہوچکا ہے اور لکھنؤ، دِلی، بمبئی یا لاہور میں تمہارا مستقبل تاریک ہے، تو وہاں لوٹ کر کیوں جاتے ہو، یہیں رہو اور یہاں کے روشن شب و

روز کو اپنا لو۔

سبطے بھائی کا کہنا تھا کہ وہ امریکا پڑھنے کے لیے آئے تھے اور ان کا جینا مرنا اپنے لوگوں کے لیے ہے اور ایک ایسے زمانے میں جبکہ برصغیر سے انگریز کو دیس نکالا مل چکا ہے اور ایک نئے سماج کی تعمیر ہونے والی ہے، ان کے لوگوں کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔

سبطے بھائی کی خواہش تھی کہ ان کی محبوب ہستی واپس برصغیر چلے اور وہاں دونوں مل جل کر ایک نئے معاشرے کی تعمیر میں حصہ لیں، لیکن اس شخصیت کو شاید ان مصائب و مسائل کا اندازہ تھا جن سے سبطِ حسن یا ان ایسے دوسرے دوچار ہونے والے تھے، چنانچہ اس نے امریکا میں قیام پر اصرار کیا، ایسے میں سبطے بھائی نے ذاتی آسائشوں اور جذباتی وابستگیوں سے کنارہ کیا۔ امریکا سے ملک بدر ہوئے۔ پاکستان آئے۔ یہاں کی نئی زمین اور نئے آسمان سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد شروع کی، صحافت کے میدان میں اترے، پہلا مارشل لاء نافذ ہوا تو شاہی قلعے کے مہمان ہوئے اور ان تہہ خانوں میں رکھے گئے جہاں ہوا کی رمق اور روشنی کی کرن نہیں آتی تھی، انہوں نے کچھ دن اس تہہ خانے میں بھی گزارے جو دائرہ نما تھا اور جہاں انہیں vertigo کا عارضہ ہوا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل عارضہ نہ تھا۔ اس دائرہ نما بندی خانے کے اثرات تھے جو دماغ پر مرتب ہوئے تھے۔

ان پر لاہور میں وہ دن بھی گزرے جب وہ اپنے خانگی اخراجات کے لیے ٹھیکہ داری نظام کے تحت کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ چند کتابیں جب شائع ہوئیں تو ان پر مترجم کے طور پر نام کسی دوسرے ادیب شہیر کا تھا اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ٹھیکہ دار جب کوئی کام کراتے ہیں تو مزدور کو دی جانے والی اجرت، اس رقم کا عشرِ عشیر نہیں ہوتی جو ٹھیکہ دار کی جیب میں جاتی ہے۔

سبطے بھائی نے زندگی گزارنے کا جو طور منتخب کیا، وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے ملک میں جہاں طویل عرصے فوجی آمریت رہی ہو، بہت کٹھن اور پُر خطر تھا، وہ حکامِ بالا کے معتوب و مقہور رہے لیکن انہوں نے اپنی تحریروں سے اس ملک میں جن انسان دوست اور فکر انگیز خیالات کی اشاعت کا کام سرانجام دیا، اس نے انہیں برصغیر کے تمام روشن خیال حلقوں کا ایک بڑا اور محبوب نام بنا دیا۔ وہ مشرقی یوپی میں پیدا ہوئے، چند انگریزی تحریروں کو چھوڑ کر انہوں نے عمر بھر اردو میں لکھا،

لیکن ان میں ایسی کوئی بہت خاص بات تو ہوگی کہ اس زمانے میں جبکہ لوگ اپنی نسلی اور لسانی وابستگیوں سے پہچانے جاتے ہیں، ایک سندھی ادیب ان کی موت کو سندھی نوجوانوں کے یتیم ہونے سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس معاشرے کا ایک نہایت محترم اور مذہبی روایات سے وابستہ و پیوستہ بزرگ انہیں اپنا روحانی بھائی قرار دیتا ہے۔

شہد سے گندھے ہوئے اور دودھ سے دُھلے ہوئے سبطے بھائی آپ میں کوئی بہت خاص بات تو یقیناً تھی۔

سبطے بھائی

شاہد نقوی

۲۰؍اپریل ۱۹۸۶ء کا واقعہ ہے۔ تقریباً شام ساڑھے پانچ بجے میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی، جو لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں، غیر متوقع طور پر گولہ گنج، جہاں میں قیام پذیر تھا تشریف لائے۔ 'غیر متوقع' اس لیے کہ اُس مقررہ وقت پر انہیں اتر پردیش اردو اکیڈمی میں ہونا تھا جس کے زیرِ اہتمام میرے شعری مجموعے 'سوغات' کی رسم اجراء کی تقریب منعقد ہونے والی تھی۔ آتے کے ساتھ انہوں نے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ سبط حسن صاحب کا دلی میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال ہو گیا اور یہ کہ یہ خبر دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کے خبروں کے بلیٹن میں نشر ہوئی ہے۔ ایک منٹ تو یوں لگا جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ دل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ سبطے بھائی اتنی جلدی داغ مفارقت دے جائیں گے۔ ابھی چند ہی روز پہلے تک وہ اسی شہر لکھنؤ میں ہم لوگوں کے ساتھ ہشاش بشاش تندرست و توانا تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے ہر اجلاس و تقریبات میں بڑے انہماک و سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔

باوجود اس امر کے کہ یہ المناک خبر سو فی صد دُرست تھی مگر پتہ نہیں کہ جی اس کی صداقت ماننے سے کیوں انکار کر رہا تھا۔ بہر حال حقیقت ہزار جتن سے سہی اپنی سچائی کو منوا ہی لیتی ہے۔ سبطے بھائی اب ہم میں نہیں تھے۔ وہ ایسی جگہ چلے گئے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اس واقعے کے بعد

یہ مضمون 'طلوعِ افکار' (کراچی) کی اپریل ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شامل ہوا (مرتب)۔

اتر پردیش اُردو اکیڈمی میں 'سوغات' کے اجراء کی تقریب محض رسمی کاروائی کے بعد ایک تعزیتی جلسے کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ عروس البلاد اُودھ کے شہر لکھنؤ کی سرزمین جہاں سبطے بھائی نے ہنگامہ آرا جوانی کے ایام گزارے تھے، جہاں ان کی فکر و دانش کی صلاحیتوں کو عروج حاصل ہوا تھا جہاں انہوں نے برصغیر کی آزادی کی جنگ لڑی تھی جہاں ان کے قلم سے شعلہ رو حروف کی تخلیق ہوئی تھی آج اُسی شہر میں ان کی تعزیت کی مجلس برپا ہو رہی تھی۔ اس حادثے سے شہر بھر کا ترقی پسند حلقہ عموماً اور اردو کے پرستار خصوصاً رنجور و ملول تھے۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن، جو لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں اور جنہیں 'سوغات' کے اجراء کا فریضہ سرانجام دینا تھا گہرے سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ممتاز شاعر و ناقد علی جواد زیدی جو اس تقریب کے صدر تھے اس سانحے سے انتہائی غمگین و ملول نظر آرہے تھے۔ حاضرین جلسہ جن میں اکثریت ادیبوں و شاعروں کی تھی ان کے چہروں سے ان کا کرب عیاں تھا۔ علی جواد زیدی عرصے تک لکھنؤ میں ان محفلوں میں شریک رہے جن کی رونق سجاد ظہیر، سبط حسن، سردار جعفری، احتشام حسین، مجاز اور دیگر ہم عصروں کے دم قدم سے قائم تھی۔ سبطے بھائی، سردار جعفری اور مجاز جو بیشتر ساتھ ہوا کرتے تھے، درحقیقت ان محفلوں کے روح رواں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سبطے بھائی کی ادارت میں 'نیا ادب' شائع ہوتا تھا اور جسے ترقی پسند مصنفین کی انجمن و تحریک کے ترجمان ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ علی جواد زیدی بھرائی ہوئی آواز سے ماضی کو ٹٹول رہے تھے اور ان دروازوں پر مستقل دستک دے رہے تھے جن کے اندر ان دوستوں نے فکر و نظر کی بستیاں بسائی تھیں اور جن کے بام و در کی بنیادیں انقلابی ضمیر سے تیار کی تھیں۔ اسی شہر میں سبطے بھائی نے دوسری عالمی جنگ کے آغاز (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء) میں 'آزادی کی نظمیں' ترتیب دی تھی جس کا پیش لفظ مرحوم رفیع احمد قدوائی نے لکھا تھا۔ یہ کتاب جیسے ہی شائع ہوئی برطانوی سامراج کی نظر میں اس قدر خطرناک ثابت ہوئی کہ فوراً ہی صوبائی سرکار نے اس کی تمام کاپیاں ضبط کرلیں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے دوبارہ اسے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔

علی جواد زیدی سے قبل مجھے یہ منحوس خبر سنانے اور اس پر اظہار خیال کا بدقسمت فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ ذہن ماؤف تھا۔ خیالات کا ایک بے ربط ہجوم دماغ پر پے در پے کچوکے لگا رہا تھا۔ سبطے بھائی کا محبت کرنے والا سدا مسکراتا ہوا چہرہ، وہ روشن آنکھیں جن میں تاریخ کے سب ہی مد و جزر

منعکس تھے، وہ لہجہ جس سے تیقن واعتماد کے سوتے پھوٹتے تھے، وہ سراپا جو ہم لوگوں کے لیے روشنی کا مینار تھا، نگاہوں کے سامنے تھا۔ واقعات کی کتاب کے اوراق تند وتیز ہوا میں بڑی سرعت سے الٹ پلٹ رہے تھے۔ کراچی میں مارچ میں منعقد ہونے والی گولڈن جوبلی کانفرنس میں ان کی قدم قدم پر رہنمائی، عمر کی اس منزل میں، بے پایاں مساعی، اور شب وروز کا انہماک ذہن کے منظرنامے پر ابھر رہے تھے کسے معلوم تھا کہ علم و دانش، تفکر و تعقل کا یہ گرانقدر سرمایہ جسے ہم متاع عزیز کی طرح اپنی جھولی میں بھر کر ہندوستان لائے تھے آناً فاناً یوں لٹ جائے گا۔ ہم پلک جھپکتے یوں تہی دامن ہو جائیں گے۔ سچ پوچھئے تو اس تعزیتی جلسے میں اس حادثے کی کیفیت کے بے پناہ کرب کو سمیٹنے کا مجھ میں یارا نہ تھا۔ میں نے کیا کیا کہا، کیا الفاظ لب و ذہن سے ادا ہوئے، کچھ یاد نہیں، ابھی چند دن پہلے رفاہِ عام کلب لکھنؤ جہاں ۱۹۳۶ء میں پہلی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا وہاں ہم نے اس کے بانیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے احترام میں کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی اختیار کی تھی، ٹھیک دس دن بعد اتر پردیش اردو اکیڈمی میں آج ایک اور بانی کے لیے ہمیں یہ مشق دہرانی پڑی۔ تاریخ اپنے آپ کو کتنی جلد دہراتی ہے۔

تعزیتی اجلاس کے بعد میں ڈاکٹر محمود الحسن کے ہمراہ لکھنؤ کے بزرگ ادیب اور جواب حقیقتاً لکھنؤ کی تہذیب وادب کی آخری شمع ہیں مرزا جعفر حسین کے گھر گئے تاکہ انہیں اس سانحہ جانگداز کی اطلاع دیں۔ چند دن پہلے گومتی ہوٹل میں جب جعفر صاحب کا ذکر آیا تو سبطے بھائی نے کہا تھا کہ 'بھئی مجھے بھی انہیں سلام کرنے جانا ہے۔ وہ جوش کے قریبی دوستوں میں ہیں اور ایک زمانے میں ان کے یہاں منعقد ہونے والی بہت سی محفلوں میں مجھے بھی شرکت کے مواقع ملے' مرزا جعفر حسین جواب ۹۰ سال کے ہونے والے ہیں اس خبر سے بے انتہا متاسف ہوئے کہنے لگے 'کہ سبط حسن کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کا شمار ڈاکٹر اعجاز حسین کے عزیز ترین اور نمائندہ شاگرد کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ 'نیا ادب' کے بعد دوسرا پرچہ ان کی ادارت میں نکلا تھا اس کا نام 'پرچم' تھا اور سبطے سے مجھے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ تم یوں لگاؤ کہ آزادی کے بعد جب میں نے اپنا ہفت روزہ اخبار نکالا تو اس کا نام بھی 'پرچم' تھا۔ سبطے کی ذہانت کے ہم لوگ ان کی جوانی ہی میں قائل ہو گئے تھے۔ افسوس میرے افلاک کے درخشندہ ستارے ایک ایک کر کے ڈوبتے جا رہے ہیں۔'

سبطے بھائی کا لکھنؤ جانے کا پروگرام اچانک بنا۔ پہلے ان کا ہندوستان جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہم دوستوں میں جو لوگ لکھنؤ کا پروگرام پہلے سے بنا چکے تھے ان میں زاہدہ حنا، محمد علی صدیقی، مسلم شمیم اور میں شامل تھا۔ ہم لوگوں نے ۸، ۱۰ ر دن پہلے ہی اپنے پاسپورٹ اور ویزا کی درخواستیں جمع کرادی تھیں اور روزانہ ویزا کے منتظر تھے جب ۶ ر اپریل تک ہمیں ویزا نہ ملا تو ہم سب اپنا جانا غیر یقینی سمجھ رہے تھے۔ ۶ ر اپریل کی شام ہی کو اطلاع ملی کہ سبطے بھائی نے اسی دن ویزا کی درخواست دی اور اُسی شام انہیں ویزا بھی مل گیا اور وہ بھی لکھنؤ جا رہے ہیں۔ ایکا ایکی اس خبر سے حیرانی بھی ہوئی مگر خوشی زیادہ کہ سبطے بھائی لکھنؤ جا رہے ہیں۔ زاہدہ حنا ہم سب سے پہلے ویزا حاصل کر چکی تھیں اور وہ غالباً ۲، ۳ ر اپریل کو دہلی کے لیے روانہ بھی ہو چکی تھیں۔ ہم لوگوں کو ویزا ۷ ر اپریل کو ملا اور ۸ ر اپریل کو انڈین ایئر لائنز سے ہمارا جانے کا پروگرام طے ہوا۔ کراچی ایئرپورٹ پر بریفنگ کے بعد جب ہم انٹرنیشنل لاؤنج میں داخل ہوئے تو دیکھا سبطے بھائی ایک کرسی پر بیٹھے پائپ کے کش اپنے مخصوص انداز میں لگا رہے ہیں۔ چونکہ فلائٹ کی روانگی میں ابھی تقریباً ایک گھنٹے کا وقت تھا لہٰذا میرے اک دوست جمانی صاحب نے لاؤنج کے کیفے ٹیریا میں ہماری چائے سے تواضع کی۔ اس وقت ہمارے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ سبطے بھائی کے ساتھ رفاقت کی یہ گھڑیاں چند روزہ ہیں اور ۲۰ ر اپریل کو وہ جسمانی طور پر سدا کے لیے ہم سب سے بچھڑ جائیں گے۔

دلی پہنچنے کے بعد رات ہم لوگوں نے ایئرپورٹ پر ہی گزاری۔ ایئرپورٹ کے ریٹائرنگ رومز مسافروں سے بھر چکے تھے اور نزدیک میں واقع ہوٹلوں میں بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ شہر کی دوری کے باعث فیصلہ یہی ہوا کہ رات کو قیام ایئرپورٹ پر ہی کیا جائے۔ ہمارے ساتھی محمد علی صدیقی، ایئرپورٹ ٹیلی فون بوتھ سے دوستوں سے رابطہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے اور بہت سی اٹھنیاں ضائع کرنے کے بعد بہ مشکل جوگندر پال کے گھر رابطہ قائم کر سکے اور پھر انہوں نے جوگندر پال کی بیگم سے درخواست کی کہ وہ سبطے بھائی کے دوست ساگر گپتا کو یہ اطلاع پہنچا دیں کہ سبطے بھائی پالم ایئرپورٹ (جس کا نام اب اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ رکھ دیا گیا ہے) پر ہیں اور صبح ۶ بجے پہلی پرواز سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اطلاع ملتے ہی ساگر جی رات تقریباً گیارہ بجے ایئرپورٹ پر سبطے بھائی سے ملنے آ گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ سبطے بھائی ان کے

ہمراہ ان کے گھر چلیں تا کہ وہ کچھ آرام کر لیں اور وہ انہیں بعد میں ائیر پورٹ چھوڑ جا ئیں گے۔ چونکہ ہم سب لوگ ساتھ تھے، سبطے بھائی نے اپنے آرام کا مطلق خیال نہیں کیا اور بڑے شگفتہ انداز میں ساگر جی سے کہا کہ 'چونکہ رات کافی ہو چکی ہے اور اعلی الصبح لکھنؤ کی پرواز ہے لہٰذا ائیر پورٹ سے شہر جانا اور پھر واپس آنا سوائے آپ کو (ساگر جی) زحمت میں ڈالنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔' ساگر گپتا تقریباً ایک ڈیڑھ بجے شب تک ائیر پورٹ پر سبطے بھائی کے ساتھ رہے اور پھر سبطے بھائی کے اصرار پر واپس ہوئے۔ اسی دوران ایک کشمیری لڑکی ششی بالا پنڈت جو ایک بینک میں افسر تھی اور جسے صبح کی پرواز سے سرینگر کے لیے روانہ ہونا تھا ہم لوگوں کے ساتھ گھل مل گئی اور اس سے متفرق موضوعات پر گفتگو شروع ہوگئی۔ ان خاتون کی بہن جو ریسرچ اسکالر ہیں ان کے پاس سبطے بھائی کی تقریباً سب ہی کتابیں موجود ہیں جس کی وجہ سے وہ سبطے بھائی کے نام سے اچھی طرح آشنا تھیں۔ اور حقیقت میں اس اتفاقیہ ملاقات پر وہ بہت مسرور تھیں۔ زبان، ثقافت، ادب وغیرہ کے موضوعات پر ان خاتون سے تقریباً رات بھر گفتگو ہوتی رہی اور گاہے گاہے سبطے بھائی بھی ان مذاکرات میں شامل رہے۔ سبطے بھائی نے اس رات مشکل سے کوئی دو گھنٹے آرام کیا ہوگا ورنہ مسافرت کی اس محفل میں وہ پوری رات شریک رہے۔ اب اس دو، ڈھائی گھنٹے کے آرام کا واقعہ سن لیجئے۔ ہم لوگ ائیر پورٹ پر نصب شدہ پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے تھے جو دو اک گھنٹے بیٹھنے کے لیے تو مناسب تھیں مگر لمبے عرصے تک آرام فراہم کرنے کے لیے ٹھیک نہ تھیں۔ سبطے بھائی کی اک مسافر پر نظر پڑی جو اخبارات کے صفحے بچھا کر تکیے کی جگہ اپنے بریف کیس پر سر رکھے آرام سے فرش پر محوِ خواب تھے۔ جب انہوں نے ہم لوگوں کو متوجہ کیا تو ہم نے اس خواہش کا اندازہ لگا لیا کہ سبطے بھائی جو کافی تھک چکے ہیں تھوڑا سا آرام چاہتے ہیں۔ پھر محمد علی صدیقی کہنے لگے کہ دیکھئے صاحب یہ کتنے آرام سے فرش پر لیٹے ہیں کہ جسم کا کوئی حصہ بھی زمین پر نہیں ہے۔ پھر محمد علی صدیقی نے ٹائمز آف انڈیا کے صفحات کو فرش پر ایک طرف بچھا دیا، سبطے بھائی نے کوٹ اتارا، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور پھر اس 'بستر' پر بڑی قلندرانہ شان سے دراز ہو گئے، اور یوں انہوں نے دو ڈھائی گھنٹے کمر سیدھی کی۔ مسلم شمیم کے بھائی شہاب جو اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے انہوں نے اس منظر کو بڑی چابکدستی سے اپنے کیمرے کی مدد سے محفوظ کر لیا اور اس طرح سے سبطے بھائی کی آخری سفرِ ہند کی یادگار تصویر محفوظ ہو گئی۔

لکھنؤ ائیرپورٹ سے جب ہم لوگ گومتی ہوٹل (یہ نیا ہوٹل شاہ نجف روڈ عقب حضرت گنج میں تقسیم کے بعد تعمیر ہوا ہے) کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ سبطے بھائی کی ۳۸ سالہ پرانی یادیں مکمل طور پر بیدار ہو چکی ہیں اور ان کی یادداشت کی کتاب بڑے سلیقے سے ورق الٹ رہی ہے۔ میں جو لکھنؤ میں پیدا ہوا اور مسلسل ۱۷، ۱۸ برس تک رہا اور پاکستان آنے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً لکھنؤ جاتا رہا مجھے راستوں کو پہچاننے سڑکوں کے ناموں سے آشنا ہونے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ جب کہ سبطے بھائی ہر سڑک کے، نہ یہ کہ نام سے واقف تھے بلکہ یہ بھی بتاتے جاتے تھے کہ اس عرصے میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جب ہماری گاڑی چار باغ سے حضرت گنج کی طرف جا رہی تھی تو ایک ایسا مقام آیا جہاں میں نے دیکھا کہ سبطے بھائی کافی excited سے ہیں یہ مقام لکھنؤ کونسل ہاؤس اور حضرت گنج کے چوراہے کے درمیان تھا جہاں کسی زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کا اسٹیچو نصب تھا۔ سبطے بھائی نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا، دیکھو بھئی یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم لوگوں نے انگریزوں کی خوب پٹائی کی تھی۔ اس واقعے کی تفصیل علی سردار جعفری کی کتاب 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' میں درج ہے۔ سبطے بھائی نے یہ مقام ۲، ۳ مرتبہ مڑ مڑ کر دیکھا تھا اور ان کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب فاتحانہ رنگ کی جھلک تھی۔ موٹر نے جب حضرت گنج کا چوراہا کراس کیا تو سبطے بھائی نے بہت غور سے انڈیا کافی ہاؤس کو دیکھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک زمانے میں سبطے بھائی سردار جعفری، مجاز، بنے بھائی وغیرہ جمع ہوا کرتے تھے۔ یقیناً سبطے بھائی اس کو دیکھ کر ماضی کی ان حسین یادوں میں چند ثانیوں کے لیے گم ہو گئے ہوں گے۔ گاڑی کا رخ جب شاہ نجف روڈ کی طرف ہوا جہاں گومتی ہوٹل واقع ہے تو سبطے بھائی کہنے لگے یہ بہت پرسکون علاقہ ہے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی گومتی میں داخل ہوئی تو ڈاکٹر زیڈ۔ احمد اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اپنے دیرینہ رفیق کے استقبال کے لیے بہ نفس نفیس موجود تھے۔ وہ اور سبطے بھائی بڑی گرمجوشی سے بڑی دیر تک بغلگیر رہے۔ چند ہی منٹوں بعد مولانا اسحٰق سنبھلی اور ڈاکٹر محمود الحسن آ گئے اور ہم لوگوں کے قیام، طعام اور آرام کے وسیلوں میں منہمک ہو گئے۔ ہوٹل میں سبطے بھائی اور محمد علی صدیقی ایک کمرے میں، مسلم شمیم اور ان کے بھائی شہاب ساتھ والے کمرے میں اور میں، امین الزماں کے ساتھ مقابل والے کمرے میں ٹھہرائے گئے۔

غسل وغیرہ کے بعد جب ہم لوگ گراؤنڈ فلور پر ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے داخل ہوئے

تو اسی اثنا میں ہمارے میزبان ڈاکٹر قمر رئیس وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فرداً فرداً ہم سب کا استقبال کیا۔ سبطے بھائی کو لکھنؤ میں دیکھ کر وہ بے انتہا خوش تھے۔ گومتی میں ہم پاکستانیوں کے علاوہ برطانیہ سے آئے ہوئے مندوبین عاشور کاظمی، بخش لائل پوری، باقر نقوی، اطہر راز بھی ٹھہرے ہوئے تھے ملتان سے منیر فاطمی اور دہلی سے آئی ہوئی فہمیدہ ریاض بھی ہماری آمد سے پہلے اس ہوٹل میں مقیم تھیں۔ ان سب حضرات سے ڈائننگ ہال میں ملاقات ہوئی۔ سردار جعفری کی ہمشیرگان محترم بھی سبطے بھائی سے ملاقات کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں فہمیدہ ریاض بھی آ گئیں۔ وہ سب سے فرداً فرداً مل کر سبطے بھائی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھ گئیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس مہمانوں کی تواضع کے لیے ہدایت جاری کرنے میں مصروف تھے۔ کانفرنس کی مصروفیت کی وجہ سے ان کے چہرے سے تھکن کے آثار واضح تھے مگر وہ اس تھکن کو جان بوجھ کر ہمہ وقت اپنی مسکراہٹ سے چھپا رہے تھے۔ قمر رئیس نے ناشتے کے بعد تجویز رکھی کہ ہم لوگ تھوڑا آرام کر لیں اس کے بعد سہ پہر کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہوں اور جو حضرات اسی وقت کانفرنس میں چلنا چاہیں وہ ان کے ہمراہ ابھی چل سکتے ہیں۔ سبطے بھائی اور مسلم شمیم قمر رئیس کے ہمراہ ہو لیے جب کہ ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے گومتی سے رونددر یالہ پہنچے جہاں میزبانوں نے کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا تھا۔ رونددر یالہ چارباغ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک وسیع وعریض اراضی پر رابندر ناتھ ٹیگور کے نام سے موسوم ایک عمارت ہے جس کے مرکزی ہال میں اس کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۹ر اپریل کو سہ پہر کے وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر رونددر یالہ کا مرکزی ہال، مندوبین، مبصرین، صحافی حضرات، مہمانانِ گرامی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر بھیشم ساہنی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، سبط حسن، غلام ربانی تاباں، ملک راج آنند اور دوسرے مشاہیر تشریف فرما تھے۔ نظامت کے فرائض بھیشم ساہنی انجام دے رہے تھے۔ جو بیک وقت ہندی، اردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ہال میں اردو، ہندی، گجراتی، تلگو، ملیالم، تامل، کنٹر، بنگالی، پنجابی و دیگر بھارت میں بولی جانے والی زبانوں کے ادیبوں کی معتد بہ تعداد موجود تھی۔ اس رنگارنگ اجتماع میں جو واحد مشترک چیز سب سے نمایاں تھی وہ ترقی پسند ادیبوں کی ایک جیسی سوچ کا دھارا تھی جس نے سب کو ایک پلیٹ فارم

پراکٹھا کیا ہوا تھا۔

افتتاحی اجلاس میں پہلے ملکی وغیر ملکی مشاہیر کے پیغامات پڑھے گئے پھر ملک راج آنند سے کانفرنس کا باقاعدہ افتتاح کرنے کی درخواست کی گئی۔ آنند جی کو یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ ملک راج آنند کانفرنس کا افتتاح کرنے روسٹرم پر آئے۔ دبلے پتلے منحنی قامت کے آنند جی بے انتہا خوش تھے۔ ان کی مسرت ان کے چہرے بشرے سے پوری طرح عیاں تھی۔ بقول ملک راج آنند کے وہ آج اپنے کو اپنی عمر سے پچاس سال کم محسوس کررہے تھے۔ وہ اپنے افتتاحی خطبے میں ان محرکات کو بیان کر رہے تھے جو انگریز سامراج کے دور میں اس انجمن کی تاسیس کا باعث بنے۔ برطانیہ میں اپنی مشہور کتاب 'قلی' کی اشاعت کے سلسلے میں جو انہیں پے درپے مشکلات ودشواریاں پیش آئی تھیں وہ قصے آج دہرا رہے تھے۔ بنے بھائی کی مسلسل لگن کا ذکر تھا، منشی پریم چند کی حوصلہ افزائیاں اور خدمات کا ذکر ہو رہا تھا۔ دورانِ تقریر ہی انہوں نے سجاد ظہیر کی کتاب 'روشنائی' جسے حال ہی میں علی باقر نے سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد میموریل کمیٹی کی جانب سے بڑی نفاست سے شائع کیا ہے، اس کے نسخے کو جو ایک دیدہ زیب پیکٹ میں ملفوف تھا گولڈن جوبلی کانفرنس کی طرف سے پیش کرنے کے لیے سبطے بھائی کو پکارا۔ اس تحفے کے یقیناً سبطے بھائی ہی حقدار تھے۔ تالیوں کے شور میں سبطے بھائی اپنی کرسی سے اٹھ کر ملک راج آنند کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے ہو گئے۔ ملک راج آنند نے پیکٹ کھولا اور کتاب سبطے بھائی کو پیش کی۔ ہال میں ایک مرتبہ پھر زوردار تالیاں بجیں سبط بھائی نے 'روشنائی' کی اس جلد کو اٹھا کر اس کا رُخ حاضرین جلسہ کی طرف کیا۔ ہال میں بڑی دیر تک زوردار تالیاں بجتی رہیں۔ سبطے بھائی اس سمے بہت ہی خوش تھے ان کا مسکراتا ہوا چہرہ جو کتاب کی اوٹ میں ہو گیا تھا نگاہوں کے سامنے ہے۔ واقعی یہ خوش ہونے کا موقع تھا۔ یار کا تحفہ، یار کے بدست، یار کو ملا تھا اور وہ بھی یاروں کے اتنے بڑے اجتماع میں۔ سبطے بھائی کو یہ سرمایہ گراں بہا اٹھائے ہوئے اراکین صدارت، مندوبین، مبصرین، پریس رپورٹرز ومہمانانِ گرامی تو دیکھ ہی رہے تھے۔ مگر لگ ایسا رہا تھا کہ ڈائس کے دائیں اور بائیں رکھی ہوئی دو بڑی بڑی تصویریں جس میں ایک منشی پریم چند اور دوسری سجاد ظہیر کی تھی، وہ بھی اس ورثے کے صحیح حقدار کو اپنی ان خاموش نگاہوں سے جن میں رضا مندی کی بلاخیز چمک تھی بڑے انہماک اور لازوال رفاقتوں کے جذبات سے سرشار دیکھ رہی

تھیں۔

ملک راج آنند، جذبات سے سرشار، ماضی کی حسین یادوں کے جلو میں خراماں خراماں، شگفتہ اور پر معنی فقروں میں پچاس سالہ سرگزشت سنا رہے تھے۔ جب وہ زبان کے گرما گرم مسئلے پر تمہیداً اظہار خیال کرنے لگے ہی تھے کہ ایکا ایکی ان کے قدم ڈگمگائے اور آن کی آن میں روسٹرم سے فرش پر کھڑے قد سے گر گئے۔ ان کے گرتے ہی وہ لکڑی کا قدیم ہیکل روسٹرم بھی فرش پر گرے ہوئے ملک راج آنند پر گر پڑا۔ میں جو اس وقت اگلی صف میں روسٹرم کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا، یوں لگا جیسے فرش پر پڑے ہوئے ملک راج آنند پر روسٹرم کی صورت میں موت کا قوی ہیکل راکھشس ان پر فیصلہ کن طریقے سے حملہ آور ہو گیا ہے۔ ان کے گرتے ہی لوگ دوڑے، روسٹرم اٹھایا، ملک راج آنند کو بٹھانے کی کوشش کی۔ رسالوں اور کتابوں سے ہوا دی گئی۔ آنند جی کی آنکھوں میں خفیف سی جنبش ہوئی اور وہ کچھ نیم وا ہوئیں مگر دوسرے ہی لمحے انہیں تے پر تے آنے لگی، چہرا نیلا ہو گیا انہیں فوراً اسپتال لے جایا گیا اس موقع پر سبطے بھائی اسٹیج پر بڑی بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ وہ ملک راج آنند کی زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے ان کا جملہ 'میں تو سمجھا تھا یہ رخصت ہو گئے' اسی کیفیت کی دلالت کر رہا تھا سبطے بھائی پر کیا موقوف اجلاس کے سب ہی شرکاء یہی سمجھ رہے تھے۔ اسٹیج سے پھر اعلان ہوا کہ کانفرنس کے اس اجلاس کی کاروائی اس بناء پر ختم کی جاتی ہے کہ سب لوگ آنند جی کی صحت و زندگی سے متفکر ہیں اور سب ہی لوگ پریشانی اور کرب کے عالم میں مبتلا ہیں لہٰذا مزید کاروائی کل تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

ہم لوگ واپس گومتی آ گئے مگر لحہ بہ لحہ ملک راج آنند کی خیریت دریافت کرنے میں گزرا۔ ۹ر اپریل کی یہ شام اور پھر رات بڑی بے کیف اور انتہائی پریشان کن تھی۔ رات گئے معلوم ہوا کہ ملک راج آنند ہمہ وقت نگہداشت کے شعبے میں ہیں اور زندگی کی علامات بہت زیادہ پریشان کن نہیں ہیں۔ دوسرے دن صبح کے اجلاس میں مزید بہتری کی اطلاعات ملنے پر لوگوں کو یک گونہ سکون نصیب ہوا۔

کانفرنس میں سبطے بھائی کی تقریر کو بے انتہا سراہا گیا انہوں نے ادب اور امن کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ادیبوں کو اس خطرے کی طرف خصوصی توجہ دینے کو کہا جو اسٹار وار Star War کی صورت میں پوری انسانیت کو تباہ کرنے کا سامراج کا مذموم ترین منصوبہ ہے۔

انہوں نے کہا کہ ادیبوں کو امن کے عظیم آدرش کو کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلانے کی جتنی آج ضرورت ہے وہ شاید پہلی کبھی نہ تھی۔ بجائے چھوٹے چھوٹے مسائل میں اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے آج ادیبوں کا قلم، ان کی سوچ، ان کی فکر اور ان کی جدوجہد اس بڑے خطرے کے تدارک کے لیے ہونی چاہیے جو انسانیت کو درپیش ہے۔ انہوں نے کراچی کانفرنس کے حوالے سے کہا کہ ہم پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم جلد ادب برائے امن کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ یہ اس سمت ایک مثبت قدم ہوگا۔

کانفرنس کے آخری روز کے پروگراموں میں روندر یالہ میں مشاعرے کے انعقاد کے علاوہ ترقی پسند ادیبوں کا ایک جلوس کی صورت میں رونڈریالہ سے رفاہ عام کلب جانا تھا جہاں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ رونڈریالہ سے رفاہ عام کلب کے طویل راستے میں جگہ جگہ نامور ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے نام سے گیٹ بنائے گئے تھے۔ جن میں فیض نگر، منشی پریم چند نگر، ڈاکٹر عبدالعلیم نگر، احتشام حسین نگر، ڈاکٹر رشید جہاں نگر، مجاز نگر اور رفاہ عام کلب پر سجاد ظہیر نگر کا گیٹ نصب تھا۔ جلوس میں ادیبوں، شاعروں و دیگر فن کاروں کے علاوہ آدھی واسیوں کا بھی ایک بڑا ٹولہ تھا جو اپنے مخصوص لباس اور آلات نغمہ وطرب کے ساتھ شامل تھا۔ سبطے بھائی بھی تھوڑی دیر جلوس کے ساتھ ساتھ پیدل ہم سفر رہے مگر ان کے لیے رفاہ عام کلب تک طویل فاصلہ پیدل طے کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مشاعرے کی صدارت کے فرائض علی سردار جعفری نے سرانجام دیے اور لکھنؤ والوں کے بقول یہ ایک انتہائی منظم، پروقار اور کامیاب مشاعرہ تھا۔ کراچی کی طرح وہاں بھی مقامی (لکھنؤ کے شعراء) شعراء نے اپنا وقت مہمان شاعروں کو دیا۔ اس مشاعرے میں پاکستان سے جن شاعروں نے حصہ لیا ان میں مجیب خیرآبادی، مسلم شمیم اور میں تھا۔ منیر فاطمی اور فہمیدہ ریاض جو پہلے سے ہی ہندوستان میں موجود تھے انہوں نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام پڑھا۔ کیفی اعظمی جو لکھنؤ کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں گذشتہ دو ماہ سے لکھنؤ میں موجود تھے اور شب و روز کانفرنس کی کامیابی کے لیے محنت کر رہے تھے اپنی جسمانی معذوری کے باوجود ہر پروگرام میں بڑی باقاعدگی سے شریک رہے چنانچہ مشاعرے میں بھی وہ شروع سے آخر تک موجود رہے اور رفاہ عام کلب میں تو ان کی تقریر یادگار تھی۔ ترقی پسند تحریک کے بانیوں کو جن شاندار الفاظ میں انہوں نے خراج عقیدت پیش کیا اس کا لفظ لفظ لوگوں کے دلوں پر

نقش ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے منشی پریم چند و سجاد ظہیر ہم آپ لوگوں سے سرخرو ہیں اپنی بساط بھر ہم اس مشعل کو فروزاں تر کرتے رہے جو آپ نے جلائی تھی۔ اب یہ ذمہ داری ہم نئی نسل کو سونپ رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اس مشعل کی روشنی کو مزید فروزاں کرتے رہیں گے۔ ہم آج یہ عہد کرتے ہیں کہ روشن خیالی کی اس قندیل کو ہم کبھی نہ بجھنے دیں گے اور اس کی روشنی کو کائنات بھر میں پھیلاتے رہیں گے۔ کیفی صاحب سے پہلے رفاہ عام کلب میں جن لوگوں نے بانیان کو خراج عقیدت پیش کیا ان میں غلام ربانی تاباں اور اجمل اجملی بھی شامل تھے۔

سبطے بھائی اور ترقی پسند مصنفین کانفرنس کچھ اس درجہ لازم و ملزوم ہیں کہ 'بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر'۔ بنیادی طور پر ان سطور کے قلم بند کرنے کی محرک تو سبطے بھائی کی ہی شخصیت ہے اور ان کی شخصیت کچھ اتنی پہلودار ہے کہ ان آدرشوں کا ذکر ضرور آتا ہے جن کے لیے وہ عمر بھر جدوجہد کرتے رہے۔

ذہن جب ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے ۵۸۔۱۹۵۷ء کی طرف پلٹتا ہے کچھ اور واقعات کے تانے بانے بکھر جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں پہلا مارشل لاء لگا تھا۔ میں ان دنوں لکھنؤ گیا ہوا تھا اور لکھنؤ جب بھی جاتا تو بنے بھائی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی وزیر منزل جانے کا اتفاق ہوا۔ بنے بھائی اس زمانے میں وزیر منزل کے عقبی حصے میں رہتے تھے اور اصل کوٹھی میں کسی مرکزی یا صوبائی حکومت کا کوئی دفتر تھا۔ انہیں دنوں ایوب حکومت کے حکم پر میاں محمود علی قصوری گرفتار کر لیے گئے تھے اور یہ خبر ہم نے لکھنؤ کے اخبارات میں پڑھی تھی۔ بنے بھائی پاکستان کی حکومت کے اس اقدام پر کچھ متعجب تھے۔ کہنے لگے 'محمود علی تو شروع سے آخر تک (Constitutionalist) آئین کے پابند رہے ہیں۔ دورانِ طالب علمی جب وہ ہمارے ساتھ ولایت میں تھے اس وقت بھی ہم لوگ انہیں اسی لقب سے نوازتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا ان جیسے آدمی کو کیوں گرفتار کرلیا گیا' پھر مجھ سے میری واپسی کا پروگرام دریافت کیا اور کہنے لگے میرے خطوط فیض، سبطے، امتیاز (نواب امتیاز علی خان) اور افتخار کو پہنچا دینا اور میری کتابوں کے متعلق افتخار سے دریافت کرنا کہ وہ کب تک مجھے مل جائیں گی۔ لاہور واپسی پر میں نے آتے کے ساتھ ہی میاں افتخار الدین مرحوم سے رابطہ قائم کیا میں اس وقت

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے سیاسیات کا طالب علم تھا۔ واپسی پر ہی یہ اطلاع ملی کہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ جس کے زیر اہتمام 'پاکستان ٹائمز'، 'امروز' اور 'لیل و نہار' نکلتے تھے حکومت کی تحویل میں لے لیے گئے ہیں۔ میں نے میاں صاحب سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا اور بغیر کسی احتیاط فون پر ہی انہیں بتادیا تھا کہ میں دو تین دن ہوئے لکھنؤ سے آیا ہوں اور سجاد ظہیر کا خط ان کے (میاں افتخار الدین) لیے لایا ہوں۔ میاں صاحب نے پیغام سننے کے بعد صرف اتنا کہا کہ تم کس جگہ رہتے ہو میں گاڑی بھیج رہا ہوں تقریباً آدھ گھنٹے میں گاڑی آ گئی اور میں ان کے گھر ایکمن روڈ کے لیے روانہ ہوگیا۔ شام کا وقت تھا جیسے ہی میں ان کے گھر پہنچا تو وہاں میاں افتخار الدین کے علاوہ ان کے ساتھ اس کمرے میں سبط حسن، خواجہ منظور حسین اور دو ایک اور حضرات تھے جن کے نام اب یاد نہیں رہے۔ فیض صاحب بھی غالباً موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میاں صاحب نے پریشانی کے عالم میں اپنا ہاتھ ماتھے پر مار کر کہا کہ 'بھئی تم فون پر ہی سجاد ظہیر کا ذکر لے بیٹھے۔ تمہیں معلوم نہیں میاں میرا فون ٹیپ ہورہا ہے اور ہر وقت سی آئی ڈی والے سائے کی طرح تمام حرکات و سکنات کو نوٹ کرتے ہیں، تمہیں کچھ تو احتیاط برتنی چاہیے تھی' میں پریشانی و پشیمانی کی ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا ندامت و شرمندگی کی وجہ سے سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے اصحاب بھی خاموش تھے۔ کچھ وقفے کے بعد میں سبطے بھائی کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے عرض کیا' کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی یہاں موجود ہوں گے ورنہ آپ کا خط بھی جو بنے بھائی نے بھیجا ہے وہ یہاں پر ہی لے آتا۔ خیر اسے کل میں 'لیل و نہار' کے دفتر میں آپ کو پہنچادوں گا۔' سبطے بھائی نے خفیف تبسم سے یہ جملے سنے مگر میاں افتخار فوراً کہنے لگے' کہ 'لیل و نہار' کے دفتر قطعی نہ جانا وہاں ہر آنے جانے والے کو پولیس شیڈو Shadow کر رہی ہے اور سادہ لباس میں موجودہ پولیس والے چوبیس گھنٹے موجود رہتے ہیں۔ تم ہرگز ہرگز وہاں جانے کی غلطی نہ کرنا' اب احساس ہوتا ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان نزاکتوں سے یکسر ناواقف تھا اور غلطی واقعی میری تھی۔ چنانچہ میں نے پھر عرض کیا کہ' آپ کا ڈرائیور جب مجھے واپس چھوڑنے جائے گا تو یہ خطوط میں اس کے حوالے کردوں گا اور آپ ازراہ کرم متعلق حضرات کو یہ خطوط دے دیجئے گا۔' یا تو یہ اسی دوران کا واقعہ ہے یا ممکن ہے یہ اس سے کچھ آگے پیچھے کا، فیض صاحب والا خط میں خود ان کے پاس لے کر حاضر ہوا تھا۔ چونکہ بنے بھائی نے زبانی پیغام بھی دیا

تھا لہٰذا جب میں نے فیض صاحب سے کہا کہ رضیہ آپا اور بنے بھائی اب کے آموں کی فصل پر آپ کی لکھنؤ آمد کے منتظر ہیں تو فیض صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا تھا کہ 'تمہیں معلوم ہے کہ میرے لیے انگلستان جانا نسبتاً آسان ہے۔'

'لیل ونہار' کے ہی ضمن میں ایک اور واقعہ یاد آیا۔ 'لیل ونہار' کا 'جنگ آزادی نمبر (۱۸۵۷) ترتیب دیا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی ایک نظم جو اسی موضوع سے متعلق تھی ایک صاحب کے ذریعہ جو 'امروز' سے وابستہ تھے سبطے بھائی کو بہ غرض اشاعت بھجوائی۔ تین چار دن بعد پیغام ملا کہ 'تم سبط حسن صاحب سے اس سلسلے میں مل لو' میں تعمیل حکم میں 'لیل ونہار' پہنچا۔ سبطے بھائی دفتر میں موجود تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہاری نظم فلاں صاحب کے ذریعے مجھے موصول ہوگئی ہے۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور دفتری کاغذات دیکھنے لگے۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ پتہ نہیں یہ نظم لیل ونہار کے معیار پر پوری اتری بھی ہے کہ نہیں اور واللہ اعلم سبطے بھائی اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں کہ سبطے بھائی ایک مرتبہ پھر مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ 'ہمارے یہاں سفارشی ادب نہیں شائع کیا جاتا، تم نظم براہِ راست بھی بھیج سکتے تھے' یہ کہہ کر پھر کاغذوں کے مطالعے میں ڈوب گئے۔ مجھے اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ میری نظم غیر معیاری ہونے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکے گی۔ میں مایوسی کے عالم میں ان سے اجازت طلب کرنے والا ہی تھا کہ ان کے چہرے پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور کہنے لگے کہ 'تمہاری نظم کافی دیر سے ملی لہٰذا ایسے کچھ مضامین اور نظمیں جو اس نمبر میں شامل نہ ہو سکے ہیں انہیں ہم اگلے شمارے میں شامل کر رہے ہیں جو یقیناً ایک اضافی نمبر ہوگا اور اسی میں تمہاری بھی نظم شامل کر دی گئی ہے۔' پھر انہوں نے کچھ ذاتی نوعیت کے دو ایک سوال کرنے کے بعد کہا کہ 'بھئی لکھتے رہا کرو۔' جنگ آزادی نمبر میں اپنی نظم کی شمولیت پر مجھے کس قدر خوشی ہوئی تھی اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ سبطے بھائی کا انتہائی اپنائیت سے یہ کہنا کہ 'بھئی لکھتے رہا کرو' دل پر جیسے نقش سا ہو گیا ہے۔ ان کا رویہ کتنا حوصلہ افزاء تھا شاید ذہن کبھی نہ بھلا سکے۔

کراچی کی حالیہ ترقی پسند ادبی گولڈن جوبلی کانفرنس کے انعقاد سے کچھ روز پہلے مظہر جمیل کا فون آیا کہ 'میں (مظہر جمیل) اور مسلم شمیم تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں اور وہاں سبطے بھائی کے یہاں چلنا ہے اور ان کا انٹرویو ریکارڈ کرنا ہے۔' میں نے حامی بھر لی اور دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ جائیں گے تو ضرور ان کے ساتھ مگر وہاں صرف اور صرف سبطے بھائی کو سنیں گے۔ سوالات کی

ہمت اپنے میں تھی ہی نہیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دیر میں ہم لوگ بمع ٹیپ ریکارڈر سبطے بھائی کی خدمت میں حاضر تھے۔ سبطے بھائی نے اپنی دلکش مسکراہٹ سے ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ اور اپنے بکھرے ہوئے کاغذات اور کتابوں کو سمیٹتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ مظہر جمیل نے سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔ سبطے بھائی ترقی پسند ادب اور تحریک کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ ۴،۲ سوال مسلم شمیم نے اور شاید ایک آدھ میں نے کیا ہو باقی تمام استفسارات مظہر جمیل کی جانب سے تھے۔ انٹرویو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا اور جب ہم لوگ اٹھے تو ہمارے پاس تاریخ کا گراں قدر سرمایہ تھا۔ یہ انٹرویو مظہر جمیل کی مرتبہ کتاب 'گفتگو' میں شامل ہے اور میرے خیال میں یہی ان کا آخری انٹرویو تھا جسے کسی قدر جامع کہا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ کانفرنس میں نور (سجاد ظہیر کی سب سے چھوٹی بیٹی) نے بھی سبطے بھائی کا انٹرویو لیا اور اس انٹرویو کی ابتداء رونِدر یالہ کے چھوٹے سے کیفے ٹیریا سے ہوئی تھی جہاں ایک میز پر نور، سبطے بھائی کے پاس بیٹھی تھیں مگر لوگوں کی ہمہ وقت آمد و رفت، شور و غوغا کے سبب پریشانی سے دوچار تھیں، چنانچہ میں نے نور سے کہا کہ یہ جگہ مناسب نہیں آپ سبطے بھائی کو کسی ایسی جگہ لے جا کر گفتگو کریں جہاں یکسوئی میسر ہو۔ غالباً نور پھر سبطے بھائی کے ساتھ گومتی ہوٹل چلی گئیں تھیں جہاں یہ انٹرویو مکمل ہوا ہوگا۔

کراچی کانفرنس سے ایک دن پہلے یعنی ۵ مارچ ۱۹۸۶ء کو میرے شعری مجموعے 'سوغات' کی تعارفی تقریب تھی۔ صدارت کے لیے کئی نام دوستوں کے ذہن میں تھے مگر میری خواہش تھی کہ صدارت سبطے بھائی ہی کریں۔ محمد علی صدیقی، حسن عابد اور راحت سعید بھی اس رائے سے متفق تھے مگر زیادہ سرگرم راحت سعید تھے۔ تعارفی تقریب کے انعقاد سے کوئی پانچ چھ روز قبل میرے اور راحت سعید کے درمیان طے ہوا کہ ہم سبطے بھائی کے پاس آج شام چلیں گے۔ راحت سعید جو گولڈن جوبلی کانفرنس کے سلسلے میں انتہائی سرگرمی سے حصہ لینے کے باعث بہت زیادہ مصروف تھے، اس شام آگئے، میں نے سبطے بھائی کو فون کیا کہ 'ہم حاضر ہونا چاہتے ہیں، صرف چند منٹوں کے لیے' چند منٹ یوں کہے کہ ہمیں معلوم تھا کہ سبطے بھائی کس قدر مصروف ہیں انہیں کانفرنس کے لیے اپنا مقالہ تیار کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سبطے بھائی نے بہ کمال محبت ہمیں بلا لیا۔ راحت سعید اور میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ راحت سعید نے پہلے تو کانفرنس کے سلسلے میں اہم باتیں جو اُن سے کرنا تھیں ان کی خدمت میں عرض کیں پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا

اور ساتھ ہی ساتھ ایک جلد جو بغیر سرورق کی تھی سبطے بھائی کی خدمت میں پیش کر دی تا کہ وہ اس کا مطالعہ کر سکیں۔ سبطے بھائی نے بڑی محبت سے ہمارا مدعا سنا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا' کہ بھئی ہندوستان سے بھی بڑے بڑے ادیب وشاعر آ رہے ہیں اُن میں سے کسی سے صدارت کراؤ تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اس سے مہمانوں کی عزت افزائی بھی ہوگئی' اس پر میں تو خاموش ہو گیا مگر راحت سعید نے کہا کہ 'شاید دلی خواہش ہے کہ اس تقریب کی صدارت صرف اور صرف آپ ہی فرمائیں' راحت سعید سے یہ جملہ سن کر سبطے بھائی نے بغیر کسی تامل کے کہا کہ 'بھئی اگر یہ معاملہ ہے تو میں حاضر ہوں۔' اُن سے وعدہ لینے کے بعد دوسرے ہی دن دعوت نامے چھپنے کے لے دے دیئے جس میں صدارت کے لیے سبطے بھائی کا نام درج تھا۔

۵ مارچ ۸۶ سبطے بھائی کا مقالہ جو انہوں نے گولڈن جوبلی کانفرنس میں پڑھنا تھا مکمل نہ ہوسکا تھا اور وہ شب وروز اس کی تکمیل میں مصروف تھے۔ دوسرے دن ہی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ کانفرنس کی ذمہ داریاں الگ، مقالے کی مصروفیات اپنی جگہ پر۔ غرض کہ ان کے معمولات خاصے درہم برہم تھے لہٰذا چارونا چار ۵ مارچ کی دوپہر کو سبطے بھائی نے مسلم شمیم سے کہا کہ مقالہ نامکمل ہونے کے سبب ان کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا کہ وہ سوغات کی تعارفی تقریب کی صدارت کر سکیں۔ بہتر ہوگا کہ اس تقریب کی صدارت ہندوستانی کے ممتاز نقاد اصغر علی انجینئر جو کراچی پہنچ بھی چکے ہیں، سے کراؤ۔ حالات ہم سب کے پیش نظر تھے سبطے بھائی کو ہم لوگ مزید زیر بار نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا فیصلہ سبطے بھائی کی مرضی کے مطابق ہوا۔ مظہر جمیل جو اس تعارفی تقریب کی نظامت کر رہے تھے انہوں نے صدارت کے یے اصغر علی انجینئر صاحب کا نام تجویز کیا۔ مقررین میں زاہدہ حنا، فخر زماں، ڈاکٹر شارب ردولوی، ظہیر کاشمیری اور خود صدر جلسہ اصغر علی انجینئر شامل تھے حاضرین میں ملک بھر سے آئے ہوئے کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ یورپ، امریکہ اور ہندوستان سے آئے ہوئے مہمانانِ گرامی بھی شریک تھے۔

افسوس سبطے بھائی بوجہ اپنی عدیم الفرصتی اس تقریب میں نہ آسکے اور میں اس اعزاز سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا کہ اپنی ناچیز کاوش پر سبطے بھائی کی رائے سے مستفید ہو سکتا۔

سیّد سبطِ حسن ــــ 'شہرِ نگاراں کا مسافر'

ش۔فرخ

یہ مارچ ۸۶ء کی بات ہے۔

پاک امریکن کلچرل سینٹر میں ایک کھیل چل رہا تھا۔ ایک شام میں ایک دوست کے ہمراہ وہ کھیل دیکھنے جارہی تھی۔ سامنے ایک گاڑی تھی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ پیچھے سے سفید سفید بال نظر آئے۔ ارے اس گاڑی میں سبطِ بھائی ہیں۔ وہ کہاں جارہے ہیں اس وقت۔

سیّد سبطِ حسن بیٹی اور نواسیوں کے ابو اور کچھ لوگ انہیں سبطِ صاحب کہتے تھے۔ زیادہ تر سیّد صاحب کہے جاتے تھے۔ مگر ان کے مداح، ہر عمر، ہر طبقے کے لوگ انہیں سبطِ بھائی ہی کہتے تھے۔

پی اے سی سی کے ہال پہنچے۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھے تھے کہ سبطِ بھائی اپنے چند نوعمر مداحوں کے ساتھ پہلی صف میں آکر بیٹھ گئے۔ میں کسی کام سے اُٹھی۔ سلام کیا۔ مسکرائے۔ پھر انہوں نے پورا ڈرامہ دیکھا۔

کراچی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ وہ ہو چکی۔ گذشتہ برس یہ کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ سبط بھائی لندن گئے۔ اس سے قبل اوسلو میں مقیم پاکستانی طلبا کے خطوط سبط بھائی کے نام آئے تھے کہ آپ لندن جائیں گے تو اوسلو ضرور آئیں، وہاں گئے۔ خوش خوش لوٹے۔ اس سلسلے کی تیسری کانفرنس لکھنؤ میں تھی۔ پروفیسر قمر رئیس کراچی سے دہلی جانے لگے۔ تو سبط بھائی کو

یہ مضمون ہفت روزہ 'اخبارِ خواتین' کی اشاعت ۳۰ر اپریل تا ۶ مئی ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا (مرتب)۔

فون کیا کہ آپ لکھنؤ ضرور آئیں۔ میں ٹکٹ کا انتظام کروں گا۔ سبط بھائی نے انہیں منع کیا۔ ایک روز کہنے لگے۔ میں لکھنؤ نہیں جانا چاہتا۔ ایک تو کہیں جانا ہو تو اس سے دو ہفتے پہلے اور واپس آنے کے دو ہفتے بعد تک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس قدر وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

ایک شام میں دفتر سے لوٹی۔ مجھے نوشابہ سے کچھ کام تھا۔ وہ کہنے لگی چلو ذرا ابو کی طرف چلتے ہیں۔ میں نے کہا دیکھو۔ خوامخواہ ڈسٹرب ہوں گے۔ پھر ڈانٹ دیتے ہیں، تو اس نے کہا کہ نہیں اس وقت وہ چائے پی رہے ہوں گے۔ ہم بھی ان کے ساتھ چائے پی لیں گے۔ اچھا ہے، بنانی نہیں پڑے گی۔

سبط بھائی دوپہر کو دفتر سے لوٹتے، کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کام کرنے لگتے۔ شام چار پانچ کے بعد سے رات گیارہ بارہ بجے تک، باہر کا دروازہ کھلا رہتا، تا کہ جو کوئی آنا چاہے، بے دھڑک گھنٹی بجائے اور دروازہ کھٹکھٹائے بغیر آ جائے۔

ہم دونوں، ان کے ہاں گئے وہاں زاہدہ حنا بیٹھی تھیں۔ زاہدہ کانفرنس ہی کے سلسلے میں دہلی جانے والی تھیں۔ وہ سبط بھائی کے ساتھ اس بارے میں کچھ تبادلہ خیال کر رہی تھی۔ اس وقت تک یہی تھا کہ انہیں لکھنؤ نہیں جانا ہے۔ اس روز وہ چونکہ کانفرنس کے بارے میں کچھ بات چیت کر رہے تھے اس لیے ہم دونوں کو بالکل کوئی لفٹ نہیں دی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا میری ایک کتاب آپ کے پاس ہے۔ وہ ایک ناول تھا۔ انہوں نے وہ کتاب مجھے ٹی وی پر سے اٹھا کر دی۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ مگر وہ لکھنؤ کانفرنس میں جانے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

سیّد سبط حسن جب کراچی آئے تو طویل نظر بندی اور 'لیل و نہار' (لاہور) سے علیحدگی کے بعد خاصی بے سروسامانی کے عالم میں تھے۔ ان کی اکلوتی اولاد نوشابہ کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ خود ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ بقول نوشابہ کے ان دنوں میں محسوس کرتی تھی کہ ابو اس مکان میں آرام سے نہیں ہیں۔ میرے پاس گلشن اقبال میں پندرہ سو گز کا ایک پلاٹ تھا۔ ہمارا ارادہ گھر بنانے کا نہ تھا۔ مگر فصیح کا خیال تھا کہ (نوشابہ کے شوہر فصیح الدین زبیری) ابو یہاں اپنا گھر بنا لیں۔ ابو راضی نہ ہوئے۔ نہ ہی ان کے اتنے وسائل تھے۔ مگر کہنے لگے ٹھیک ہے میں پانچ سو گز میں اپنا مکان بنوا لیتا ہوں۔ تم زمین کے پیسے مجھ سے قسطوں میں لے لینا۔ بہر طور راضی ہو گئے۔ کہا کہ میں تعمیر کے اخراجات کسی نہ کسی طور پورے کر لوں گا۔

دس گیارہ سال قبل۔ جب مکان کی تعمیر شروع کرنے کا ارادہ کیا تو آرکیٹیکٹ سے کہا کہ بھئی مجھے تو صرف ایک چھت چاہیے۔ جہاں میں ہوں اور میری کتابیں ہوں۔ ساتھ ہی یہ ہدایت دی کہ میرے گھر اور نوشابہ کے گھر کی اینٹرینس بالکل الگ ہوں، کیونکہ یہ بہت جاسوسی کرتی ہے۔ اس کے گھر میں کوئی آئے یا میرے گھر میں کوئی آئے تو ایک دوسرے کو خبر نہ ہو۔ البتہ نقشہ ایسا ہو کہ بچے نینا، طاہرہ اور دانش۔ جو اس وقت بہت کم سن تھیں۔ میری طرف آنا چاہیں تو انہیں سڑک پر نہ نکلنا پڑے وہ اندر کے راستے سے میرے پاس آجایا کریں۔

وہ گھر بن گیا۔

سبط بھائی ایک روز لاہور کو یاد کر رہے تھے۔ کہنے لگے لاہور کا موسم بڑا اچھا ہے۔ وہاں ہر موسم کھل کر آتا ہے۔ گرمی کے موسم میں صحن میں چارپائی ڈال کر بیٹھنے میں بڑا مزہ تھا۔ ایک تو کراچی میں نہ سردی کا مزہ آتا ہے نہ گرمی کا۔ وہ ہر سال ایک چارپائی منگواتے اور وہ مکان کے پچھواڑے میں پڑی خراب ہوتی رہتی۔ گذشتہ برس اپنی لائبریری اور بیڈروم کے باہر برآمدہ بنوایا کہ بارش کے موسم میں یہاں بیٹھنا اچھا لگے گا۔ مالی کو ہدایت کی کہ پرانی گھاس نکال کر مٹی کھاد ڈال کر دوبارہ لان بنائے۔

گذشتہ دنوں شام کی سیر کے لیے جانے لگے تھے۔ لوٹتے تو نیچے سے آواز دیتے۔ بھئی بچو، کہاں ہو۔ اوپر آتے کہتے، میں تم لوگوں کو دیکھنے آگیا تھا۔ کچھ دیر بیٹھتے اور پھر اپنے گھر کی طرف چلے جاتے میں یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ سبط بھائی کو کل بہت سے لوگ کہیں چھوڑ آئے تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے طلبا، بس پر سرخ جھنڈا لہراتے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ 'سبط حسن کو سرخ سلام۔'

جو کچھ مجھے یاد آتا جاتا ہے۔ میں لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ مجھے بار بار خیال آ رہا ہے۔ وہ یہ سطور پڑھتے تو مجھے ڈانٹ دیتے کہ تم فضول باتیں لکھ دیتی ہو۔ میں نے بھی آج ان کی باتیں لکھتے وقت بڑی لبرٹی لی ہے۔ میرا جو جی چاہے گا لکھ دوں گی۔

لکھنؤ جانے سے پہلے ایک شام نوشابہ کی طرف آئے کہا کہ بھئی ہم جا رہے ہیں۔ اب ہم نہیں رک سکتے۔ بڑا سخت بلاوا آیا ہے۔ بچوں سے بیگ مانگا تو کہا کہ مجھے وہ ٹورسٹ والا بیگ نہ دے دینا۔ بچوں نے فرمائش کی کہ ابو آپ لکھنؤ سے ہمارے لیے دوپٹے لائیے گا۔ پوچھنے لگے کہ کیسے؟ تو نینا نے انہیں ایک چکن کا دوپٹہ دکھایا۔ ہنستے ہوئے بولے۔ یہ کیا اس پر کیڑے مکوڑے بنے

ہوئے ہیں۔ میں بہت اچھے دوپٹے لاؤں گا۔ میرا خیال ہے اس دفعہ تمہاری ماں کے لیے کتھا بھی لے ہی آؤں گا۔

نوشابہ ابو کو یاد کر رہی تھی۔

'ان کی کسی بات سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ البتہ چند روز پہلے ایک انشورنس پالیسی مجھے دی۔ کہا کہ اپنی ماں کو دے دینا۔ ایک دم بہت سے پیسے مل جائیں گے۔'

میری عادت تھی کہ صبح سات بجے ٹوتھ برش ہاتھ میں لیے ابو کی طرف جھانکنے چلی جاتی تھی۔ وہ بعد دوپہر کی فلائٹ سے دہلی جانے والے تھے۔ میں گئی تو وہ حسب عادت بستر پر نیم دراز چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا آپ آج دفتر تو نہیں جا رہے۔ کہا نہیں۔

دوپہر کا کھانا کھانے لگے تو سب سے چھوٹی نواسی دانش سے کہا، 'بھئی چلو میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ بس ہم آٹھ دس روز میں لوٹ آئیں گے۔' انہیں ائیر پورٹ پہنچانے ان کا ملازم اور ڈرائیور گئے تھے۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں جائیں تو یہ بتانا بھول جاتے کہ کب لوٹیں گے۔ گذشتہ برس ہندوستان سے لوٹے تو ائیر پورٹ سے فون کیا کہ میں بتا کر گیا تھا کہ فلاں دن آ رہا ہوں۔ کوئی لینے ہی نہیں آیا۔ تو شابہ نے تاکیداً کہا کہ ابو آپ اپنی آمد کا ٹیلیکس بھجوا دیں پھر آپ اگر کہیں گے کہ میں بتا کر گیا تھا۔

جانے سے پہلے جون ایلیا کو فون کر کے بتایا کہ میں لکھنؤ جا رہا ہوں۔ آپ کے پرچے کے لیے بہت سی چیزیں لاؤں گا۔ ویسے تو وہ پرکالہ (زاہدہ حنا) بھی گئی ہے۔ وہ بھی بہت کچھ لے آئے گی۔

جانے سے چند روز قبل۔

ہر سال ایسے ہوتا تھا۔ سبط بھائی کو پبلشر کی طرف سے کتابوں کی رائلٹی ملتی تو وہ سب بچوں میں تقسیم کر دیتے۔ نینا، طاہر، دانش اور نوشابہ سب کو اسی طرح پیسے ملتے جیسے کبھی ان کے باپ دادا ہر سال زمینوں کی فصل کٹنے پر اپنے بچوں کو پیسے دیتے ہوں گے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ تینوں نواسیوں سے کہنے لگے۔ جب میں نہیں ہوں گا تو تم لوگ میرے گھر کو بیچ کر سارے پیسے اُڑا دینا۔ ماں باپ کو بالکل کچھ نہ دینا۔

اکیس اپریل ۱۹۸۶ء ہم سب کو سبط بھائی کی آمد کا ٹیلیکس مل چکا ہے۔ پتہ نہیں کتنے تحفے، [illegible] کے کتنے بلیٹن، کتنے سارے لوگ، بار بار پوچھ رہے ہیں۔

کب!! کس وقت

میں نے نکین کی غیر موجودگی میں ان کے مکان کا قفل کھلوایا۔ وہ دروازہ جو اس وقت ہمیشہ کھلا ملتا تھا۔ باہر لیٹر بکس میں کوئی خط نظر آ رہا تھا۔ سبط بھائی زیادہ تر اپنے بیڈروم میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ان کے بستر کے پاس میز پر ایک پیالے میں بہت سے پائپ رکھے رہتے تھے۔ وہ سگریٹ کے بجائے پائپ پیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں پرانے پائپ جمع کرنے کا شوق ہے کہنے لگے نہیں بھئی ایک پائپ میں رطوبت آجائے تو میں تبدیل کر لیتا ہوں۔ یہ سارے پائپ اس لیے رکھے ہیں۔

بستر پر اجرک بچھا ہوا۔ ان کے جانے سے پہلے ان سے جو کوئی ملنے آیا ہوگا۔ اس نے جو وہاں بیٹھ کر سگریٹ پیئے تھے۔ ان کے ٹکڑے۔ بستر کی اطرافی میز پر ابوالکلام آزاد پر ایک مضمون کی کاپی رکھی ہے۔ اب میں ان کی لائبریری میں آتی ہوں۔ رائٹنگ ٹیبل پر دیوان غالب کا ایک نسخہ اور ترقی پسند ادب پر ایک کتاب رکھی ہے میز پر ان کی غیر موجودگی میں آنے والی ڈاک رکھی ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاک سے آئی ہے۔ 'فیض' محبت اور انقلاب کا شاعر' میز پر ایک فائل پر لکھا ہے۔ 'Battle of Idias in Pakistan' یہ اُن کی زیرِ طبع کتاب کا نام ہے۔ ایک شیلف کے اوپر ان کی اور مجاز کی تصویر رکھی ہے۔ دونوں کی جوانی کا عکس اور اس کے نچلے خانہ میں نینا، طاہرہ اور دانش کی بچپن کی تصویریں فریم کی ہوئی پڑی ہیں۔ ٹی وی پر ایک چشمہ اور پائپ رکھا ہے۔ کتابوں کے ایک خانے میں ایرن مور تمباکو کی ڈبیہ اور ساتھ 'بیادِ فیض' پر ضیاء محی الدین کی کیسٹ رکھی ہے۔

کہتے تھے۔ 'میری ساری دولت یہی کتابیں ہیں۔' لکھنا پڑھنا۔ ان کا طرز زندگی تھا۔ میں دہلی جانے لگی تو میرے لیے کچھ تعارفی خطوط کے علاوہ مجھے تاکید کی کہ جواہر لال یونیورسٹی جا کر پروفیسر احمد حسن سے ملنا اور کہنا کہ میں نے جو پریم چند پر مضمون لکھے تھے ان کی کاپیاں بھجوا دیں۔

گھر کے بیرونی دروازے پر بوگن ویلیا کے کاسنی پھول کھلے ہیں۔ نوشابہ کو یاد آ رہا ہے۔ وہ کبھی یہ خبر پڑھتے یا سنتے کہ فلاں مالک مکان نے کرایے دار کو اس طرح پریشان کیا تو کہتے۔ 'شکر ہے ہمارے سر پر ایک چھت تو ہے۔' وہ جب اس مکان میں رہنے لگے تو اپنے باغیچے کو سنوارنے میں بڑے مشغول رہتے، نرسریوں سے پودے خرید کر لاتے کہتے یہاں ہر طرح کا مشرقی پودا لگاؤں گا۔ ایک بار مہندی کا پودا لے آئے۔ کیلے لگائے۔ رات کی رانی کا پودا لگایا۔ ایک بار نارنگی کا

گملالائے اور کہا کہ یہ میں دانش کے لیے لایا ہوں۔

سبط بھائی کا جہاز ابھی تک دہلی سے نہیں آیا۔

کراچی میں بھارتی قونصل جنرل آفتاب سیٹھ کا پیام آیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک سے ایک ممتاز اسکالر ایک ترقی پسند مصنف، ایک عظیم فلاسفر چھن گیا ہے۔ حیدرآباد اور لکھنؤ میں اردو صحافت میں ان کی خدمات ہندو پاک ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں ان کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری بات کر رہے ہیں۔ وہ یہ دلدوز خبر سن چکے ہیں۔ وہ نوشابہ سے کہہ رہے ہیں۔ سبط میرا بیٹا تھا۔ ایسا بیٹا جس پر میں فخر کرتا ہوں۔ میں علیل ہوں تمہارے پاس نہیں آسکتا۔

تم مجھے ملنے آنا۔

صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا تعزیتی پیغام آیا ہے گورنر سندھ کا تعزیتی پیغام آیا ہے۔

کہیں سے آواز آتی ہے 'اردو ادب کا سرمایہ چلا گیا ادب کو یتیم کر گیا؟

سبط بھائی دہلی سے آئے تو ان کے ساتھ نور ظہیر تھیں سجاد ظہیر، جنہیں سب بنے بھائی کہتے ہیں۔ ان کی صاحبزادی جو دہلی میں 'پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ' جریدے کے ساتھ منسلک ہیں۔

میں نے نور سے پوچھا۔ آپ نے ہمراہ آنے کا کیسے سوچا۔

مجھے اس پر کسی نے مجبور نہیں کیا۔ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا کہ مجھے اپنے کامریڈ کا گھر ضرور دیکھنا چاہیے۔

نور کو لکھنؤ کانفرنس یاد آرہی ہے۔

پوری کانفرنس میں وہ بے حد مقبول تھے۔ وہاں کے لوگ ان کے ساتھ دیوتاؤں کا سا سلوک کر رہے تھے ان کی ہر بات پر داد ستائش ملتی۔ وہ کانفرنس میں کہہ رہے تھے کہ اہم بات تخلیق ہے۔ اس کی وضع یا فورم اہم نہیں۔ وہ کسی بھی زبان میں ہو۔ ایک بات کا ہندی میں نقطہ اوپر لگتا ہے یا نیچے کہتے ہیں ہندی میں غالب، گالب ہو جاتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نثر لکھیں یا شاعری کریں۔ اردو میں لکھیں یا ہندی میں ترقی پسند تحریک آپ سب کے لیے برابر ہے۔ کانفرنس کے سیشن کے دوران وقفہ ہوا مجھ سے ملے تو بہت خوش ہوئے کہنے لگے تم روز مجھ سے ملتی رہنا۔ کافی

پیتے ہوئے کہنے لگے۔ ایک تو ہندوستان اور پاکستان والوں کو کافی نہیں بنانی آتی۔ تو ہم لوگ یہ بات سن کر بھاگے اور کچھ کافی پاؤڈر لائے تا کہ ان کی کافی ٹھیک کر دیں۔

لکھنؤ سے وہ الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں اپنے عزیزوں سے ملے وہاں سے مجھے دہلی فون کیا کہ میں پریاگ راج ایکسپریس سے آ رہا ہوں میں اور میرے میاں انہیں اسٹیشن لینے گئے۔ چند سال پہلے بھی میں انہیں اسٹیشن لینے گئی تھی۔ میرے میاں سے غلطی یہ ہوئی کہ اسکوٹر دوسری طرف کھڑا کر دیا۔ اسٹیشن پر اترے۔ اسکوٹر کے بارے میں پتہ چلا تو کہا کہ تمہاری 'Sense of Direction' ہمیشہ سے بہت خراب ہے۔ انہیں میری پچھلی غلطی یاد تھی۔ ہم نے کہا کہ آپ ہمارے پاس ٹھہر جائیں کہنے لگے نہیں میں جے این یو (جواہر لال یونیورسٹی) کے گیسٹ ہاؤس میں ہی ٹھہروں گا۔ تا کہ لائبریری میں کام کر سکوں میری رہائش یونیورسٹی سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں روز صبح وہاں جاتی۔ ساتھ ناشتہ کرتے وہ پھولوں کے نام پوچھتے کچھ نام بتاتے۔

آخری روز۔

میں پورا دن اُن کے ساتھ تھی۔ ہم صبح ساڑھے نو بجے یونیورسٹی سے نکلے پی آئی اے کے دفتر گئے تو کہنے لگے 'چلو کہیں بیٹھ کر کولڈ کافی پیتے ہیں'، میں نے کہا آپ کو اپنے وزن کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ تو پھر کولڈ کافی کیسے پئیں گے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے میں آئس کریم کے ساتھ نہیں پیئوں گا۔ لیکن جب میں نے آئس کریم والی کافی منگوائی تو خود بھی ویسی ہی کافی پینے پر آمادہ ہو گئے۔

نور تھکی ماندی، کچھ ہی دیر پہلے دہلی سے پہنچی ہیں۔ انہیں یاد آ رہا ہے۔ بیرون ملک جائیں تو پاس بہت محدود رقم ہوتی ہے۔ لیکن میں جب کبھی کوئی بل کی ادائیگی کرنے لگتی تو کہتے تم میرے سفید بال نہیں دیکھ رہی ہو۔ اور کبھی مجھے بل نہ دینے دیتے۔

اس روز کناٹ پلیس پر ایک کتابوں کی دکان میں گئے۔ یہ دکان انہیں ہمیشہ سے پسند تھی کچھ کتابیں دیکھیں اور کہا کہ جانے سے ایک روز پہلے یہ کتابیں اُٹھا لیں گے۔ میں نے ان کی کتاب (جو ہندوستان میں شائع ہوئی) سیکولرزم خریدی اور کہا اس پر دستخط کر دیں تو کہنے لگے یہ تم نے کیوں خریدی میں نے کہا نہ جانے آپ پھر کب آئیں گے۔

میں شام کو انہیں یونیورسٹی پہنچانے گئی۔ ٹھیک ٹھاک خوش باش تھے میں نے ان کا کمرہ وغیرہ

ٹھیک کیا اور اپنے گھر چلی گئی۔

رات کے دو بجے یونیورسٹی کا چوکیدار آیا اور اطلاع دی کہ آپ کے مہمان کی طبیعت خراب ہے میرے میاں اوم گپتا جو خود بھی جرنلسٹ ہیں۔ انہوں نے فوراً ایمبولینس منگوائی اور ہم انہیں ڈھائی بجے تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سینٹر لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اوسط درجے کا ہارٹ اٹیک تھا۔ بہرحال براوقت بخیریت گذر گیا ہے۔ اس کے بعد انہیں کرونری کیئر یونٹ میں لے گئے پھٹیڈین کا ٹیکہ دیا اور وہ دس منٹ میں سو گئے میں رات بھر وہاں رہی۔ صبح ان کی نو بجے آنکھ کھلی۔ بہت ٹھیک ٹھاک لگ رہے تھے۔ جاگے تو بولے دوپہر ہوگئی کیا۔ مجھے پیاس لگی ہے پانی دیا۔

باتیں کر رہے تھے۔ مجھے شعر سناتے رہے کہنے لگے تم بیت بازی کرلو تم جیت نہیں سکتی۔ مگر شاید آج جیت جاؤ۔

ایک نوجوان ڈاکٹر آیا۔ میں نے بتایا کہ پاکستان کے ادیب ہیں تو وہ کہنے لگا مجھے اپنی کتاب دیں۔ تو کہنے لگے تم میری کتاب کیسے پڑھو گے وہ سب اردو میں ہیں۔ ہاں میری نئی کتاب انگلش میں آرہی ہے۔ وہ پڑھنا پھر پوچھا۔ اوم آیا ہے کیا۔

دس بجے کے قریب ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ مجھے کہا کہ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ساڑھے دس بجے تک ان کے گرد چھ ڈاکٹر تھے۔ مگر حالات بس میں نہ تھے۔ ۱۰:۴۰ پر گھڑی کی سوئیاں رُک گئیں۔

گھڑی کی سوئیاں ___ چل پڑیں۔ ہمیشہ چلتی رہیں گی۔ ہندوستان کی پیپلز پبلشنگ ہاؤس کا اعلان۔

سبط حسن کی تمام کتابوں کا ترجمہ ہندوستان کی چودہ زبانوں میں کیا جائے گا۔

سیّد سبطِ حسن۔ کچھ یادیں

رفعت سروش

یہ ۲۱ر اپریل کی بوجھل رات ہے اتنی بوجھل کہ میرا ایک پرانا دوست، اور رفیق موت کے بوجھ تلے آل انڈیا میڈیکل انسٹیٹیوٹ کے کسی تاریک گوشے میں بے حس وحرکت لاش کی صورت دبا پڑا ہے اور دو گھنٹے سے نہیں کل دوپہر گیارہ بجے سے اور میں اپنے سیکڑوں دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ غالب اکیڈمی میں اس غریب الوطن بے گور وکفن کا ماتم کر کے غم کا ایک بوجھ سینے میں لیے اپنے گھر لوٹا ہوں۔ اس لاش کی رونمائی کل دوپہر تک ممکن ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے اس مشینی معاشرے کی اور وہ لاش!!

وہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے

اور بہار ۸۶ء کے اس اسدؔ خستہ جاں کا نام ہے ___ سید سبط حسن

سبط حسن کی ناگہانی موت پر اس کے دیرینہ رفیقوں، دوستوں اور مداحوں نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کیا۔ اس کی شبیہ کو عقیدت کے پھولوں سے ڈھک دیا، اور وہ شاید اپنی مادرِ وطن کی خوشبو کی بے آواز پکار سن کر چند روز پیشتر کراچی سے اپنے بچپن کی گلیوں کے شہر لکھنؤ آیا تھا۔ اس شہرِ خوباں میں گل افشانیٔ افکار کر کے دم لینے کو دلی ٹھہرا۔ اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ اور وہ یہیں خاک کا ڈھیر ہو گیا۔

کیا دوانے نے موت پائی ہے

سبط حسن کی موت پر برسوں آنسو بہائے جائیں گے، علم وادب اور فکر وفن کی دنیا میں اس کا ماتم کیا جائے گا اور اردو ادب اور ترقی پسند تہذیب کا پروردہ معاشرہ نہ جانے کب تک کفِ افسوس ملتا

رہے گا۔ رات کے یہ بوجھل لمحے مجھے ماضی کے نہاں خانوں میں لیے جارہے ہیں۔ یادیں مجسم ہوگئی ہیں اور مجھے چالیس اکتالیس سال پہلے کی دنیا میں لے آئی ہیں۔

سینڈھرسٹ روڈ (بمبئی) گول پیٹھا سے ذرا آگے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا صدر دفتر اوائل اگست ۴۵ء کی بھیگی بھیگی دوپہر میں سردار جعفری کے ساتھ 'قومی جنگ' کے دفتر میں پہنچا ہوں جو ایک کمرے پر مشتمل ہے۔

یہاں جن یکتائے روزگار لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سید سجاد ظہیر بھی ہیں، کنور محمد اشرف بھی اور سید سبط حسن بھی، چھریرے بدن کے تیکھے ناک نقشے والے نوجوان۔ سبط حسن بولتی ہوئی آنکھیں مگر چہرے پر سنجیدہ افکار کا پرتو۔ سبط حسن مجاز کے پرانے ساتھی، مگر نہ شاعر نہ افسانہ نگار۔ خالص صحافی اور تنقید نگار۔ مگر اس پائے کے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنؤ سے 'نیا ادب' نکالا تو اس ادبی رسالے کو انگریزی سامراج کے خلاف محاذ جنگ پر لاکر کھڑا کردیا۔ اور ہر اہل قلم کو چونکا دیا۔ 'آزادی کی نظمیں' اس شان سے یکجا کیں کہ سامراجی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی اور وہ کتاب بھی ہندوستان کی آزادی کی طرح ضبط کرلی گئی۔ سبط حسن کی یہ تعریفیں تو مجاز سے دہلی میں ہی سن چکا تھا۔ اب اس دھان پان شخص کو دیکھا تو نہ صرف دیکھا بلکہ آنکھوں میں عقیدت کا جذبہ بھی ابھر آیا۔ کس انہماک سے اخبار کے لیے کالم لکھ رہے ہیں۔ اور پھر وہی اخبار بازار اور ناگپاڑے کے چوراہوں پر اپنے ساتھیوں سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے ساتھ بیچ بھی رہے ہیں۔ اتنی لگن اتنا ایثار، اتنی خوداعتمادی، اتنا سکون یقیناً اس لیے کہ سبط حسن ان لوگوں میں سے تھے جنہیں یقین تھا کہ ان کے سفر کی ایک سمت ہے، ایک واضح منزل ہے وہ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے پرچم پر ان کی مضبوط انگلیوں کے نشان روزِ اول سے ثبت ہیں۔ اس وقت بھی ان کی گرفت مضبوط تھی جب پہلے پہل یہ پرچم لکھنؤ میں اپریل ۳۶ء میں لہرایا گیا۔ اور پھر جہاں جہاں یہ پرچم لہرایا گیا چاہے کلکتہ ہو یا حیدرآباد، لندن ہو یا کراچی ان کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی اور اب انجمن کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر ٹھیک پچاس سال بعد ان کے ہاتھوں میں وہی اگلی سی توانائی اور قوت تھی جب وہ اپنا آخری قرض ادا کرنے کراچی سے لکھنؤ آئے۔ وہ لکھنؤ کیا آئے۔ بہار آگئی کانفرنس کا ذرہ ذرہ انہیں محبت اور عقیدت کے پھول پیش کررہا تھا اور وہ کھلے جارہے تھے، ان کی ذہانت اور معصومیت شباب پر تھی۔ ان کا وجود بین الاقوامی رشتوں کی استواری

کی علامت بن گیا تھا۔ اس تاریخی کانفرنس کا افتتاح کرتے وقت نہایت جذباتی انداز میں تقریر کرتے ہوئے اور فرطِ جذبات میں بیہوش ہو کر اسٹیج پر گرنے سے پہلے ڈاکٹر ملک راج آنند نے سبطِ حسن کی انجمن سے والہانہ وابستگی کا ذکر نہایت بلیغ الفاظ میں کیا اور ان کی موجودگی کو کانفرنس کی کامیابی کی ضمانت قرار دیا۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے سجاد ظہیر کی کتاب 'روشنائی' کے نئے ایڈیشن کا اجراء کیا تو فرمایا کہ میں کتاب سجاد ظہیر کے وارث کو پیش کر رہا ہوں، اور پھر سبطِ حسن کو پکارا کہ آؤ یہ کتاب لو تم ہی تو سجاد ظہیر کے وارث ہو۔

سبطِ حسن نے کانفرنس میں نہ صرف پاکستانی وفد کی قیادت کی، بلکہ پوری کانفرنس میں اپنی گل افشانیوں سے روح تازہ پھونک دی۔ وہ بے حد مصروف تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورے لکھنؤ کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ ابھی کانفرنس میں ہیں تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی میں، کبھی فرنگی محل، کبھی حضرت گنج پرانے دوستوں سے ایسے گلے ملے جیسے پھر کبھی نہ ملیں گے۔ برسوں بعد یہ سعادت میرے حصے میں بھی آئی۔ بمبئی اور کراچی کے دوستوں کا تذکرہ رہا خاص طور پر ممتاز حسین اور ملک نورانی کا مگر بس رواروی میں میں نے انہیں اپنی نظموں کا نیا مجموعہ 'مری صدا کا غبار' پیش کیا تو بے حد خوش ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آئی جیسے اپنے سیراب کیے ہوئے پودے پر کھلا ہوا پھول دیکھ رہے ہوں اور مجھے یاد آ گئے بمبئی کے وہ دن جب سبطِ حسن باتوں باتوں میں ادب کے نکات بیان کیا کرتے تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری شروع کی نظموں میں قنوطیت اور یاسیت کا غلبہ تھا۔ مجھے زندگی کا ایک ہی پہلو متاثر کرتا تھا۔ ہر طرف انتشار اور انجام فنا، میری نظمیں، گلاب کا پھول، ستارے، اندھیری رات، دردِ مستقل، رہگزر، وغیرہ وغیرہ اس احساس کی تصویریں ہیں۔ ایسی ہی ایک اور نظم کہی میں نے 'غروب آفتاب'۔ نظم اس مصرع سے شروع ہوتی تھی۔

بسترِ شام پہ دم توڑ رہا ہے سورج

اور طلوعِ آفتاب کا منظر پیش کرنے کے بعد زوالِ آفتاب کا منظر نظم کیا تھا۔ اور نظم کا اختتام اسی مصرع سے ہوتا تھا۔

بسترِ شام پہ دم توڑ رہا ہے سورج

یہ نظم میں نے 'نیا ادب' میں اشاعت کے لیے دی جو ان دنوں بمبئی سے دو ماہی کتاب کی صورت میں سبط حسن سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ دو تین دن بعد سبط حسن نے منظر نگاری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ نظم ادھوری ہے۔

'کیوں؟'

'اس لیے کہ سورج غروب ہو کر پھر بھی تو نکلتا ہے'

'مگر یہ تو ایک تصویر ہے'

'لیکن ادھوری، تم نے اس نظم میں سورج کو زندگی کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور زندگی رواں دواں ہے، جاری و ساری ہے۔ یہ تصویر اس وقت مکمل ہو سکتی ہے جب سورج کے دوبارہ نکلنے کے تصور کو پیش کیا جائے۔'

مجھے سبط حسن کے اس نظریۂ حیات اور تعمیری تنقید نے بے حد متاثر کیا اور میں نے نہ صرف وہ نظم دوبارہ کہی بلکہ رجائیت کو اپنی فکر کا ایک حصہ بنا لیا، اور آہستہ آہستہ زندگی کی جدوجہد اور انسان کی عظمت پر میرا الیقین پختہ ہوتا چلا گیا اور میں نے اپنے استاد کو ترقی پسندی کے ہم آہنگ پایا۔ میں نے اس نظم میں جن اشعار کا اضافہ کیا تھا ان میں سے ایک دو یاد آ رہے ہیں۔

اب پس پردہ تاریک چھپا جاتا ہے نور اک لقمۂ ظلمات بنا جاتا ہے
اپنی منزل کی طرف پھر بھی بڑھے جائے گا چیر کر سینۂ ظلمات ابھر آئے گا

اور آخری شعر تھا

نئے انداز سے تزئین گلستاں ہوگی پھر جبین چمن دہر درخشاں ہوگی

اور وہ نظم 'غروب و طلوع' کے عنوان سے 'نیا ادب' میں چھپی۔

بظاہر یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے۔ مگر بعض معمولی باتیں اتنی اہم ہوتی ہیں کہ زندگی کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ سبط حسن کی تنقید نے میرے شعور کو جھنجھوڑا اور میں نے زندگی کرنے کا نیا فن سیکھا۔

اکتوبر ۴۵ء میں حیدر آباد (دکن) میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس میں بمبئی کے دس بارہ ادیبوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوا۔ ہندوستان بھر کے نمائندہ ادیب اور شاعر موجود تھے۔ سبط حسن نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی جس کا نفس مضمون یہ تھا کہ عریاں اور فحش ادب ترقی پسند ادب نہیں ہے۔ اس کی تائید اور تردید میں

گرما گرم تقریریں ہوئیں۔ مگر اتفاق سے یہ تجویز پاس نہ ہوسکی کیوں کہ اس کی مخالفت میں 'دلیلیٰ کے خطوط' والے قاضی عبدالغفار، اور 'وہ تراکوٹھے پر ننگے پاؤں آنا یاد ہے' جیسی بھڑکتی ہوئی غزلیں کہنے والے مولانا حسرت موہانی اپنے پورے ادبی قدوقامت کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سبط حسن کا تنقیدی شعور دور تک دیکھ رہا تھا اور اس زمانے میں چوں کہ حرام جادی والے حسن عسکری، اور 'لحاف'، اور 'بو' کے خالقین عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو سب ہی اپنے حسن و قبح کے ساتھ ترقی پسند سمجھے جا رہے تھے، اور بعض حلقے میراجی کی جنسی بے راہ روی پر مشتمل شاعری کو بھی ترقی پسندی کا ایک جزو کہہ کر پوری تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس موضوع پر دسمبر ۴۴ء میں ایک مناظرہ دہلی میں برپا ہوچکا تھا۔ اس لیے اس رجحان کے خلاف آواز اٹھانا وقت کا، تقاضہ تھا۔ اور سبط حسن کی تجویز وقت کی آواز تھی، کیوں کہ ترقی پسند ادب کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تھا ملک کی آزادی کا، فرقہ پرستی اور علاقائی، نسلی، مذہبی اور لسانی تعصّبات کے خلاف آواز بلند کرنے کا، عام آدمی میں اخلاقی جرأت پیدا کرنے کا اور مجموعی طور پر تخلیقی ادب کی بے پناہ قوت سے انسان کے لیے بہتر زندگی کا ماحول پیدا کرنے کا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوچکی تھی اور مظلوم انسانیت پھر اپنی شیرازہ بندی کر رہی تھی۔ کہاں گنجائشیں تھی غلاظتوں میں غوطہ لگانے کی۔ اور بعد میں اہل نظر نے دیکھا کہ مخصوص مفادات کے پیش نظر ترقی پسند نظریات کے خلاف صف آرا ہونے والوں نے ادب برائے ادب کے نام پر ابتذال کے کیا کیا نمونے پیش کیے۔ گذشتہ پندرہ بیس سال کی ادبی کاوشوں میں ایسی بہت سی چیزیں مل جائیں گی جو ایک سوچی سمجھی خطرناک تحریک کا نتیجہ ہیں۔ ۴۵ء میں سبط حسن کی وہ تجویز اسی تحریک کے سدباب کے لیے تھی۔

سبط حسن ۴۶ء میں بمبئی کو خیرباد کہہ کر امریکہ چلے گئے تھے۔ ان کے جانے سے بمبئی کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا تھا جو کبھی پر نہ ہوا۔ پھر وہ ولایت سے واپس بھی آئے تو پاکستان میں بس گئے اور ہندوستان اپنے اس سپوت سے ایک حد تک محروم ہوگیا۔ مگر نہیں سبط حسن تو ایک سورج تھا۔ وہ جہاں بھی چمکا، اس کی روشنی دنیا بھر کو فیض یاب کرتی رہی۔ اور اس بالغ نظر کے افکار تحریروں کی صورت میں دنیا تک پہنچتے رہے۔ اور اس نے 'موسیٰ سے مارکس تک' انسانی تہذیب کے عروج و ارتقا، تنازعے طبقا اور علمی اور ثقافتی اقدار کی نشاندہی کی۔ (اب یہ اور بات

ہے کہ کتابوں کے پاروں میں بھی اہلِ سیاست نے زنجیریں ڈال رکھی ہیں) پاکستانی دوستوں سے ان کی کئی نئی کتابوں کے نام سنے۔ مگر ہنوز پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔

میں نے ۱۹۴۶ء کے بعد دو تین سال پہلے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کسی سیمنار میں سبط حسن کو دیکھا تھا۔ بہت مختصر ملاقات تھی وہ__ اور اب لکھنؤ میں تین دن ساتھ رہا۔ ہم لوگ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ مگر وہ سیماب پا تھے__ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ انہیں پکار رہا تھا اور وہ 'لبیک' کہتے چلے جا رہے تھے۔__ خیال تھا کہ دہلی میں ٹھکانے سے ملاقاتیں ہوں گی__ مگر__ یہاں انہیں موت نے آواز دی اور وہ لبیک کہہ کر اس کی طرف کھنچتے چلے گئے__ اس حادثے کی خبر ملی تو آج صبح کے اخبار سے__ اور آج شام ان کے تعزیتی جلسے سے لوٹ کر بھی ان کی یادوں میں گم ہوں__ ان کی رُوح__ ان کے افکار کی صورت__ ان کے ہر چاہنے والے کے دل میں ڈھڑک رہی ہے__ مگر ان کا جسم__ بے کفن لاش__ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے مردہ خانے میں محصور ہے__ کل پاکستانی سفارت خانے میں اس کی رونمائی ہوگی۔ اور نمازِ جنازہ کے بعد یہ جسدِ خاکی کراچی پرواز کر جائے گا۔

لیکن__ کیا__ 'بسترِ مرگ پر دم توڑ چکا ہے سورج'!!

نہیں سبط حسن ہی نے تو کہا تھا کہ سورج پھر بھی نکلتا ہے۔

ہاں، علم و ادب اور فکر و فلسفہ کا یہ سورج غروب ہو کر بھی غروب نہیں ہوا__ اسے کل پھر چمکنا ہے، ننھے بچوں کی آنکھوں میں، ظلم اور جبر و استحصال کے خلاف جنگ کرنے والے نوجوانی کے ارادوں میں، نئی زندگی کی بشارت دینے والے قلم کاروں کے دلوں میں۔

سبطے چچا

نورظہیر

'تم نے لکھا ہے کہ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ میری عمر اڑسٹھ (۶۸) سال، رنگ صاف، قد پانچ فٹ چھ انچ، جسم دُہرا، بال بہت کم وہ بھی سفید، لوگ مجھے خوب صورت کہتے ہیں۔ ہاں! تم نے پوچھا ہے سگریٹ پیتا ہوں یا نہیں! سگریٹ تو نہیں، ہاں پائپ ضرور پیتا ہوں۔ تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیا تم مجھے چچا کہہ سکتی ہو۔ تو بھئی چچا تو میں تمہارا ہوں ہی اور کیا کہوگی۔'

سبطے چچا کا پتہ مجھے یوں ہی اتفاقاً امی کی ایک ڈائری سے مل گیا تھا اور یہ سطریں میرے خط کے جواب میں تھیں۔ اس خط کے بعد ہماری خط و کتابت برابر ہوتی رہی۔ کوئی دس مہینے بعد میرے گھر ٹیلیفون آیا۔ 'نورظہیر ہیں مجھے سبط حسن کہتے ہیں۔' انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے کاری ڈور میں چلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ سبطے چچا کی کون سی چیز مجھے سب سے زیادہ متاثر کرے گی۔ کون سی عادت مجھے یاد رہے گی۔ دروازے پر دستک دے کر میں اندر داخل ہوئی تو سب سے پہلے مجھے اس کمرے میں ایک الگ سی مہک کا احساس ہوا، پائپ کی تمباکو کی، کچھ کڑوی میٹھی سی اور اس کے ساتھ پانڈس ٹالکم پاؤڈر کی جسے سبطے چچا بہت شوق سے لگاتے تھے۔ پھر ایک سفید بالوں والا شخص مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

'تو تم نور ہو۔' سنا ہے تم اسی اخبار میں کام کرتی ہو جس میں ہم کام کرتے تھے۔ کیسا چل رہا ہے

سجاد ظہیر کی چھوٹی صاحبزادی نورظہیر نے یہ مضمون سبط حسن کے تعزیتی جلسے میں پڑھا تھا جو کراچی پریس کلب میں منعقد ہوا۔ نورظہیر سبط حسن کی میت لے کر دہلی سے کراچی آئی تھیں۔ مشمولہ: 'طلوعِ افکار' (کراچی) اپریل ۱۹۸۸ء (مرتب)۔

نیشنل ہیرالڈ آج کل۔؟

اور وہ یوں باتیں کرنے لگے جیسے بہت دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد ان کے ساتھ میری کامریڈ شپ ہوگئی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں انہیں ہیرالڈ کا دفتر دکھاؤں، ایڈیٹر سے ملواؤں، نئی بلڈنگ دیکھ کر کہنے لگے۔ 'بھئی یہ تو بڑی شان دار ہے۔ ہم تو ایک چھوٹے سے کمرے سے ہیرالڈ نکالتے تھے صحیح سلامت کرسیاں بھی نہیں تھیں۔' میرے لاکھ منع کرنے پر بھی نیچے بیسمنٹ میں پریس بھی دیکھنے گئے۔

میرے ساتھ وہ جتنے دن رہے انہوں نے بس دو چیزوں کا شوق ظاہر کیا۔ کتابوں کا اور پائپ کا۔ کسی بازار میں یکا یک چلتے چلتے سبطے چچا غائب۔ پلٹ کر دیکھئے تو پایا تو کتابیں دیکھ رہے ہیں یا پھر کسی تمباکو کی دکان پر کھڑے دکان دار سے پائپ کی تمباکو، اس کی لکڑی یا گلیسز کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اکثر اپنی چیزیں اِدھر اُدھر بھولتے تھے اور مجھے ان چیزوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔ میں کبھی کبھار ناراض ہو کر کہتی بھی کیا؟ سبطے چچا جتنا وقت آپ کے ساتھ نہیں گزرتا اس سے زیادہ تو آپ کی چیزیں ڈھونڈنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنا پائپ کبھی نہیں بھولتے تھے اور اس بات سے کچھ شرمندہ سے بھی رہتے تھے۔ کتابیں بھی وہ اسی طرح خریدتے تھے اور جتنی بار بھی ملنے جایئے پڑھتے ہوئے ملتے تھے، ہر بار جب میں ان کی پیکنگ میں مدد کرتی تو مجھے وحشت ہوتی رہتی کہ ان کو اتنا وزن لے جانے کی کیوں کر اجازت ملے گی۔ لیکن ان میں عجیب کرشمہ تھا۔ اسی (۸۰) کلو اُوور ویٹ سامان اندر بھیج کر بڑے فخر سے پائپ بھرتے ہوئے کہتے۔

'بھئی نکال لیا اس بار بھی۔'!

اس بار سے پہلے اُن سے پچھلے سال جنوری میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نہرو یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک نوجوان میاں بیوی تھے جنہیں وہ پیار سے فاختہ کا جوڑا کہتے تھے۔ اس سال وہ میرے ساتھ خوب گھومے، بہت سے ڈانس میوزک کے پروگرام دیکھے، میرا رقص دیکھنے آئے اور اسٹیج کے پیچھے آ کر بڑی محبت اور مسرت سے کہنے لگے۔

'بڑا اچھا ناچتی ہو ہم نے نہیں سوچا تھا۔'

۱۰ر اپریل ۱۹۸۶ء کو لکھنؤ کا نفرنس ہال میں جب میں داخل ہوئی تو ڈائس پر سبطے چچا کو پایا۔ ہاتھ میں لیا ہوا پائپ انہوں نے منہ میں رکھا اور اس طرح سے ہاتھ ملایا جس میں ہلکی سی شکایت

بھی تھی کیوں کہ میں ایک دن دیر سے آئی تھی، لیکن پیار اور محبت بھی تھی۔

تین سیشن سے برابر بحث چل رہی تھی۔ میرے ساتھ کافی پیتے ہوئے کہنے لگے:

'اہم مسئلہ یہ نہیں کہ آپ کس زبان میں لکھیں، مسئلہ یہ بھی نہیں کہ آپ کون سا رسم الخط استعمال کریں، نقطۂ نظر بتائیں یا نہ بتائیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ادیب عوام کے مسائل پر لکھے اور زندہ ادب پیدا کرے۔ اب دیکھو نا، یہ سب باتیں کتنی بے معنی سی ہیں۔ تحریک تو ادیب سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کس زبان میں لکھے، کس طرح لکھے اور آیا نثر لکھے یا شعر لکھے۔ تحریک صرف سچ بولنے کی طاقت دے سکتی ہے۔ غلط چیزوں پر انگلی اٹھانے اور چوٹ کرنے کی ہمت دے سکتی ہے۔ تم۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں'

یہاں میں نے کھسیا کر کہا: 'سبطے چچا اتنے بڑے لوگوں کے سامنے ڈر لگتا ہے۔'

پائپ کا تمبا کو انگلی سے دباتے ہوئے بولے:

'پر پھیلاؤ۔ دو ایک بار گرو گی۔ پھر اُڑنا آجائے گا۔'

اسی کانفرنس کے دوران ایک شام کچھ نوجوانوں نے سبطے چچا اور کیفی چچا کو گھیرا اور ہم سب چائے پینے گئے۔ اسی گروپ میں دو حضرات (میں نام نہیں لوں گی) ایسے آئے جنہوں نے ان دونوں کو خوب باتیں سنائیں۔ بہت جھگڑا کیا۔ انٹ شنٹ باتیں کیں۔ دونوں چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب میری اور ایک بہاری رفیق کار کی برداشت سے باہر ہو گیا تو ہم دونوں نے ان موقع پرست اور تحریک دشمنوں کو کمرے سے تقریباً دھکا دے کر نکالا۔ غصہ پھر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور میں الٹے سبطے چچا پر برس پڑی۔

'یہ کیا ہے سبطے چچا! اتنے بہادر بنتے ہیں۔ کیوں آپ لوگوں میں اتنا ضبط ہے؟ کیا ضروری ہے کہ آپ ہر کسی کی بدتمیزی برداشت کرلیں۔ نہیں، بالکل ضروری نہیں ہے کہ میں تمہاری بدتمیزی برداشت کروں۔ میرے بولنے سے اُس وقت کیا ہوتا۔ یہی نا کہ انا کی تسکین ہوتی اور بس۔'!

دوستو! ان کی موت کیسے ہوئی۔ وہ سب بہت تکلیف دہ اور پرسنل ہے۔ صرف اتنا کہوں گی کہ وہ آخری وقت تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے شعر سنا رہے تھے۔ ڈاکٹر سے مذاق کر رہے تھے۔ نرس سے دل لگی کر رہے تھے۔ اچانک ان کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔

پھر یہ کام مجھے سونپا گیا کہ میں ان کے کمرے میں ان کی چیزیں چیک کر کے انہیں اپنے گھر

لے جاؤں۔ پرس کھول کر میں نے چابی نکالی اور ان کے کمرے کا تالا کھولا۔ وہ بہت باقاعدہ تھے۔ کمرے میں ان کی چادر اور رات کو اتاری ہوئی، قمیض اور پتلون کے علاوہ سب کچھ قرینے سے اندر بند تھا۔ سرہانے میز پر کتاب کھلی ہوئی الٹی رکھی تھی۔ بڑی میز پر کچھ کتابیں اور سفید کاغذ تھے جس پر بیٹل آف آئیڈیاز ان پاکستان' میں کچھ ہندوستان کو مدنظر رکھتے ہوئے ریفرنس لکھ رہے تھے۔ اس کے برابر میں ان کے سیاہ رنگ کا پن۔ موزے، نئی خریدی ہوئی کولہاپوری چپل، تکیے کے پاس آدھا پیا ہوا پائپ اور ان سب چیزوں کے ساتھ کمرے میں ایک الگ سی مہک، پائپ کے تمباکو کی، کڑوی میٹھی مہک کے ساتھ کھلی ہوئی پانڈس ٹالکم پاؤڈر کی خوشبو۔ اسی طرح تو میں روز ان سے ملتی تھی۔ ہر بار جب وہ دہلی میں ہوتے۔ اسی طرح تو میں ایک دن پہلے انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ سب کچھ۔ ہاں سب کچھ تو پہلے جیسا تھا۔ مگر پھر سبطے چچا۔

ان کی بات سنتے سنتے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک اونچے قد آور درخت ہیں جس کی جڑیں بہت گہری، تنا بہت مضبوط اور سایہ بہت گھنا، بہت ٹھنڈا ہے۔

آج ایسا لگتا ہے جیسے ایک ایک کر کے ایسے درخت ختم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ چھچھلی جڑوں والے، بوٹے قد والی جھاڑیاں لے رہی ہیں جن میں نہ پھول، نہ پھل، نہ خوشبو، نہ سایہ، نہ ٹھنڈک۔

میں جانتی ہوں کہ وقت کے ساتھ ان کے جدا ہونے کا غم ختم ہو جائے گا اور صرف یہ خوشی رہ جائے گی کہ ایسے شخص کے ساتھ ہمیں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ایک ایسا شخص جس کی چمک دار آنکھیں اور دل کش مسکراہٹ اس کے دشمنوں کو بھی جیت لیتی تھی جو تحریک کو کسی بھی فرد سے بڑا سمجھتے تھے۔ جو نوجوانوں سے برابری کا سلوک کرتے تھے اور کبھی نصیحت نہیں کرتے تھے۔ جسے بچوں اور پھولوں سے عشق تھا۔ جو انسانیت کے لیے بہتر سماج کے خواب دیکھتے تھے۔ جسے پڑھنے اور لکھنے کا جنون تھا اور جس کے پاس سے پانڈس ٹالکم پاؤڈر اور پائپ کے تمباکو کی کڑوی میٹھی خوشبو آتی تھی۔

ابو

نوشابہ زبیری

ابھی نینا کا لندن سے فون آیا تھا۔ خوشی سے تقریباً چیخ رہی تھی۔ 'امی میں پاس ہوگئی اور وہ بھی کہ مجھے بڑے Honours وغیرہ ملے ہیں۔ بھلا ہم جیسے کالوں کو وہ کب اتنی آسانی سے اچھے نمبر دیتے ہیں۔'

میرے قدم فوراً ابو کے گھر کی جانب بڑھے۔ بچوں کی ہر خوشی اور کامیابی ابو کی اپنی کامیابی ہوتی۔ ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو جاتا۔ ان کا بٹوہ بچوں کے ہاتھوں میں ہوتا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہ لوگ 'مزے' کرنے چلے جاتے مگر اب......

خیر جیسا اسلم اظہر نے اکثر کہا ہے کہ ہمیں بعض انسانوں کے جانے کا غم نہیں کرنا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں آئے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے کوشش اور جدوجہد کی۔

تو میری خوشی کا دارومدار اب اسی بات پر ہے کہ میں ایک ایسے انسان کے قریب رہی جو صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہا بلکہ دنیا کو کچھ دے کر اپنے وجود کا قرض چکا گیا۔

ابو کے بارے میں شاید ہی کوئی یہ کہہ سکتا ہو کہ وہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے تھے اور انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔ غصہ ان کو ضرور آتا تھا اور زوردار طریقے سے آتا تھا مگر صرف اصول توڑنے پر چاہے یہ اصول سیاسی ہوں یا سماجی یا جن سے ہمارا انسانی وقار اور ہماری تہذیب اور روایت کسی طور پر مجروح ہو رہی ہو۔

مشمولہ: 'طلوعِ افکار' (کراچی) اپریل ۱۹۸۸ء (مرتب)۔

حیدرزمان ایک پرانا پارٹی کا کارکن بڑے عرصے سے لاہور میں ہمارے گھر رہا۔ ابواس سے صرف اس وجہ سے شاکی رہتے تھے کہ وہ ایک ہی جملے میں کئی بار 'جناب' کی تکرار کرتا۔ 'یہ خودکو کیوں اتنا گرا دیتا ہے۔ میں بھی تو اس جیسا ہی ایک انسان ہوں۔ مجھے اس کے لہجہ میں غلامی کی بو آتی ہے' اس کی بیوی خدیجہ سے اکثر شکایت کرتے۔ مگر حیدرزمان بیچارا مسکرا کر چپ ہو جاتا۔

ایک بار ہمارے ملازم کا کھانا بلی کھا گئی جس وقت وہ موصوف ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے۔ ابو کا اتفاق سے باورچی خانہ میں گزر اس وقت ہوا جب وہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کی پلیٹ پر نظر پڑ گئی تقریباً چیختے ہوئے کمرے میں آئے اور بولے کیا میں نے ساری عمر اس لیے جدوجہد کی ہے کہ میرے گھر میں انسان کو پیٹ بھر کھانا نہ ملے پھر جب ملازم نے خود ہی بات صاف کی تو ڈانٹ پڑی کہ انڈے وغیرہ کیوں نہیں بنا لیے۔

ابو ہمیشہ انسان کو judge کرنے سے قبل اس کے سماجی اور ثقافتی background کو سمجھنے کی ضرور کوشش کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کی پہچان میں مدد ملتی تھی اور اس کا رویہ سمجھنا آسان ہو جاتا تھا۔ اکثر میں جب شکایت کرتی کہ 'مالی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر بھاگ گیا۔ آخر مجھ سے کہہ کیوں نہ گیا کہ نوکری نہیں کرنی ہے' تو ہمیشہ یہ سمجھاتے کہ اس خاص طبقے نے اپنی تمام جرأت و ہمت آہستہ آہستہ کھو دی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتا مکر و فریب ہمیں جان بوجھ کر نہیں دینا چاہتا مگر وہ ہم سے آنکھیں ملاتا ہوا ڈرتا ہے'۔

وقت کی پابندی نہ کرنا، یا وقت دے کر نہ آنا ابو کے نزدیک ایک خاصا بڑا جرم تھا۔ ان کے گھر جب کوئی سیلانیوں کی طرح لہراتا ہوا آتا تو ان کے چہرے پر 'جی فرمایئے' والا بورڈ لگ جاتا اور آنے والا خود بخود شرمندہ ہو جاتا۔ ذکیہ اور سرور بھائی کو ابو بہت چاہتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو ابو اسی وقت لاہور سے کراچی آئے تھے۔ ایک رات تقریباً بارہ بجے یہ لوگ کسی دعوت سے اٹھ کر ابو سے ملنے آئے اور سرور بھائی آج تک اس ملاقات کو یاد کرتے ہیں۔

بڑے چھوٹے کا مقام 'میز پر کھانا آہستہ کھانا، سب کا انتظار کرنا۔ ان سب باتوں کو ابو' ہمیشہ ذہن نشین کرواتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی بزرگوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ مجنوں صاحب سے فون پر بات کرتے وقت خود بخود کھڑے ہو جاتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ابو زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اگر میں کبھی ان سے لفافہ یا کسی کا ٹیلیفون نمبر

مانگنے جاؤں تو بڑے خفا ہوتے کہ میں خود کیوں نہیں طریقہ زندگی کو منظم بناتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ آج میرے بیگ میں ابو کی چھوٹی سی ڈائری پڑی ہوئی ہے جس میں تمام دوستوں کے پتے اور فون نمبر لکھے ہوئے ہیں۔

ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثے ابو کو بہت عزیز تھے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں شادی سے قبل نہ بالوں میں پھول لگاتی ہیں نہ ناک میں کیل پہنتی ہیں۔ پھول لگانے پر مجھے ایک روز زوردار ڈانٹ پڑی اور کیل کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی اس لیے کہ بعد میں شوہر نے بھی نہ پوری ہونے دی۔

ابو بہت کم کسی کی شادی میں جاتے تھے اور اگر جاتے تو فقط نکاح میں شریک ہوتے۔ 'تم لوگ تو کھانا کھانے جاتے ہو ہم پرانے لوگ ہیں۔ نکاح اصل چیز ہے۔' یہی وضع داری انہوں نے ہمیشہ نبھائی، خوشی میں شرکت اکثر نہ کرتے مگر غمی میں یا عیادت کے لیے دور دراز کے علاقوں میں بھی پہنچ جاتے۔

ان باتوں کے ساتھ ابو کی فکر جیسا کہ سب کو معلوم ہے انتہائی جدید تھی۔ وہ ہر نئی ایجاد جس سے انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہو خوشی سے اپناتے اور دوسروں کو تقسیم کرتے اردو کی ٹائپ کے بارے میں جب ہم شکایت کرتے تو ابو ہمیشہ اس کی طرف داری کرتے۔ جب جنگ اخبار Computer کے ذریعہ چھپنے لگا تو ان کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔

بچے ابو کی کمزوری تھے چاہے وہ دوستوں کے ہوں یا ملازموں اور مزدوروں کے۔ مگر شرط یہ تھی کہ بچے بھولے بھالے ہوں۔ بوڑھوں جیسی باتیں نہ کریں۔ مگر ساتھ ساتھ ہم سے ہمیشہ یہ تاکید رہتی کہ ان کو بچہ کہہ کر ان کی ذلت نہ کرو وہ بھی عقل و فہم رکھتے ہیں اور ایک گونا گوں شخصیت کے مالک ہیں جسے ابھارو۔ میرے بچوں کے ساتھ ان کا رشتہ ایک دوست کا تھا۔ ان کے ساتھ امریکی ناولیں پڑھتے تھے اور بعد میں باقاعدہ ساتھ مل کر تبصرہ کرتے تھے۔ کرکٹ میچ کا ہونا ہمارے گھر میں قیامت ہو جاتا تھا۔ ایک طرف ابو ہوتے اور دوسری طرف بچے۔ ان دنوں ابو کھانا بھی ٹی۔وی کے سامنے کھاتے تھے اور مجال ہے کہ کوئی گیند نہ دیکھیں وہ بات دوسری ہے کہ وہ ہمیشہ ہارنے والی ٹیم ہی کی طرف داری کرتے۔

سب سے پہلی اور اہم بات جو بچپن سے ابو نے ذہن نشین کروائی تھی وہ یہ تھی کہ ہر بات

اصولوں کی کسوٹی پر خود ہی پرکھ لو۔ پھر اگر تمہارا ضمیر صاف ہے تو کبھی کسی کے سامنے نہ دلائل پیش کرو اور نہ اپنی صفائی۔ اس اصول کی پابندی کرنا زندگی کی راہ میں کٹھن تو ہوا مگر دل، دماغ اور ضمیر ہمیشہ صاف رہا اور کبھی گھاٹے کا سودا نہ کرنا پڑا۔

ہمارے گھر میں کبھی روپیہ پیسے کی ریل پیل نہ تھی اور اکثر خاصا مشکل وقت درپیش ہوتا تھا مگر ابو کو میں نے کبھی رونا روتے نہ دیکھا۔ بلکہ وہ ہر دور میں کتابیں بھی خریدتے تھے اور اچھے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ اسی زمانے میں کالج کے لیے ایک کوٹ سلوانا پڑا۔ مجھے ہلکا ہرا رنگ پسند تھا اور امی کی ضد 'میل خورے' عنابی رنگ کی تھی۔ میرے تیور دیکھ کر فوراً ابو نے اپنا فلسفہ پیش کر دیا۔ 'بیٹے ہمیشہ وہ کام کرو جس سے تمہارا دل اور دماغ دونوں خوش رہیں۔ مصلحت کے آگے سر جھکانا یا کسی طرح کا بھی سمجھوتہ کرنا انتہائی بزدلی ہے۔' میں خوشی خوشی حاجی کریم بخش کی دوکان سے ہرا کوٹ لے کر باہر نکلی۔ جو لوگ ابو کی کتابوں سے متعارف ہیں انہیں شاید کم اندازہ ہو کر ہر کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں ابو نے کتنی جان سوزی کی تھی، کتنی کتابیں پڑھیں۔ کتنے کتب خانے اور میوزیم چھانے، کتنے سفر کیے۔ اسی لیے جیسا کہ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں دل چاہتا ہے کہ اگلی کتاب فوراً پڑھ لی جائے، کالج کے زمانے میں ابو سے اگر کوئی چیز پوچھ لیتی تو پھر کیا مجال تھی کہ فوراً اس کا جواب مل جائے۔ پکڑا دیتے تھے ایک لمبی چوڑی لسٹ جن میں تاریخ ادب سے لے کر تازہ اخبار کا نام ہوتا۔ ہمیں دوسرے ہی روز مضمون دینا ہوتا۔ پھر پکڑے جاتے میجر اسحاق مرحوم یا انکل ایرک پسریں اور ابو غصہ میں کہتے جاتے 'There is no short cut to knowledge'۔

میری بڑی بیٹی اسلامیات کے نصاب سے پریشان رہتی تھی۔ ایک روز جب اس نے کربلا کو ایک سرسبز و شاداب وادی لکھا اور حضرت امام حسین کے بارے میں لکھا کہ انہوں نے کربلا کا قلعہ ایک انگلی سے فتح کر لیا تھا تو ابو نے باقاعدہ ہسٹری کی تاریخ سے کچھ اسے اس طرح پڑھایا کہ آئندہ اس مضمون میں اس کو Distinction آتے رہے۔

ابو نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی نہ کسی کے عیب گنائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست آج بھی ہمارے ساتھ اتنے ہی شفیق ہیں جس طرح ان کی زندگی میں تھے۔ ابو جس سے بھی ملے بڑے خلوص اور خودداری سے ملے۔ 'یاد رکھو تم لوگوں کے پیچھے نہ بھاگو۔ لوگوں کو اپنی طرف بھاگنے دو' ہمیشہ کہتے اور اپنی پہلی کتاب جب مجھے دی تو حافظ کا شعر لکھ کر دیا جس کے ایسے ہی معنی ہیں۔

ہاں وہ لوگ ابو کو انتہائی ناپسند تھے جو ہر چیز پر عالم ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے، چاہے ان کا علم کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ ان کے خیال میں جاہلوں کی یہ خاص پہچان ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ ابو نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی نہ کسی کے راز اگلے۔ اسی لیے آج بھی لوگوں کے اصرار کے باوجود مجھے ان کے یہاں آئے ہوئے خطوط پڑھتے وقت مجرموں کا سا احساس ہوتا ہے۔

جیسے لڑکیوں کا دستور ہے میں اور میری سہیلی سلمہ (ڈاکٹر تاثیر مرحوم کی بیٹی) اکثر بیٹھ کر دنیا جہاں کے پرخچے اڑاتے رہتے۔ ایک روز ابو بڑی خوشی خوشی ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہاتھ میں Hogarth کی مشہور تصویر 'The Gossip' کے دو پرنٹ تھے۔ ان پر تین چڑیلوں کی تصویریں بنی تھیں جو غیبت کرتے کرتے ایسی ہوگئی تھیں۔ وہ تصویریں آج تک ہم دونوں کے پاس محفوظ ہیں۔

اتنی تعلیم اتنا تجربہ رکھنے کے باوجود اکثر باتوں میں ابو انتہائی بھولے واقع ہوئے تھے۔ کبھی ڈاکٹر کے مشورہ کے بغیر سر کے درد کی گولی بھی نہ کھاتے۔ جب میرا یہ شعبہ نہیں ہے تو میں کیوں دخل دوں۔ تم لوگ بڑے ڈاکٹر بنتے ہو۔ الٹی سیدھی دوائیں کھاتے رہتے ہو۔ ان سے زیادہ دواؤں کے بارے میں میری بچیوں کی معلومات تھیں۔

اکثر میں سوچتی ہوں کہ کیا ابو کی شخصیت میں تضاد تھا؟ آخر کیوں چھوٹی چھوٹی مشکلات پر وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ جیسے پانی یا بجلی کا جانا یا دھوبی کا کپڑے وقت پر نہ لے کر آنا۔ مگر وہ تھیں غیر بنیادی باتیں، ان کی اپنی ذات سے وابستہ مگر جہاں اصول کا مسئلہ آتا تو ترازو کا پلڑا ہمیشہ ان کی ہی جانب جھکا ہوا ملتا۔ لاہور قلعے کے ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ ابتدا میں ابو کو Torture کرتے وقت ایک پنجرے میں قید کر کے تین روز تک لٹکایا گیا تھا۔ تیسرے روز وہ بالکل نڈھال ہو کر کراہنے لگے۔ گارڈ کرتے ہوئے ایک سنتری رک گیا اور بولا 'شیر کو اگر پنجرے میں بند بھی کیا جاتا ہے تو وہ اس وقت بھی دھاڑتا ہے۔ تم بھی شیر ہو۔ مقابلہ کرو۔ ہمت نہ ہارو'!

نہ معلوم اس سنتری کو معلوم ہے یا نہیں کہ اس کے بعد ابو کی تمام تر زندگی ایک مقابلے میں ہی گذر گئی۔ ایک شیر کی سی ہمت اور عزم سے!

پیارے سبطے صاحب

سعیدہ گزدر

پیارے سبطِ صاحب!

آج بہت دنوں کے بعد آپ سے ڈھیروں باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہی ہلکی پھلکی مزے مزے کی باتیں ہنسی مذاق، شعر، شاعری، ادب آرٹ اور کبھی کبھار سیاست اور دیکھیے افضل صدیقی صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ پر کچھ لکھ دوں۔ بھلا بتایئے کتنی عجیب بات ہے...... یہ تین دن! ہاں آج تین ہی روز تو ہوئے ہیں جب ہاجرہ آپا (ہاجرہ مسرور) کا فون آیا تھا۔ لیکن نہیں میں وہ بات آپ کو کیسے بتاؤں؟ آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔

'بھلا یہ کیا بے ہودگی ہے۔' مجھے خود بھی تو محسوس ہو رہا ہے کہ دل پر ابھی ابھی جو کچھ بیت گئی وہ ایک ڈراؤنا خواب ہے آنکھ کھلے گی آپ کا فون آئے گا۔

'کیسی ہو؟'

'ٹھیک ٹھاک۔'

'بچے کیسے ہیں؟ تمہارا میاں کہاں ہے؟'

'کیا مطلب کہاں ہے؟ آفس میں ہیں۔'

'کیا بھروسہ، ہمیشہ گھومتا پھرتا رہتا ہے۔'

اور یہ سب جھوٹ معلوم ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج وہ دن بہت یاد آ رہے ہیں۔ پندرہ

سبطِ حسن صاحب کے انتقال کے بعد لکھا گیا یہ خط نما مضمون روز نامہ 'امن' میں شائع ہوا۔ ہمارے پاس اخبار کا جو تراشہ ہے، بدقسمتی سے اُس صفحے پر اخبار کی تاریخ درج نہیں ہے (مرتب)۔

برس ہو گئے ہوں گے آپ نے کراچی سے 'لیل و نہار' نکالا تھا۔ ایوب خان کا مارشل لاء ہٹا تھا۔ بیچ کے اس تھوڑے سے وقفے میں عجب طرح کا سیاسی اور ذہنی اُبال آیا تھا۔ 'لیل و نہار' پڑھنے کے بعد میں نے آپ کو خط لکھا تھا کچھ تعریف کا، کچھ اعتراض کا۔ میں اس وقت تک آپ سے نہیں ملی تھی۔ کبھی دیکھا نہیں تھا۔ آپ نے خط کا جواب دیا۔

'ہماری بے شمار مجبوریاں ہیں۔ پتھر چوم کر ہٹ جانے والے بہت ہیں۔ مستقل کارکن نہیں ملتے۔' اور پھر پندرہ برس کے اس عرصے میں میں نے ہمیشہ آپ کو کام کرتے دیکھا۔ ایک مارشل لاء سے دوسرا مارشل لاء اور جمہوریت کا چھوٹا سا وقفہ اور پھر مارشل لاء۔ لیکن آپ کی سوچ اور کام کی نوعیت میں تبدیلی نہیں آئی کوئی رُخ نہیں بدلا بے تحاشہ اور انتھک محنت۔ لوگوں کی ذہنی بالیدگی کے لیے ان کے جمالیاتی ذوق اور احساس کی سطح کو اونچی کرنے کے لیے ان میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے لیے انہیں بہتر انسان بنانے کے لیے کام کام اور مسلسل کام۔

یاد ہے آپ ہمیشہ پوچھتے تھے۔ 'آج کل کیا پڑھ رہی ہو؟'

'کیا کام کر رہی ہو؟'

اس سوال پر میں اکثر سٹپٹا جاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بے عملی اور کاہلی سے آپ کو کتنی نفرت ہے۔ میں جھوٹ بول دیتی تھی اور پکڑی جاتی تھی۔

'دیکھو تم بہت وقت ضائع کرتی ہو۔ اپنے لیے کام کو ایک چیلنج بنالو۔'

'ہم کچھ نہیں کریں گے، آپ کیوں پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کچھ کرنے یا نہ کرنے سے فرق کیا پڑتا ہے۔' کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر میں بہت جھنجھلا جاتی تھی۔

'دیکھو محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔' آپ اپنا تجربہ بیان کرتے۔

وہ مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کا زمانہ تھا۔ ہم سب کبھی آپ کے گھر، کبھی بھائی کے گھر میں جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن آپ کی موجودگی میں مایوسی اور قنوطیت زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے۔ محرومی کے احساس کو بھی لمحے بھر میں آپ جھٹک دیتے تھے۔ اور ایک ذہنی سہارا بن جاتے، جاندار اور باہمت۔ بنگلہ دیش بن گیا۔ ایک تاریک مردنی چھا گئی۔ مگر آپ کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا تھا۔

'چلو چند روز کے لیے باہر نکلو۔ یہاں دم گھٹ جائے گا ہم لوگ موہنجودڑو چلے گئے۔ وہاں نیلے آسمان کے نیچے گہرے سناٹے میں صدیوں پرانا جادو بول رہا تھا انسان کی عظمت اور اس کی قوت اور آنے والے کل کی امید کا جادو۔ وہاں ایک روز کھنڈروں میں مشتاق شوٹنگ کر رہے تھے۔

میوزیم کے انچارج کچھ دیر کھڑے رہے پھر بولے، آپ نے 'ماضی کے مزار' نام کی کتاب پڑھی ہے؟ کیسی کتاب ہے۔ سوچ اور ذہن کے دھارے بدل دیتی ہے۔ زندگی کا رُخ موڑ دیتی ہے۔'

مشتاق نے مسکراتے ہوئے یہ قصہ آپ کو سنایا۔ آپ بہت خوش ہوئے ہمیشہ آپ کو اس بات کی کتنی خوشی ہوتی تھی کہ دور دراز کے دیہاتوں، قصبوں اور پہاڑوں پر رہنے والے اور نوجوان طالبعلم، مزدور اور سیاسی کارکن آپ کی بات سمجھ لیں۔

لکھتے وقت مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ میری بات میرے پڑھنے والے کو سمجھ میں آ جائے۔ ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ ایسی زبان اور اس پیرائے میں لکھوں کہ لوگوں تک میرا پیغام پہنچ جائے۔ ایسی چیز یا زبان لکھنے کا کیا فائدہ جسے عام آدمی نہ سمجھ سکے اور وہ اپنی ہی بازگشت بن کر رہ جائے...... میں تو بھئی ممتاز...... (ممتاز نورانی) بہن کو کسوٹی بناتا ہوں۔ ان کو ہماری بات پسند آ جاتی ہے اور سمجھ جاتی ہیں تو بس اطمینان ہو جاتا ہے کہ کام پورا ہوا۔'

اسی لیے تو آپ ہمیشہ ان لوگوں کے بیچ میں رہتے تھے جن سے براہِ راست رابطہ رہتا تھا کبھی باہر جاتے تو چند ہفتوں میں ہی گھبرا کر واپس لوٹ آتے۔

یاد ہے یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے ایک روز بیٹھے بٹھائے بس خیال آ گیا کہ ایک ادبی پرچہ نکالنا چاہیے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے یوں ہی ایک سوچ جو ذہن میں آئی تھی وہ 'پاکستانی ادب' کے نام سے تین برس تک چمکے گی اور اس کا اثر اتنی دور تک جائے گا کہ آج بھی پڑھنے والے اسے نہیں بھولے ہیں یاد ہے آپ کس طرح ڈانٹ ڈانٹ کر کام لیتے تھے۔ میں شکایت کرتی کہ سبطِ صاحب آپ مجھ سے کچھ زیادہ ہی توقع رکھتے ہیں مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں لیکن آپ تو ہر نئے لکھنے والے کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے کوئی ٹوٹا پھوٹا بھی لکھے لیکن سوچ درست اور بے لوث ہو، جذبے میں سچائی اور گہرائی ہو آپ اسے بنا سنوار کر لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ آج کتنے قلم کے شہوار ہیں جنہیں قلم پکڑنا آپ نے سکھایا۔ لیکن میں یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ ماضی کو کریدنا اور دہرانا آپ کو بہت پسند تھا ہمیشہ اولڈ بوائز ڈنر اور جلسوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

'اچھا بھئی وہاں کیا باتیں ہوتی ہیں؟ یاد ہے سطے فلاں سن میں فلاں شخص یوں تھا...... اور بھئی فلاں واقعہ...... مجھے ان باتوں سے الجھن ہوتی ہے آخر کوئی کہاں تک یہ سنے......' آپ کو واقعی الجھن ہوتی تھی آپ ہمیشہ کہتے تھے کہ اچھی اور خوشگوار باتیں یاد رکھا کرو بری اور ناگوار چیزوں کو بھلا دیا کرو تب ہی تو آپ ہمیشہ سامنے دیکھتے تھے۔ نئے نئے تجربوں اور منصوبوں سے زندگی کو

سجاتے تھے ہاں تو اب وہ باتیں چھوڑتے ہیں آیئے میں آپ کو آج کی بات سناؤں۔

دیکھیے نور ظہیر کہہ رہی تھیں کہ آپ دِلّی میں بھی کام کر رہے تھے لائبریری سے مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ ڈھیروں کتابیں خرید رہے تھے اور ہاں وہاں آپ کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا جو آپ کا تعزیتی جلسہ ہو گیا بہت لوگ آئے تھے کتنے ہی تھے جنہوں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ موت سے ہار چکے ہیں وہ اپنی عقیدت میں آپ کے بارے میں سن کر آپ کو پڑھ کر آئے تھے اور آپ کی تصویر کے گرد پھولوں کا ہار دیکھ کر پوچھ رہے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ اور آج آپ کو جب لے گئے میں نہیں مانتی کہ وہ سچ مچ آپ کو لے گئے...... تو میں ٹہلتی ہوئی آپ کے گھر کی طرف چلی گئی۔ کیونکہ دروازے بند تھے میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی سبطے صاحب پہلی مرتبہ آپ کے گھر کے دروازے بند دیکھے وہ تو ہمیشہ کھلے رہتے تھے چوروں تک کے لیے۔ میں آپ کا باغ دیکھتی رہی۔ سیڑھیوں کے قریب سرخ للّی اور کاسنی پتوں والی بیل جھوم رہی تھی پاس ہی کہیں کوئل کوکی اور پھر دو مرتبہ اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ نہ جانے کون تھا کہیں زندگی تو آپ کو آواز نہیں دے رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہی تھی۔ کیونکہ جینا آپ کو بہت اچھا لگتا تھا مایوس ترین حالات میں بھی آپ کہتے تھے زندگی بڑی خوب صورت شے ہے اس کی قدر کرو اسے بہت پیار سے اور سلیقے سے خرچ کرو۔ آپ کہتے تھے تا کہ ہم ہر کام بڑی شان سے کرتے ہیں۔ اور اکثر میؔر کا یہ پسندیدہ شعر پڑھتے تھے۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

سبطے صاحب ابھی تو آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں وہ ادھورے کام اور نا تمام باتیں پوری کرنی ہیں یہ میرا وعدہ ہے اس مرتبہ نہیں بھولوں گی آپ بھولنے والی عادت پر بہت خفا ہوتے تھے اور یاد ہے حبیب جالب نے آپ کو جیل سے بہت عمدہ خط لکھا تھا اور اپنی نظم بھیجی تھی یہ وہ نظم نہیں تھی جو انہوں نے داؤد انعام ٹھکرانے پر آپ کے لیے کہی تھی۔ یہ دوسری تھی وہ خط اور نظم آپ نے 'پاکستانی ادب' میں چھاپ دی تھی اس کا آخری شعر کچھ یوں تھا۔

ہوگئی روشن نظر سبطِ حسن کی سوچ سے
زندگی کو اِک عجب دولت قفس میں مل گئی

اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کی سعیدہ۔

تیسرا حصہ

شعراء کا خراج عقیدت

maablib.org

سبطِ حسن سے ایک وعدہ

نیاز حیدر

شعلہ سرخ کی تجلی پر!
مرگِ تاریک چھا گئی کیونکر
ذہن و دل کو یقیں نہیں آتا
سچ نہیں ہے، نہیں ہے سچ یہ خبر

مسکراہٹ ہے جاوداں تیری!
غیر ممکن ہے احتمالِ عدم
حاصل زندگی ہے تیری نظر
فکر، رازِ حیات کی محرم

دانش و علم و فن کے شیدائی
رشکِ صد ذوالفقار، شانِ قلم
روحِ دوراں ہیں، عہد ساز حروف
ہر خیال، ایک احمریں پرچم

ہمہ گیری، ترے تفکر کی

وسعتِ کائنات، نادم ہے
ہر حقیقت ہے معترف تیری
تو حقیقت نواز عالم ہے

تو ہے سیارۂ فضائے شعور
غیر فانی ہے آگہی تیری!
ہے کہاں موت میں یہ تاب وتواں
تجھ سے چھینے جو زندگی تیری

عہد کرتے ہیں ہم کہ تیرے لیے
تیرا پرچم بلند رکھیں گے!
رجعتِ قہقری فنا ہوگی!
دورِ حاضر ہو یا ہو مستقبل

انجمن بزم فن، ادب کی بزم
جس کو ہر دور میں بنام حیات
ہم ترقی پسند رکھیں گے

احمد آباد۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۸۶ء

نذرِ سبطِ حسن

صفدر صدیق رضی

ستارہ وار بالآخر اُفق کے پار گیا
وہ ایک شخص جو تیرہ شبی سے ہار گیا

جو بوئے گل کی رفاقت میں گھر سے نکلا تھا
وہ برگ و بارِ گلستاں سے خار خار گیا

وہ یوں بجھا کہ خجل ہے ہوائے علم و ادب
وہ یوں گیا کہ اُجالے کا اعتبار گیا

ہجوم شب زدگاں سے وہ شب گزیدہ اُٹھا
گروہِ دل زدگاں سے وہ دل فگار گیا

لکھوں تو صفحہ قرطاس سے وہ جھانکتا ہے
جو حرف حرف سر آئینہ اُتار گیا

(بشکریہ فنون لاہور)

سیّد سبطِ حسن

قمر ہاشمی

شہر نگاراں سے آیا تھا
شام اُودھ کا شہزادہ
شبلی کیفی کی دھرتی کا
وڈیا ساگر
پاکستان میں سبط حسن تھے
علم و عمل کے روحِ رواں
اپنے وطن میں ایسے حق گو
فکر و نظر کی فولادی زنجیر
سبط حسن کی ساری کتابیں
عقل و خرد کا سرمایہ
میں تو خائف رہتا ہوں مسموم ہوا کے
جھونکے سے بھی
لیکن وہ بے خوف دیا
آندھی میں جلا
اور بادِ مخالف کے جھونکوں میں
شمع فروزی کرتا رہا

جانے کب تک لاکھوں انساں
اس کی کمی محسوس کریں
سبطِ حسن اب اپنی کتابوں کی سطروں میں
حرف کی زندہ روشنی بن کر
ابھریں گے
ذہن و دل کی محرابوں میں
گونجیں گے

(کراچی، ۲۱، اپریل ۸۶)

maablib.org

سبطِ حسن کی نذر

شاہد نقوی

چاندی کے کچھ تار تھے سر پر چہرا چاند کا ہالا تھا
شہرِ سخن میں یارو ایسا شخص بھی رہنے والا تھا
آنکھیں مہر و وفا سے اس کی کیسی روشن روشن تھیں
لب پہ تبسم کی مشعل نے اس کا روپ اُجالا تھا
تقدیس قرطاس و قلم کا دل سے وہ شیدائی تھا
حرف کی سچائی نے اس کی تحریروں کو جھالا تھا
دھیمے دھیمے لہجے میں باتوں کے جھرنے بجتے تھے
حسن بیاں کے گلشن کی وہ کشتِ سخن کا لالہ تھا
علم کی دیوی کا سچ پوچھو ایسا ایک پجاری تھا
فرق پہ قشقہ دانش کا سینے میں سوچ شوالا تھا
فکرِ رَسا سے جس کی منور ماضی کے بے نام مزار
گزری ہوی تہذیبوں کی تاریخ کا وہ رکھوالا تھا
اس کی نوید فکر سے روشن عقل کے قصر و ایواں تھے
جہل کے سینے میں پیوستہ اس کے قلم کا بھالا تھا
اُونچا اُونچا سا لگتا ہے دیکھو تو ہر اک مینار
عمر کی ڈھلتی شام میں بھی تو اس کا ہی قد بالا تھا
نکہتِ گل کہ رنگِ شفق ہو کوئے بتاں یا مے خانہ
حسن و جمالِ قدرت کے ہر پیکر کا متوالا تھا

’سبط حسن — شخصیت اور فکر‘

معروف مارکسی مفکر اور دانشور، سماجی مؤرخ، ایڈیٹر اور ادیب سید سبط حسن کا شمار پاکستان کے ان معدودے چند اہلِ فکر میں ہوتا ہے جن کے خیالات اور افکار نے ملک میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے معاشرے میں مروّج غیر عقلی تصورات، بوسیدہ اقدار اور رجعت پسندانہ رسوم و روایات کے مقابل عقل و خرد کا پرچم بلند کیا اور علم و تحقیق کے وہ چراغ روشن کیے جن کی روشنی معاشرے کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ پچاس سال سے زیادہ کی مدت پر پھیلی ہوئی اپنی عملی زندگی میں انہوں نے سیاست، صحافت، تحقیق اور ادب کے مختلف میدانوں میں ایسے نقوش چھوڑے جو ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ ان کی کتابیں ’شہرِ نگاراں‘، ’ماضی کے مزار‘، ’پاکستان میں تہذیب کا ارتقا‘، ’موسیٰ سے مارکس تک‘، ’انقلابِ ایران‘، ’نویدِ فکر‘ اور *Battle of Ideas in Pakistan* بحیثیت مجموعی اتنا بڑا اور وقیع سرمایۂ علم فراہم کرتی ہیں جس پر نئی نسل اُن کی جتنی بھی ممنونِ احسان ہو اتنا کم ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مضامین پر مشتمل کئی کتابیں مزید شائع ہو چکی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کے بعد آنے والی ہر نئی نسل نے ان کی کتابوں سے استفادے میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سیاسی و سماجی، تاریخی و فلسفیانہ موضوعات پر ان کی تحریریں نئی نسل کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کی غیر معمولی اہلیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ سبط حسن صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف بھی بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ ان پر پاکستان اور بیرونِ ملک جامعات میں اعلیٰ سطح کی تحقیق ہو رہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی ان کے علمی کام کے تجزیے اور تبصرے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب سبط حسن صدی کے موقع پر شائع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید جعفر احمد، جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے اور پاکستان اسٹڈیز میں ایم فل کرنے کے بعد ۱۹۹۳ء میں برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی سے سوشل اینڈ پولیٹیکل سائنسز میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کا شمار ملک کے معروف روشن خیال دانشوروں اور اسکالرز میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد پچیس کے قریب کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں جن میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کی کتابیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مقالات اور تجزیے علمی جریدوں اور اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ اختصاص بھی حاصل ہے کہ انہوں نے سید سبط حسن صاحب کی وفات کے بعد پرانے جرائد اور اخبارات میں بکھری ہوئی اور مرحوم کے ذاتی کاغذات اور مسودات میں موجود ان کی غیر مطبوعہ تحریریں تلاش کر کے اُن کو کتابی شکل میں مرتب اور مدون کیا۔ اب تک وہ سبط حسن صاحب کی چار کتابیں ’افکارِ تازہ‘، ’ادب اور روشن خیالی‘، ’مغنیِ آتش نفس: سجاد ظہیر‘ اور ’مارکس اور مشرق‘ شائع کر چکے ہیں۔ ’ادیب اور سماجی عمل‘ اس سلسلے کی پانچویں کتاب ہے جو سبط حسن صدی کے موقع پر شائع ہوئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے سبط حسن صاحب کے افکار اور خیالات کی ترویج اور اشاعت میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔